[illegible]

837

علاؤالدین خلجی

رئیس احمد جعفری

★

احسن برادرز، چوک انارکلی، لاہور

(جملہ حقوق محفوظ)

بارِ اوّل

نومبر سنہ ۱۹۵۵ء

قیمت [redacted] روپے

ناشر: قومی کتب خانہ، لاہور
طابع: اتحاد پریس، لاہور
نگراں: ریاض ہمایوں

محب اللہ ندوی، ایم اے (علیگ)

کے نام!

گو مَیں رہا رہینِ ستمہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

رئیس احمد جعفری

حسرتِ ناکام!

یہ دُنیا کبھی ایک حالت پر نہیں رہتی۔ زمانہ بدلتا رہتا ہے۔ لوگ بدلتے رہتے ہیں، خیالات بدلتے رہتے ہیں۔ کبھی بادشاہ کے حصہ میں ذلّت، نامرادی اور حسرت کی موت آتی ہے، کبھی غلام کے مقدر کا ستارہ چمکتا ہے، اور وہ دفعتہً غلامی کی زندگی سے نکل کر تختِ حکومت پر متمکن ہو جاتا ہے، بادشاہ جب روبہ زوال ہوتا ہے تو اس کی مرگِ حسرت پر کوئی دو آنسو بھی نہیں بہاتا، اور غلام جب کشور کشا اور فاتح کی حیثیت سے عنانِ اختیار و اقتدار اپنے ہاتھ میں لیتا ہے تو بڑے بڑے سرکشوں کی گردنیں جھک جاتی ہیں۔ امرائے وقت، علمائے عصر اور سپہ دارانِ عالم اس کے حضور میں لرزتے اور کانپتے حاضر ہوتے ہیں۔ شعرا اس کی مدح میں قصیدے پڑھتے ہیں، مغنّی اس کی شان میں اشعار گاتے ہیں، مہوشوں اور گل رُخوں کے طائفے اسے خوش کرنے کے لئے رقص و نغمہ کے کمالات دکھاتے ہیں۔ وہ جب غلام تھا تو اس کی کوئی بات بھی نہ پوچھتا تھا۔ جب شہریار بنا تو لوگ اس کا مُنہ تکنے لگے۔ اس کے اشارہ چشم پر گردنیں کٹنے لگیں۔ اس کے مُنہ سے نکلا ہوا ایک بول، حکم اور فرمان بن گیا! بڑے بڑے گردن فراز سرنگوں ہونے لگے۔ اس کا کلام "کلاموں کا بادشاہ" (مَلِکُ الکَلَام) بن گیا!

دنیا کی یہ بڑی پرانی ریت ہے، ہمیشہ سے یہی ہوتا ہے اور شاید ہمیشہ تک یہی ہوتا رہے گا! یہ انقلابات نہ ہوں، تغیرات کا عمل یوں کارفرما نہ ہو، عروج و زوال کا اس طرح تسلسل اور

تواثر نہ ہو تو عبرت کی آنکھ سبق کس چیز سے حاصل کرے؟ ٹھوکر نہ لگے تو احتیاط کا مادہ کہاں سے پیدا ہو؟ جان کو خطرہ لاحق نہ ہو تو حفظ و دفاع کی تدبیریں کیونکر سوجھیں؟

نئے نئے حوادث کا ایک چکّر ہے جو لگاتار جاری ہے، ——— نہ جانے کب شروع ہُوا تھا اور خدا ہی جانتا ہے کب تک جاری رہے گا؟

غیاث الدین بلبن نے چالیس برس تک دلّی میں بیٹھ کر ہندوستان کے بڑے حصے پر عدل و انصاف بیدار مغزی اور دور اندیشی، رحم و کرم، علم پروری اور ہنر شناسی کے ساتھ حکومت کی۔ جب تک زندہ رہا، قلعہ کو اس نے دشمنوں اور مخالفوں کے لئے آہنی حصار بنائے رکھا۔ مجال نہ تھی کہ بڑے سے بڑا فاتح یا کشورکشا اس حصار میں داخل ہو سکتا۔ لیکن جب انقلاب نے اس آہنی حصار میں قدم رکھا تو اس کی فصیلیں بودی ثابت ہوئیں۔ اس کے پھاٹک خود بخود کھل گئے۔ اس کے ایوان و قصور گزرگاہِ عام بن گئے۔ بلبن کا لختِ جگر اور جانشین، کیقباد، میدانِ جنگ میں نہیں، اپنے محل میں، دشمنوں اور حریفوں کے ہاتھوں نہیں، ملازموں اور درباریوں اور نمک خواروں کے ہاتھوں بسترِ علالت پر مارا گیا اور جس طرح طاعونی چوہے کو کراہت کے ساتھ دُم سے پکڑ کر گھر سے باہر پھینک دیتے ہیں اسی طرح کیقباد کی لاش، محل کے بالاخانہ سے جو پھینکی گئی تو دریائے جمنا میں گری۔ ایک دھماکہ ہُوا اور پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ ——— نہ کہیں جنازہ اُٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا!

لیکن یہ لاش ——— صرف کیقباد کی نہ تھی، ایک پورے شاہی خاندان کی تھی۔ کیقباد کے ساتھ خاندانِ بلبن بھی غرقِ آب ہو گیا۔ اب دلّی کے شاہی قلعہ پر جلال الدین فیروز خلجی کا پرچم لہرا رہا تھا۔ اب ہندوستان میں جلال الدین فیروز خلجی کا گز اور سکّہ چل رہا تھا!

اور یہ جلال الدین فیروز بھی قسمت کا بڑا دھنی تھا! ——— یہی جو آج سریر آرائے تخت تھا، کل قتل ہونے کے لئے دلّی میں طلب کیا گیا تھا، اور وہی کیقباد جس کی ہلاکت جلال الدین فیروز کی نئی زندگی کا سبب بنی، ایک حاکم بااختیار کی طرح اس "مجرم" کی قسمت کا فیصلہ کر رہا تھا!

آج علاءالدین خلجی اپنی ولایت کے مستقر پر روانہ ہو رہا تھا۔ وہ بہت خوش تھا، اب وہ ایک نئی زندگی شروع کرے گا، اب وہ اپنی انفرادیت کو مستحکم کرنے کی جدوجہد کرے گا، اب وہ دنیا کو بتادے گا کہ وہ کیا کچھ کرسکتا ہے؟ اس کی صحیح شخصیت اور اس کی صحیح قدر وقیمت کیا ہے؟ وہ خوش تھا، اور چاہتا تھا کہ بیوی بھی اس خوشی میں اس کا ساتھ دے۔ ساس بھی اس پُرمسرت موقع پر مبارکباد دے لیکن یہ تمنا پوری نہ ہوسکی۔ بیوی نے اسے حقارت سے دیکھا، وہ بھلا خوش کیوں ہوتی۔ اسی کے باپ ہی نے تو شوہر کی عزت افزائی کی تھی، ورنہ وہ تھا کیا؟ اس کی حیثیت کیا تھی؟ اور بالکل یہی خیال اس کی ساس ملکۂ جہاں کا تھا۔ وہ بھی یہی سوچ رہی تھی۔ "عجیب بیوقوف لڑکا ہے۔ ہم ہی نے تو اسے یہ سب کچھ دیا ہے، اور ہم ہی سے چاہتا ہے کہ اس کی شکرگزاری میں شرکت کریں"۔

علاءالدین کی ایک تمنا اور بھی تھی!

وہ اپنے مستقر پر جا رہا تھا، جہاں مستقل طور پر ایک عرصے تک اسے رہنا تھا، اب دہلی میں اس کا آنا جانا صرف کبھی کبھی ہی ہوسکتا تھا۔ وہ چاہتا تھا، اپنی بیوی کو ساتھ لیتا جائے!

جب وہ ملکۂ جہاں کے پاس اپنی یہ استدعا لے کر پہنچا، اور اس نے ڈرتے ڈرتے یہ التجا پیش کی، تو پہلے تو ملکۂ جہاں نے اسے گھور کر دیکھا، پھر زہرخند کرتے ہوئے کہا:

"میں تمہیں اتنا بیوقوف نہیں سمجھتی تھی، ——— تم شہنشاہ کی لڑکی کے شوہر ہو۔ کیا تمہاری عزت افزائی کے لئے اتنا کافی نہیں؟ ——— تم ایسی بات کیوں چاہتے ہو جو نہیں ہوسکتی ——— شاہزادی تمہارے ساتھ کٹڑہ جائے گی؟ یہ خیال دل سے نکال دو۔ جاؤ ایسی بیہودہ آرزو کا ذکر کبھی زبان پر نہ لانا!"

علاءالدین ملکۂ جہاں سے مایوس ہوکر بیوی کے پاس پہنچا، لیکن اسے شاید ماں سے اطلاع مل چکی تھی۔ وہ پہلے سے بھری بیٹھی تھی۔ شوہر کی صورت دیکھتے ہی اٹھ جانے کے لئے کھڑی ہوگئی پھر

اس نے شوہر کی بات سنے بغیر کہا۔

"میں نے جان لیا آپ کیوں آئے ہیں؟ —— جو آپ چاہتے ہیں، وہ نہیں ہو سکتا آپ کو اجازت ہے جب چاہیں دہلی آئیں، لیکن میں آپ کے ساتھ نہیں جا سکتی۔ یہ میری توہین ہے۔ یہ میرے باپ کی توہین ہے!"

علاء الدین کچھ نہ کہہ سکا، اس نے گردن جھکا لی، اور محل کے باہر نکل آیا، اور بجھے ہوئے دل کے ساتھ کٹرہ جانے کی تیاریاں کرنے لگا۔ —— کئی مرتبہ اس کا جی چاہا کہ وہ ایک مرتبہ پھر اپنی درخواست دُہرائے۔ لیکن بیوی اور ساس دونوں کے مزاج سے واقف تھا، بات زبان تک آ آ کر رُک گئی، الفاظ کا جامہ نہ پہن سکی، اس نے فیصلہ کر لیا، وہ تنہا جائے گا، بالکل تنہا!

دیوگری کا قلعہ

علاء الدین کڑہ پہنچ گیا ــــــــــــ لیکن بجھے ہوئے دل کے ساتھ!

یہاں اسے وہی اقتدار و اختیار حاصل تھا جو کسی خود مختار فرمانروا کو اپنی مملکت میں حاصل ہوتا ہے۔ ایک اشارہ پر دُنیا کی ہر لذت حاصل ہوسکتی تھی۔ وہ جس رنگ میں چاہتا، اپنی زندگی کا سانچہ بنا سکتا تھا، اور پھر اس سانچہ میں اپنے آپ کو ڈھال سکتا تھا۔ لیکن وہ اپنی افتادِ طبع کے اعتبار سے بڑا زود حس انسان تھا۔ وہ سوچا کرتا تھا جس شخص کی خود اپنے ہی گھر میں وقعت نہ ہو، جو اپنے چچا کی نگاہ میں وقعت نہ رکھتا ہو، جس کی بیوی اسے حقیر اور ہیچ سمجھتی ہو، جس کی خوشدامن طعنے دیتی ہو، اور قدم قدم پر یاد دلاتی ہو کہ اس کی حیثیت ایک پروردۂ خاص سے زیادہ نہیں، وہ بھلا گھر سے باہر کیا وقعت حاصل کرسکتا ہے؟

وہ کڑہ میں تھا، لیکن اس کا دل ملکۂ جہاں کی باتوں میں اُلجھا ہوا تھا۔ وہ اپنے دل سے بار بار سوال کرتا تھا۔ جب میں اپنی بیوی کو قابو میں نہیں رکھ سکتا۔ جب مَیں اپنی خوشدامن کے دل میں عزت اور اعتماد نہیں پیدا کرسکتا تو غیروں اور دوسروں کا اعتماد کیونکر حاصل کرسکوں گا۔ ان کی نگاہ میں میری عزت کیونکر قائم ہوسکے گی؟

اسے اپنی بیوی کی یاد ستاتی تھی، لیکن وہ فراق کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ وہ مجبور تھا کہ بیوی کو اپنا بنانے کا خیال بھی دل میں نہ لائے، ——— یہ بے ادبی تھی، اس لئے ایک جرم!

پھر اب کیا کیا جائے؟ ———

ایک روز ملک مبارز الدین ظفر خاں نے یہی ذکر چھیڑا۔ یہ علاءالدین کے خاندان کا گویا ایک فرد تھا، دُور کے رشتہ سے اس کا عزیز ہوتا تھا۔ دونوں نے بچپن ساتھ گزارا تھا، ساتھ کھیلے کودے تھے، دونوں ایک دوسرے کے نباض شناس اور محرم راز تھے۔ علاءالدین جب دلی سے کڑہ آنے لگا تو ملک ظفر خاں زبردستی اس کے ساتھ آیا۔ ورنہ وہ تو اتنا اداس اور ملول تھا کہ بالکل یکہ و تنہا آنے پر تلا ہوا تھا۔

ملک ظفر خاں نے علاءالدین کو جب اس حالت میں دیکھا، تو چپ چاپ پاس آکر بیٹھ گیا۔ علاءالدین نے اسے دیکھا، لیکن کسی قسم کی گفتگو نہیں چھیڑی۔ سر جھکا لیا، اور کچھ سوچنے لگا۔ ملک ظفر خاں اب ضبط نہ کر سکا۔ اُس نے کہا:-

"جب سے یہاں آیا ہوں، آپ کو ملولِ خاطر دیکھ رہا ہوں، کیا بات ہے؟ کیا مجھے بھی آپ محرم راز نہیں سمجھتے؟ کیا میرے اوپر بھی آپ کو بھروسہ نہیں رہا؟ کیا دُنیا اتنی بدل گئی ہے کہ جاں نثاروں تک کی وقعت ختم ہو گئی؟!"

ایک ٹھنڈی سانس بھر کر علاءالدین نے کہا:

"نہیں، یہ بات تو نہیں، ہمارے تعلقات آج سے نہیں، بچپن سے اتنے گہرے ہیں کہ وہ زندگی کی آخری سانس تک نہیں ٹوٹ سکتے!"

ملک ظفر خاں:- "اب تک تو مَیں بھی یہی سمجھتا تھا، لیکن کیا یہ بات اب بھی سمجھی جا سکتی ہے؟ کیا واقعی ہمارے تعلقات کی وہی نوعیت ہے جس کا اظہار ابھی آپ نے فرمایا ہے؟"

Head Master
Primary School

علاء الدین :- "ہاں قطعاً ـــــــ تمہیں شبہ ہے کچھ ؟ اگر ہے تو آخر کیوں ؟ کیا تم نے کوئی ایسی بات دیکھی ، جو میرے دعوے کے خلاف ہو ؟"

ملک ظفر خاں :- "آپ ہر وقت کچھ سوچتے رہتے ہیں ، جیسے کوئی بہت بڑی فکر دامنگیر ہو ـــــــ"

علاء الدین :- "ہاں یہ بات تو ہے ـــــــ افکار نے مجھے حواس باختہ کر رکھا ہے !"

ملک ظفر خاں :- "وہی تو معلوم کرنا چاہتا ہوں ـــــــ آخر کس قسم کے ہیں وہ افکار ؟ ـــــــ میں آپ کے لئے کیا نہیں کر سکتا ۔ آپ کا حکم ہو تو آسمان کے تارے توڑ لاؤں !"

علاء الدین ۔ (مسکرا کر) "نہیں ، یہ زحمت نہ کیجئے ۔"

ملک ظفر خاں :- "اگر آپ کسی پر فریفتہ ہیں تو نام بتائیے ، اور دیکھئے چشم زدن میں اسے آپ کی خدمت میں حاضر کر دیتا ہوں یا نہیں ؟"

علاء الدین :- "نہیں یہ بات بھی نہیں ، میں دل پھینک قسم کا انسان نہیں ہوں ، نہ راگ رنگ اور لہو و لعب سے ہی دلچسپی ہے ۔"

ملک ظفر خاں :- "جانتا ہوں ، مدت سے آپ کی سیرت اور کردار کو دیکھتا آ رہا ہوں ، لیکن پھر اس خاموشی ، اس افسردگی اور اس ملالِ خاطر کا سبب ؟"

علاء الدین ۔ (آہ سرد کے ساتھ) "سبب کیا پوچھتے ہو ، غور کرو تو خود ہی حقیقت کی تہ تک پہنچ جاؤ گے !"

ملک ظفر خاں :- "بہت غور کیا لیکن حقیقت نہ ملی ، میں اپنی نارسائی کا اعتراف کرتا ہوں !"

علاء الدین :- "کیا تم نہیں جانتے ، ملکۂ جہاں کا برتاؤ اور سلوک میرے ساتھ کیا ہے ؟"

ملک ظفر خاں :- "خوب جانتا ہوں ـــــــ اور کڑھتا رہتا ہوں !"

علاء الدین ۔ "کیا تمہیں نہیں معلوم ، کوئی اور نہیں ، خود میری بیوی ، میری شریکِ زندگی اور میری رفیقِ حیات ، مجھے اس قابل ہی نہیں سمجھتی کہ منہ لگائے ، التفات کرے ، توجہ اور محبت کی باتیں کرے !"

ملک ظفر خاں:۔ "ہاں یہ بھی سچ ہے ـــــ لیکن نہایت کڑوا !"

علاءالدین:۔ "اور شاید تم مجھے اتنا بے غیرت اور بے حیا سمجھتے ہو کہ میں شیر علور کی طرح ان باتوں کو پی جاؤں گا؟ ـــــ تم نہیں جانتے، میرے دل کی کیا کیفیت ہے؟ میرا سینہ محشرستانِ جذبات بنا ہوا ہے، میرا دل ایک گوشت پوست کا لوتھڑا نہیں، ایک دہکتا ہوا انگارہ ہے۔ میں اپنی توہین نہیں برداشت کر سکتا۔ میں اپنی خودی کو ذبح نہیں کر سکتا۔ میں اپنے "انا" کو اپنی زندگی میں نابود ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ میں دیوانہ ہو جاؤں گا، پاگل ہو جاؤں گا، کپڑے پھاڑ کر جنگل میں نکل جاؤں گا۔ نہ جانے کیا کیا گزروں گا !"

یہ کہہ کر علاءالدین اُٹھ کھڑا ہوا، اور ایک سودائی کی طرح ٹہلنے لگا۔ ملک ظفر خاں بھی اُٹھ کھڑا ہوا، وہ اس کے پاس گیا۔ اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور محبت بھرے لہجہ میں بولا:۔

"نہیں آپ یہ کچھ نہیں کریں گے !"

علاءالدین۔ (برہمی کے ساتھ) "کیا تم غیب کی باتیں جانتے ہو؟ یہ تم نے کیسے کہہ دیا میں کچھ نہیں کروں گا؟ جو کچھ میں نے کہا ضرور کروں گا، کر کے دکھا دوں گا، تمہیں اور ساری دنیا کو !"

ملک ظفر خاں:۔ "مان لیا ـــــ لیکن اس سے حاصل؟"

علاءالدین:۔ "یہ نہ پوچھو ـــــ ہر بات اس لئے نہیں کی جاتی کہ اس کا کچھ حاصل اور کوئی نتیجہ ضرور برآمد ہو گا۔ اس لئے بھی کی جاتی ہے کہ حالات کا تقاضا یہی ہوتا ہے !"

ملک ظفر خاں:۔ "نہیں، آپ ایسا کام نہ کیجئے، جس سے آپ کی سبکی ہو"

علاءالدین:۔ "پھر کیا کروں؟ ـــــ بتاؤ تم کیا بتاتے ہو؟"

ملک ظفر خاں:۔ "کوئی ایسا کام جس سے آپ کی شان بڑھ جائے جس سے آپ کے وقار میں اضافہ ہو !"

علاءالدین:۔ "بڑے خوش آیند الفاظ ہیں، لیکن صرف الفاظ ہی الفاظ، ان کا کچھ مطلب بھی ہے؟"

ملک ظفر خاں:۔ "ضرور ہے، مَیں کوئی بات بے معنی نہیں کیا کرتا۔"

علاء الدین:۔ "تو بتاؤ کیا کہنا چاہتے ہو، تمہاری اس بات کا کیا مطلب ہے؟ میں کیا کروں جس سے میرا وقار بڑھ جائے۔ میری شان دوبالا ہو جائے۔"

ملک ظفر خاں:۔ "بہت سے کام ہیں۔ مثلاً ایک بات یاد دلاؤں؟ ایک ایسا کام جسے خود آپ انجام دینے کا تہیّہ کر چکے تھے۔"

علاء الدین:۔ "ہمیں یاد نہیں ——— ضرور کہو۔"

ملک ظفر خاں:۔ "بھیلسہ کی معرکہ آرائیوں کے زمانہ میں آپ نے اس وفادار اور محبوب دوست سے کچھ کہا تھا؟"

علاء الدین:۔ "بہت کچھ، ——— لیکن نہ جانے کیا کیا؟"

ملک ظفر خاں:۔ "کیا آپ نے یہ نہیں کہا تھا کہ دکن مسلمانوں کی یلغار سے اب تک بچا ہوا ہے، لیکن میری تلوار سرزمینِ دکن پر بھی چمکے گی؟"

علاء الدین:۔ "ہاں یاد آیا۔ کہا تھا ——— لیکن اس سے مطلب؟"

ملک ظفر خاں:۔ "مطلب یہ کہ اب وقت آگیا ہے کہ آپ اپنے ارادہ کو عملی جامہ پہنائیں!"

علاء الدین:۔ "مَیں تیار ہوں، میرا ارادہ اب بھی قائم ہے۔ جب بھی فیصلہ کر لوں گا کہ دکن جانا چاہئے تو دُنیا کی کوئی طاقت مجھے نہیں روک سکے گی۔ مَیں جاؤں گا اور وہاں کے لوگوں پر اپنے نام اور تلوار کی دھاک بٹھا کر واپس آؤں گا۔"

ملک ظفر خاں:۔ "ہاں یہی ہونا چاہئے ——— لیکن بہت جلد!"

علاء الدین:۔ "کیسی احمقوں کی سی باتیں کر رہے ہو۔ کیا دکن کی مہم میری قسمت بدل دے گی؟"

ملک ظفر خاں:۔ "ضرور! ——— مَیں اس کا ذمہ لیتا ہوں۔"

علاء الدین :- کیا دکن کی فتح مندیاں میرے اعزاز اور وقار کو، میری شان اور دبدبہ کو، میرے نام اور منزلت کو دوبالا کردیں گی؟ میں پوچھنا چاہتا ہوں ـــــــ گھر میں، میری بیوی کی نظر میں، میری خوش دامن ملکۂ جہاں کی نظر میں، میرے چچا اور خسر جلال الدین فیروز خلجی کی نظر میں ـــــــ؟"

ملک ظفر خاں :- "یہی کام تو انجام پائے گا اس مہم سے!"

علاء الدین :- "میری سمجھ میں نہیں آتا، تم کیا کہہ رہے ہو، کیا کہنا چاہتے ہو؟ ـــــــ جس گھر میں اب میری کوئی وقعت نہیں، وہ دکن کی فتح کے بعد اس طرح میرا ثنا خواں ہو جائے گا؟"

ملک ظفر خاں :- "آپ ایک بات بھولتے ہیں ـــــــ دکن میں دولت بھی تو بہت ہے۔ وہاں سونے چاندی کی کانیں ہیں۔ ہیرے جواہرات کے انبار ہیں ـــــــ!"

علاء الدین :- "یہ میں نے بھی سنا ہے"

ملک ظفر خاں :- "وہاں جائیے، اور وہاں سے یہ چیزیں لائیے اور لا کر جلال الدین خلجی کے قدموں پر ڈال دیجئے۔ پھر خاندان خلجی میں آپ ہی آپ ہوں گے!"

علاء الدین :- "یہ تم کس طرح کہتے ہو؟ کیا بھیلسہ اور دوسرے مقامات کی فتح، کامرانی میں میں نے بڑھ چڑھ کر حصّہ نہیں لیا تھا؟"

ملک ظفر خاں :- "کیوں نہیں لیا تھا؟ نہ لیا ہوتا تو جلال الدین کی لڑکی سے آپ کی شادی ملکۂ جہاں کی مخالفت کے باوجود کس طرح ہوتی ـــــــ کیا آپ کے کارناموں کا یہ ایک شاندار صلہ نہیں تھا؟"

علاء الدین :- "ہاں تھا ـــــــ اور اب کیا ملے گا؟"

ملک ظفر خاں :- "عزت، وقار، احترام، اعزاز ـــــــ اور اس کے علاوہ جو کچھ آپ چاہیں"

علاء الدین :- (ایک تبسم کے ساتھ) "تمہاری بات سمجھ میں آتی ہے۔ تمہارا مشورہ ہم قبول کرتے

ہیں ــــــ ظفرخاں ہم نے فیصلہ کرلیا، ہم دیوگری چلیں گے ــــــ لیکن کس طرح؛ کیا چچا جان اس مہم پر جانے کی اجازت مرحمت فرما دیں گے؟ کیا وہ اندیشہ ہائے دُور ودراز میں مبتلا نہیں ہوجائیں گے؟ کیا وہ ہمارے اس ارادہ کے دوسرے معنی نہیں لیں گے؟"

ملک ظفرخاں :" یہ سارے خطرات پیش آسکتے ہیں اگر کام بے احتیاطی سے کیا جائے، اور اگر دُوراندیشی سے کام لے کر قدم بڑھایا جائے تو ان کی حیثیت ایک وہم باطل سے زیادہ نہیں!"

علاءالدین :" کیسی باتیں کر رہے ہو ظفرخاں ــــــ کوئی ترکیب ذہن میں ہو تو بتاؤ؟"

ملک ظفرخاں :" ترکیب یہ ہے کہ بادشاہ سے چندیری فتح کرنے کی اجازت لیجئے۔ وہ فوراً اجازت دے دیں گے، اس لئے کہ بغیر چندیری فتح کئے شاہی فوجیں دکن کی طرف نہیں بڑھ سکتیں!"

علاءالدین :" لیکن یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ مجھے منع کر دیا جائے اور کسی اور کے سپرد یہ مہم کر دی جائے!"

ملک ظفرخاں :" یہ نہیں ہوسکتا، اس لئے کہ خود جلال الدین خلجی کی یہ دیرینہ تمنا ہے کہ وہ دکن پر یلغار کرے، وہاں اس کا پرچم لہرائے، اور اپنی حدودِ مملکت کا رقبہ زیادہ سے زیادہ وسیع کرے چندیری فتح ہوجانے کے بعد دکن کا راستہ کھُل جائے گا۔ دِلّی سے افواجِ شاہی چلیں گی اور بغیر کسی روک ٹوک کے دکن کی سرزمین پر پہنچ جائیں گی، لہٰذا وہ مسرت کے ساتھ اجازت دے دے گا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے یہ کام آپ کے سوا کوئی نہیں کرسکتا!"

علاءالدین :" اور میں یہ کروں گا کہ چندیری کی فتح کے بعد وہیں سے خفیہ طور پر اپنی سپاہ کو لے کر دکن پر چڑھ دوڑوں ــــــ واقعی بڑی اچھی تدبیر تم نے بتائی۔ میں اس کے لئے تیار ہوں، بتاؤ تم کب دِلّی جا رہے ہو؟ اب میں ارادہ کرچکا اور اس ارادہ کو اب دُنیا کی کوئی قوت نہیں بدل سکتی ظفرخاں تمہیں فوراً ہی جانا پڑے گا ــــــ آج اور ابھی!"

ملک ظفرخاں :" مجھے کیا عذر ہوسکتا ہے، بالکل پابرکاب سمجھئے، ابھی چلا!"

علاءالدین:- "ہاں جاؤ اور فوراً سے پیشتر واپس آؤ، جب تک تم اجازت کا مژدہ لے کر واپس نہیں آتے، مجھ پر خواب و خور حرام رہے گا!"

ملک ظفر خاں:- "یہ نہ کہئے۔ جاتے جاتے بہرحال دیر لگے گی۔ کوئی دو قدم کا معاملہ تو ہے نہیں، کہ گیا اور آیا!"

علاءالدین:- "میں یہ کچھ نہیں جانتا، اگر تم نے آنے میں دیر کی تو نتائج خواہ کچھ ہوں میں چندیری کو روندتا ہوا، دیوگری[1] پر یلغار کرتا ہوا نظر آؤں گا۔ اب میں صبر نہیں کر سکتا۔ میرا جامِ صبر ابھی سے چھلکا جا رہا ہے!"

ملک ظفر خاں:- "نہیں اتنی جلدی ٹھیک نہیں۔ میں آج ہی جاتا ہوں، اور وعدہ کرتا ہوں کہ جلد از جلد واپس آؤں گا۔ کھانا وہاں کھاؤں گا تو پانی یہاں پیوں گا، ——— بس اب تو آپ مطمئن ہوئے، یا اب بھی نہیں؟"

علاءالدین:- "ہاں اب میں مطمئن ہوں، لیکن پورا اطمینان اس وقت ہو گا جب تم یہاں سے چلے جاؤ گے!"

ملک ظفر خاں فوراً ہی علاءالدین کا پیامبر بن کر دتی روانہ ہو گیا، اور علاءالدین نے فرصت کا ایک لمحہ ضائع کئے بغیر چپکے چپکے دیوگری پر حملہ کرنے کی تیاریاں شروع کر دی۔ وہ چاہتا تھا جب تک فتح و کامرانی اس کے حصہ میں نہ آ جائے، اس وقت تک کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو کہ اس کا اصل مقصد اور ارادہ کیا ہے!

---

[1] آجکل ریاست حیدرآباد میں دولت آباد کے نام سے یہی دیوگری موجود ہے۔

ہلاکت کا ہرکارہ!

ملک ظفر خاں نے کچھ ایسی چرب زبانی سے کام لیا کہ جلال الدین خلجی کو چندیری فتح کر لینے کی اجازت دینی ہی پڑی، ملکۂ جہاں کی خدمت میں بھی وہ حاضر ہُوا، اور علاء الدین کی طرف سے معروضہ ادب پیش کیا، لیکن ملکۂ جہاں کی چڑھی ہوئی تیوری میں کوئی فرق نہیں آیا۔ البتہ ازراہِ التفات اتنا فرما دیا کہ

"علائی سے کہہ دینا کہ چندیری فتح کرنے کے بعد کچھ دنوں کے لئے دہلی ہوتا جائے!"

ملک ظفر خاں نے دست بستہ عرض کیا۔

"وہ تو قدمبوسی کے لئے تڑپتے رہتے ہیں، لیکن امورِ مملکت اور مہماتِ سلطنت کی اُلجھنیں باندھ رکھتی ہیں۔ ویسے خود ان کا ارادہ ہے کہ جلد از جلد حاضر ہو کر شرفِ قدمبوسی حاصل کریں اور سعادتِ دارین حاصل کریں!"

ملکۂ جہاں نے تبسّم کے سوا کچھ جواب نہیں دیا۔

ملک ظفر خاں دلّی سے مقصد میں کامیاب ہو کر پھر کڑہ واپس آیا۔ علاء الدین خلجی بیقراری کے ساتھ اس کا انتظار کر رہا تھا، دیکھتے ہی بغلگیر ہُوا اور کہا۔

علاء الدین۔ "کہو برادرِ عزیز کیا خبر لائے۔ جلد جواب دو، ایک پل کا انتظار میرے لئے

ایک برس ہو رہا ہے۔"

ملک ظفر خاں۔ "میں نے جو وعدہ کیا تھا، وہ پورا کیا ——— شہنشاہِ دہلی نے اجازت دے دی کہ آپ چندیری فتح کر سکتے ہیں!"

علاء الدین۔ (بے انتہا مسرور ہو کر) "شاباش، شاباش، ——— کمال کر دی، کارے کر دی!"

ملک ظفر خاں۔ "اس بندہ نوازی کا شکریہ کس زبان سے ادا کروں۔"

علاء الدین۔ "نہیں شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں، تم میرے دوست ہو، عزیز ہو، رفیق ہو — اس مہم میں تم بھی میرے ساتھ چلو گے! ——— لیکن نہیں تم یہیں رہو!"

ملک ظفر خاں۔ "جی نہیں یہاں رہ کر کیا کروں گا۔ مجھے ہمرکابی کا شرف عنایت کیجئے!"

علاء الدین۔ "میں نے بھی یہی سوچا تھا۔ لیکن پھر مناسب یہی معلوم ہوا کہ تمہیں اپنا نائب بنا کر یہاں چھوڑ جاؤں۔ یہ علاقہ ابھی میری تحویل میں آیا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ہم تم آگے بڑھیں، اور یہاں عقب سے کوئی حریف یا دشمن آ کر قابض ہو جائے، اور پھر وہی بات ہو کہ گئے تھے نماز بخشوانے روزے بھی گلے پڑ گئے۔"

ملک ظفر خاں۔ "بڑی دُور کی بات سوچی آپ نے ——— واقعی مناسب یہی ہے کہ دل پر جبر کروں، رفاقت کی لذت اور شرف سے محرومی گوارا کروں، اور یہاں آپ کے لئے دعائے کامیابی و کامرانی، خدائے بزرگ و برتر سے مانگتا رہوں!"

علاء الدین۔ (مسکرا کر) "بڑا اچھا مشغلہ ڈھونڈ لیا تم نے ——— اس طرح دل کو تقویت بھی ہو گی اور دل بہلتا بھی رہے گا، ——— لیکن اب مجھے تاخیر نہیں کرنی چاہئے۔ جلد از جلد یہاں سے روانہ ہو جانا چاہئے!"

ملک ظفر خاں۔ "ضرور ——— کتنی فوج آپ کے ساتھ جائے گی؟"

علاءالدین۔ "فوج ——— کیا تم میری شکست چاہتے ہو؟"

ملک ظفر خاں۔ (متحیر ہو کر) "ناممکن، یہ خیال ایک وفادار اور جاں نثار کے بارے میں کیسے آیا؟
اور اگر آپ کا یہ خیال صحیح ہے تو پھر مجھے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ تلوار موجود ہے، میری گردن
اڑا دیجئے۔ ورنہ پھر مجھے اجازت ہو کہ خودکشی کر لوں، ! ——— بے اعتمادی کی زندگی میرے
سر پر ایک بوجھ ہے!"

علاءالدین۔ (استمالت کے ساتھ) "نہیں نہیں، تم تو بہت زیادہ متاثر ہو گئے۔ میں تمہاری وفاداری
اور جاں نثاری کا جتنا قائل ہوں، کون ہو سکتا ہے؛ جتنا تم پر اعتماد کرتا ہوں کسی پر نہیں کرتا!"

ملک ظفر خاں۔ "پھر یہ الفاظ آپ کے منہ سے کیسے نکلے؟"

علاءالدین۔ "یونہی ——— مقصد صرف یہ تھا کہ ایک حماقت آمیز خیال پر تمہیں تنبیہ کر دوں!"

ملک ظفر خاں۔ "اس کا آپ کو ہر وقت حق ہے۔"

علاءالدین۔ "اگر میں لشکر لے کر جاتا ہوں تو پھر مجھے ایک بڑی جنگ کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ یہاں
سے لے کر دیوگری تک جتنے رجواڑے اور ممالک آئیں گے سب ہی سے جنگ کرنا پڑے گی؟"

ملک ظفر خاں۔ "جی ہاں، یہ تو ہے ——— واقعی یہ تو ہوگا۔"

علاءالدین۔ "میں بزدل نہیں ہوں، ہر وقت بڑے سے بڑے لشکر کا مقابلہ کرنے کو تیار ہوں
اور خدا کے فضل اور اپنے دست و بازو پر بھروسہ کرتے ہوئے کہہ سکتا ہوں کہ جس لشکر سے بھی
مقابلہ ہوا اس سے سربر ہو سکتا ہوں!"

ملک ظفر خاں۔ "بے شک ——— جس نے بڑے بڑے معرکوں میں آپ کی جوانمردیاں اور
اولوالعزمیاں دیکھی ہیں، وہ تائید پر مجبور ہے!"

علاءالدین۔ "لیکن لشکر کے نکلوں تو مختلف جنگیں سر کرنے کے لئے عمر نوح چاہئے اور فی الحال

میرا مقصد صرف اتنا ہے کہ دیوگری جاؤں اسے فتح کروں۔ وہاں سے سیم و زر اور جواہرات کا انبار لاؤں اور چچا کے قدموں پر ڈال دوں!"

ملک ظفر خاں:- "بات تو آپ نے صحیح فرمائی۔ لیکن نہ زمین کی طنابیں ہمارے قبضہ میں ہیں، کہ انہیں کھینچ لیں، اور دیوگری ہمارے سامنے آموجود ہو۔ اور ہم یہیں اسے شکست دے کر فاتح الملک ہو جائیں، اور نہ فضا پر ہماری حکمرانی ہے کہ پر پرواز پیدا کریں، اور اڑ کر وہاں لوگوں کی نظروں سے بچتے، دشمنوں کی زد سے چھپتے پہنچیں، اور فتح کر لیں، بہر حال ہمیں سڑک سڑک جانا پڑے گا اور کیونکر ممکن ہے کہ ہم جائیں اور کوئی ہمیں نہ دیکھ سکے؟"

علاء الدین:- (مسکرا کر) بس کہہ چکے یا کچھ اور بھی کہو گے؟"

ملک ظفر خاں:- "عرض کر چکا، صرف یہی کہنا تھا؟"

علاء الدین:- "اگر میں ایک چھوٹا سا لشکر لے جاؤں، تو با آسانی آس پاس کے راجاؤں کو باور کرا سکتا ہوں کہ شہنشاہ دہلی کا قاصد ہوں اور فلاں جگہ ایک پیام لے کر جا رہا ہوں، اس طرح کوئی تعرض نہیں کرے گا، اور کرے گا تو پھر اس کی سرکوبی میں دیر نہیں لگاؤں گا۔"

ملک ظفر خاں:- "تجویز معقول ہے لیکن یہ چھوٹی سی جماعت دیوگری فتح کر لے گی۔ وہاں کیا ہو گا؟"

علاء الدین:- "وہاں کیا ہو گا؟ دیکھ لینا ——— یا علاء الدین وہاں کی خاک کا پیوند ہو گا، ورنہ کامیاب و کامران واپس آئے گا!

ملک ظفر خاں:- "پھر بھی کتنی سپاہ آپ کے ساتھ جائے گی؟"

علاء الدین:- "تین ہزار کافی ہے!"

ملک ظفر خاں:- "نہیں، یہ بہت کم ہے۔ اس طرح آپ خود ہلاکت کو دعوت دے رہے ہیں، یوں میں آپ کو ہرگز نہیں جانے دوں گا!"

علاء الدین: "اچھا تمہاری خاطر پانچ چھ ہزار سہی[1] - اس سے زیادہ آدمی بے جان بھی ہلاکت کو دعوت دینا ہے ـــــــ تم فکر نہ کرو میں راستہ ایسا اختیار کروں گا ۔ جو مختصر بھی ہوگا اور محفوظ و مخفی بھی!"

ملک ظفر خاں: "اپنی نارسائی فہم کا اعتراف کرتا ہوں ۔ وہ راستہ جو آپ کے ذہن میں ہے ۔ میری سمجھ میں بالکل نہیں آیا۔"

علاء الدین: "دیکھو ہم تمہیں سمجھاتے ہیں ۔ ہمارا راستہ سڑک سڑک نہیں ہوگا!"

ملک ظفر خاں: "پھر کونسا راستہ اختیار کریں گے آپ؟"

علاء الدین: "کوہ، دریا اور گھنے جنگل والا![2] ـــــــ یہی راستہ مختصر بھی ہے اور مخفی بھی۔"

بات ملک ظفر خاں کی سمجھ میں آ گئی، اس نے اطمینان بھرے لہجہ میں لیکن کسی قدر تشویش کے ساتھ علاؤالدین سے کہا:۔

"آپ جو بات طے کرلیں اس سے دُنیا کی کوئی طاقت آپ کو منحرف نہیں کر سکتی جب اس راستہ سے جانے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو ضرور جائیں گے ۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ اب ہر قسم کی عرض و التجا بیکار ہے!"

علاء الدین: "تم سچ کہہ رہے ہو ـــــــ ہمارے مزاج شناس ہونا!"

ملک ظفر خاں: "لیکن میں یہ کہے بغیر بھی نہیں رہ سکتا کہ یہ راستہ مختصر اور مخفی ہونے کے باوجود انتہائی خطرناک ہے۔"

---

[1] عام مؤرخین نے علاء الدین کے سواروں کی تعداد ۳۔۴ ہزار لکھی ہے ۔ فرشتہ نے سات آٹھ ہزار آدمی بتائے ہیں۔

[2] کڑہ سے دیوگری (موجودہ دولت آباد) کا فاصلہ سیدھے خط میں چھ سو میل ہے ، اور دہلی یا آباد راستوں سے آٹھ سو میل کے قریب ہے۔ لیکن علاء الدین گھنے جنگل بڑے بڑے پہاڑ اور بغیر پُل کے تیز رَو دریا طے کرتا ہوا آگے بڑھتا تھا۔ (تاریخ پاکستان و بھارت صہ ۲۶۳)

علاءالدین :- خطرہ کو میں کبھی خاطر میں نہیں لایا۔"

ملک ظفر خاں :- "لیکن اس طرح خطرہ ٹل تو نہیں سکتا۔ ذرا غور تو کیجئے۔ صدیوں سے بھرے ہوئے گھنے جنگل، آسمان سے باتیں کرتے ہوئے بلند و بالا پہاڑ، سمندر کے طوفانوں سے آنکھ ملاتے ہوئے پرشور اور متلاطم دریا ــــــ سوچتا ہوں، اور سوچ کر دہل جاتا ہوں، ان سب مشکلات پر آپ کیونکر غالب آئیں گے؟"

علاءالدین :- (مسکرا کر) "شاہین شکار پر جھپٹتا ہے تو کوہ و دریا اور جنگل کسی چیز کو خاطر میں نہیں لاتا علاءالدین اور شاہین میں صرف نام کا فرق ہے، اور یہ فرق بہت معمولی ہے!"

ملک ظفر خاں :- "بس تو خدا کا نام لے کر سدھاریئے ــــــ مشکل یہ ہے کہ سواروں کی تعداد بھی بہت کم آپ اپنے ساتھ لئے جا رہے ہیں۔"

علاءالدین :- "اس سے ذرا بھی ہراساں نہ ہو ــــــ یہی مصلحت ہے، اور یہی کامیابی کا راز! ــــــ میرے سوار کم ہیں، لیکن ــــــ جتنے کم ہیں، بہادری اور جاں نثاری میں اتنے ہی زیادہ چیدہ و آزمودہ ہیں ــــــ یہ پوچھے بغیر کہ کہاں جانا اور کب واپس آنا ہے، ہمرکاب چل کھڑے ہوتے ہیں[1] ــــــ!

ملک ظفر خاں :- "اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے ــــــ خدا آپ کو مظفر و منصور واپس لائے۔ میری تو بس یہی دعا ہے!"

علاءالدین دو مہینہ تک کوہ و صحرا کے غوطے لگانے کے بعد یکایک ایلچ پور کے سامنے نکلا شہرت یہ دی کہ بادشاہ دہلی کا ایک امیر راج مندری کے راجہ کے پاس جا رہا ہے، پھر ضروری سامان رسد

---

[1] تاریخ پاکستان و بھارت صفحہ ۲۶۵

لے کر اتنی تیزی سے آگے چلا کہ دیوگری کے راجہ کو اس کی آمد کی اطلاع اس وقت ہوئی جب وہ شیادری (کوہ اجنتا) کی پہاڑیوں سے نکل کر گھٹی لاجورا کے میدان میں داخل ہو گیا۔ (یہ مقام اب لاسور یا لاسورہ کہلاتا ہے۔)[1]

راجہ رام دیو نے کاٹھا کی سرداری میں فوج آگے بھیجی کہ ہو سکے تو سیلاب بلا کو لاسور کے میدانوں میں روکے، کاٹھا نے شکست کھائی۔ حملہ آوروں کو دیوگری کے قلعہ تک بڑھنے اور محاصرہ کر لینے میں کوئی رکاوٹ نہ رہی۔ شمالی دکن کے پستہ قامت سپاہی، قوی ہیکل خلجیوں کے سامنے نہ ٹھہر سکے (پھر یہ خلجی سپاہی) راجہ کے شہر کھنکے جا چڑھے۔[2]

راجہ رام دیو یہاں محصور ہو گیا تھا، لیکن خلجی سپاہیوں کے محاصرہ کی تاب نہ لا سکا، بالآخر اسے امان طلب کرنی پڑی اور وہ تمام شرائط مان لینے پڑے۔ جو علاء الدین خلجی نے پیش کئے۔ صرف یہی نہیں بلکہ راجہ نے خود ہی تحریک کر کے اپنی بیٹی بھی علاء الدین کو بیاہ دی!

علاء الدین دیوگری سے سونا، چاندی، موتی اور جواہرات اتنی مقدار میں لے گیا کہ خزانۂ دہلی میں اس کا عشر عشیر بھی موجود نہ تھا۔ تاوان جنگ میں ساٹھ ہاتھی اور سو بڑے بڑے اونٹ ہاتھ آئے، ان ہی پر مال لاد کر کڑہ روانہ ہوا۔[3]

---

[1] عصامی نے اپنی تاریخ فتوح السلاطین، دولت آباد میں بیٹھ کر لکھی تھی۔ وہ بیان کرتا ہے کہ جس وقت علائی لشکر لاسور کے قریب پہنچا تو کسی ترک سوار نے ایک تیر رکھ کر بستی کی طرف چلایا۔ وہ نیچے گر کر آدھے سے زیادہ زمین میں پیوست ہو گیا، ایک سن رسیدہ کسان یہ تیر لاسور کے حاکم کانہا کے پاس لایا۔ وہ راجہ رام دیو کے پاس لے گیا۔ تیر اتنا لمبا اور بھاری تھا کہ راجہ رام دیو کو یقین نہ آیا۔ بالآخر یہی تیر بلاکت کا ہرکارہ" (ثابت ہوا)، تاریخ پاکستان و بھارت ص۲۶۵۔ [2] یہی کھنکے آجکل "اورنگ آباد" کے نام سے مشہور ہے۔ (دیکھو تاریخ پاکستان و بھارت ص۲۶۶)۔ [3] سب مورخ متفق ہیں کہ ایک حملے میں اتنا مال و متاع کسی فاتح کو کبھی نہ ملا ہوگا! (تاریخ پاکستان و بھارت ص۲۶۸)

ہولناک ـــــ!

کڑہ سے دیوگری جانے، وہاں فتح حاصل کرنے اور فتح حاصل کر کے وہاں سے کامیاب و کامران مال غنیمت سے لدپھند کر واپس آنے میں قریباً ایک سال کی مدت لگ گئی۔ ۱۲۹۴ء میں وہ کڑہ سے رخصت ہُوا تھا اور ۱۲۹۵ء کے آغاز میں واپس آیا۔ اس تمام مدت میں وہ بذاتِ خود شہنشاہِ جلال الدین کو کوئی خط نہیں لکھ سکا۔ البتہ اس کی طرف سے اس کے نائب ملک ظفر خاں کے عروضات برابر پہنچ رہے تھے جن میں بتایا جاتا تھا کہ علاء الدین چندیری کے محاصرے میں مشغول و مصروف ہے۔

جلال الدین کو حیرت تھی کہ علاء الدین جیسا دلاور اور منچلا چندیری جیسے مقام پر ایسا اُلجھا کہ نہ اس معرکہ کو سر کر سکا، نہ کوئی خط لکھ سکا۔ ایک روز مجلسِ حکومت میں یہ بات اس نے اپنے بعض امراء اور سرداروں سے بھی کہی۔ اس نے کہا:۔

"سمجھ میں نہیں آتا کہ علائی کو چندیری کے فتح کرنے میں اتنی دیر کیوں لگ رہی ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ خط کیوں نہیں لکھتا؟"

ایک مصاحب ادھم خاں نے کہا:۔

"جہاں پناہ! اگر جان کی امان پائے تو غلام کچھ عرض کرے!"

جلال الدین: "ہاں تمہیں امان حاصل ہے، کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟"

ادھم خاں: "غلام کو تو کچھ دال میں کالا نظر آتا ہے۔ بھلا یہ کیونکر ممکن ہے کہ جو شخص بڑے بڑے معرکوں کو چٹکی بجاتے میں سر کرلے، اسے چندیری جیسے معمولی مقام کے فتح کرنے میں ایک سال لگ جائے اور وہ بھی اس طرح کہ خط لکھنے کا وقت تک نہ نکال سکے!"

جلال الدین: "ہاں یہ بات ہماری سمجھ میں بھی نہیں آتی ——— تمہارا کیا خیال ہے؟"

ادھم خاں: "غلام ہی کا نہیں ہم میں سے بہتوں کا خیال ہے، یہ کوئی گہری چال ہے!"

جلال الدین: "چال؟ ——— چال کیا ہوسکتی ہے؟"

ادھم خاں: "یہ تو معلوم ہی ہے کہ آپ کی نوازشاتِ بے پایاں کے باوجود ملکۂ جہاں کی سرپرستی اور کرم گستری کے باوجود ——— خانوادۂ خلجی کی شاہزادی تک علائی کے عقد میں دے دی گئی ——— وہ کچھ خوش نہیں گئے یہاں سے!"

جلال الدین: "علائی یہاں سے خوش نہیں گیا ہے؟ ——— آخر کیوں؟"

ادھم خاں: "وہ شاہزادی کے مرتبوں سے ناواقف ہیں۔ انہیں بیوی کی طرح اپنے ساتھ کڑہ لے جانا چاہتے تھے، ظاہر ہے ملکۂ جہاں اس پر رضامند نہیں ہوسکتی تھیں ——!"

جلال الدین: "اور یہ بات ہم بھی قبول نہیں کرسکتے تھے!"

ادھم خاں: "بس اسی پر روٹھ گئے، اور یکہ و تنہا تشریف لے گئے۔"

جلال الدین: "اچھا، مان لیا، وہ ہم سے خفا ہے، ہم منا لیتے، لیکن اس نے خط و کتابت کیوں بند کردی ہے؟ ——— کیا وہ بغاوت کی تیاریاں کررہا ہے؟ وہ ہم سے نبرد آزما ہونا چاہتا ہے؟"

ادھم خاں: "سلطنت اور حکومت کے لئے آدمی سب کچھ کرگزرتا ہے!"

جلال الدین: "وہ میرا بھتیجا ہے، میں نے اسے پالا ہے، اولاد سے زیادہ محبت کرکے اس کی پرورش

کی ہے، اسے پروان چڑھایا ہے۔ اس کی خواہشیں پوری کی ہیں، اسے اُبھرنے اور ترقی کرنے کے زیادہ سے زیادہ مواقع دیے ہیں ——— میں نے کیا نہیں کیا ہے اس کے ساتھ؟ پھر بھی وہ مجھ سے برسرِ پرخاش ہو سکتا ہے؟ میرے خلاف بغاوت کی تیاریاں کر سکتا ہے؟ میرے خلاف سازش میں حصہ لے سکتا ہے؟ ——— کم از کم میں تو کسی طرح بھی یہ باور کرنے کو تیار نہیں ہو سکتا۔ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ میرے ہاتھ پاؤں میرے خلاف آمادۂ بغاوت ہو جائیں ——— کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے؟"

ادھم خاں: "خدا جہاں پناہ کا سایہ تا قیامِ قیامت سلامت رکھے ——— اس دُنیا میں سب کچھ ہو سکتا ہے۔ بادشاہت اور سلطنت کے لیے کیا کچھ نہیں ہوتا؟"

جلال الدین: "ہاں ہوتا ہے ——— لیکن میں علائی کے بارے میں یہ گمان نہیں کر سکتا!"

ادھم خاں: "خدا کرے غلام کا خیال غلط ہو!"

جلال الدین: "ہاں، تمہیں غلط فہمی ہے ——— اچھا ہم ایک بات کیوں نہ کریں؟"

ادھم خاں: "جہاں پناہ جو بات سوچ سکتے ہیں وہ ہم غلاموں کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آ سکتی۔"

جلال الدین: "ہم نے سوچا ہے کہ ہم خود گوالیار جائیں[1]۔ وہاں پہنچنے کے بعد سارے حقائق از خود واشگاف ہو جائیں گے۔"

ادھم خاں: "جہاں پناہ کی رائے بہت مناسب ہے لیکن اس زحمت سے آخر حاصل کیا ہوگا؟"

جلال الدین: "اگر علائی کسی مصیبت میں گرفتار ہے، تو اس کی مدد کریں گے۔ اگر وہ واقعی برسرِ پرخاش ہے تو اُسے گرفتار کر کے اپنے ساتھ لیتے آئیں گے اور کیفرِ کردار کو پہنچائیں گے!"

---

[1] چندیری گوالیار کا اب بھی ایک ویران مقام ہے لیکن آثارِ قدیمہ بتاتے ہیں کبھی یہ کوئی بڑی جگہ تھی۔

ادھم خاں ۔ "سبحان اللہ! واقعی بادشاہ کی رائے خود اس کی رائے نہیں ہوتی، خدا کا فیصلہ ہوتا ہے، اسی لئے تو ہم لوگ بادشاہ کو ظلِ اللہ کہتے ہیں۔ اگر خدا کی رحمت اس کے سر پر سایہ فگن نہ ہو، تو قدم قدم پر جو مسائلِ مہمہ درپیش آتے رہتے ہیں، وہ کیونکر حل ہوں؟ بادشاہت، بادشاہت ہے، کچھ ہنسی کھیل نہیں —— اس سے بہتر کوئی رائے ہو نہیں سکتی، سبحان اللہ! سبحان اللہ!"

جلال الدین ۔ "بس تو اب ہمیں جلد از جلد گوالیار کی طرف کوچ کرنا چاہیے!"

بادشاہ جب کوئی ارادہ کر لیتا ہے تو اس کی تکمیل میں دیر نہیں لگتی۔ وہ جو چاہتا ہے فوراً ہو جاتا ہے۔ ذرا بھی تو دیر نہیں لگتی!

اس گفتگو کے چوتھے یا پانچویں دن، جلال الدین خلجی، شاہانہ تزک و احتشام کے ساتھ گوالیار روانہ ہو گیا، مقصد یہی تھا کہ اگر دستگیری کی ضرورت ہو تو مدد کرے، بغاوت کی تیاریاں ہوں تو سر کچل دے۔ کوئی بات نہ ہو تو سیر و شکار اور لطف و تفریح سے جی بہلائے اور چند روز دارالسلطنت سے باہر رہ کر تازہ دم ہو کر واپس آ جائے[1]۔

لیکن گوالیار پہنچ کر ایک دوسری حقیقت منکشف ہوئی، یعنی یہ کہ چندیری کا محاصرہ صرف ایک فریب ہے، نہ علاء الدین تشریف رکھتے ہیں، نہ ملک ظفر خاں!

جلال الدین اب تک علاء الدین کے بارے میں کچھ زیادہ مشتبہ نہ تھا۔ لیکن اب واقعی اس کے

---

[1] اسی سفر و شکار کے دوران میں قلعہ گوالیار کے باہر جلال الدین نے ایک وسیع شہ نشین اور شاندار ایوان تعمیر کیا اور کتبہ کے لئے خود یہ رباعی کہی:۔

ما را کہ قدم بر سرِ گردوں ساید   از تودۂ سنگ و گِل چہ قدر افزاید
ایں سنگ شکستہ زاں نہادیم درن   باشد کہ دلِ شکستہ و آساید!

دل میں اندیشہ ہائے دُور دراز پیدا ہونے لگے۔ اب وہ سنجیدگی کے ساتھ یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ اصل راز کیا ہے؟ اصل معاملہ کیا ہے؟ آخر اس جھوٹ کی ضرورت کیا تھی؟ اس فریب کاری کا مقصد کیا ہے؟ آج بھی اتفاق سے ادھم خاں سامنے موجود تھا۔ جلال الدین نے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ ماجرا کیا ہے؟ نہ علائی یہاں موجود ہے نہ ملک ظفر خاں!"

ادھم خاں ۔"جہاں پناہ نے غلام کی جس رائے کو غلط فہمی اور بدگمانی تصور کیا تھا۔ آج اور زیادہ شدت کے ساتھ وہ اپنی رائے پر قائم ہے، خود غور فرما لیجئے۔ آخر اس جھوٹ اور فریب کا مقصد کیا ہو سکتا ہے؟

جلال الدین ۔"ہاں، ہماری سمجھ میں بھی یہ بات نہیں آتی اور ہم یہ بات ماننے پر اپنے تئیں مجبور پاتے ہیں کہ ضرور کوئی خاص مقصد ہے اس جھوٹ اور فریب کاری کا؟"

ادھم خاں ۔"اور آج ہی غلام نے ایک ایسی بات سُنی ہے کہ اگر وہ سچ ہے . . . . ."

جلال الدین ۔"علائی کے بارے میں تم نے سُنا ہے کچھ؟"

ادھم خاں ۔"جہاں پناہ! غلام نے شہزادہ علاء الدین کے بارے میں سنا ہے کہ وہ چندیری کا نام کر کے در اصل قلعہ دیوگری فتح کرنے گئے تھے تاکہ وہاں سے بے اندازہ مال و دولت لائیں۔ اور پھر جنگی تیاری کر کے دلّی کی سلطنت پر خدا نخواستہ قبضہ کرنے کی حسرت پوری کریں!"

جلال الدین ۔ (پریشان ہو کر) "تو علاء الدین کڑے میں نہیں ہے، دیوگری میں ہے، ہو گئی ہیں؟ ——؟

ادھم خاں ۔"لیکن اب وہ کامیاب و کامران دیوگری کو فتح کر کے، وہاں سے بے اندازہ دولت حاصل کر کے، ہیرے جواہرات، اور موتیوں کا انبار لے کر سونے اور چاندی کی سلیں، اونٹوں اور ہاتھیوں کی پیٹھ پر لاد کر، راجہ رام دیو کی لڑکی کو حبالۂ عقد میں لے کر کڑہ واپس پہنچ چکے ہیں۔"

اب ہمیں انتظار کرنا چاہئے کہ پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے ؟"

جلال الدین ۔ (ششدر ہو کر) "تعجب !! ــــــ یہ باتیں تو ایک کہانی معلوم ہوتی ہیں۔ بار بار سوچتا ہوں، لاکھ لاکھ دماغ پر زور دیتا ہوں، لیکن عقل کام نہیں کرتی۔ دماغ ساتھ نہیں دیتا ــــــ کیسے یقین کر لوں ؟ اور کیونکر یقین نہ کروں ؟ ــــــ بیٹے کو دشمن سمجھوں ــــــ اور اس کی تلوار کو چمکتا دیکھوں، پھر بھی اپنی آنکھوں کو جھٹلا دوں، اور یقین کرنے سے انکار کر دوں ــــــ ؟ ادھم خاں ! یہ کیا ہے ؟ ــــــ یہ کیا ہے ؟"

ابھی ادھم خاں کوئی جواب نہ دینے پایا تھا کہ اطلاع ملی علاء الدین کا پیامبر آیا ہے۔ جلال الدین نے فوراً اسے شرفِ باریابی عطا کیا۔ اگرچہ غصہ چہرے سے ہویدا تھا، آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے، ماتھے کی شکنیں اُبھری ہوئی تھیں۔ لیکن وہ علاء الدین کا نامہ خاموشی اور صبر سے سنتا رہا۔ نامہ میں علاء الدین نے عفو و تقصیر کی التجا کی تھی، اپنی غلطی کا اعتراف کیا تھا، اپنے منچلے پن اور اولو العزمی کو شفیع بنایا تھا کہ دیوگری کی دولت سمیٹ کر شہنشاہ کے قدموں پر لا ڈالنے کی تمنا نے اس خطرناک مہم پر آمادہ کیا۔ نامہ سننے کے بعد جلال الدین نے کہا :

"ہم نے اسے معاف کیا ــــــ اس سے کہو ساری دولت لے کر دہلی میں فوراً حاضر ہو !"

یہ کہتے ہی جلال الدین اُٹھ کھڑا ہوا ــــــ اور مجلس برخاست ہو گئی، ــــــ !

اب گوالیار میں ٹھہرنے کی ضرورت نہ تھی !

جلال الدین گوالیار سے دہلی پہنچا۔ اسے توقع تھی کہ علاء الدین سر بہ بہت جھکائے اس کے سامنے حاضر ہو گا ــــــ لیکن یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ علاء الدین خود تو نہیں آیا اس کا نامہ بر موجود ہے ! یہ سُن کر جلال الدین کو بہت غصہ آیا، یہ کھلی ہوئی سرکشی تھی۔ اس نے ادھم خاں سے پوچھا :۔

"کیا یہ بغاوت نہیں ہے؟"

ادھم خاں نے کانپتے ہوئے کہا "بغاوت کے علاوہ اسے کسی اور چیز سے موسوم نہیں کیا جاسکتا!"

جلال الدین "علائی کے قاصد کو واپس کردو۔ ہم اسے شرفِ باریابی عطا نہیں کریں گے اور قاصد سے یہ بھی کہہ دو کہ وہ علائی سے کہہ دے، وہ ہم سے ملنے ہماری خدمت میں حاضر ہونے نہیں آیا لیکن ہم خود کڑہ اس سے ملنے آتے ہیں!"

یہ فیصلہ سُن کر حاضرینِ مجلس پر ایک سناٹا چھا گیا۔ سب لوگ دہل گئے ——— یہ بڑا خوفناک اور خطرناک فیصلہ تھا۔ لیکن جلال الدین خلجی کا فیصلہ تھا، اسے کوئی رد نہیں کرسکتا تھا اسے کوئی منسوخ نہیں کرسکتا تھا۔ یہ صرف اس لئے تھا کہ اس کی تعمیل ہو!

جلال الدین کو اہلِ دربار نے بہت کچھ سمجھایا۔ لیکن اس نے کسی کی نہ سنی۔ اسے یقین تھا کہ علائی اس کی صورت دیکھتے ہی رومال سے دونوں ہاتھ باندھے گا اور قدموں پر سر جھکا دے گا، اسی لئے اس نے کچھ زیادہ فوج بھی ساتھ نہ لی۔ رمضان المبارک کا مہینہ تھا۔ برسات کا موسم تھا، ندی چڑھی ہوئی تھی، لیکن وہ روزہ رکھ کر کشتی میں بیٹھا، اور تیر کی طرح کڑہ پہنچ گیا ——— دوسرے کنارے پر علاءالدین فوجی جمعیت لئے ہوئے استقبال کو آیا۔ عصر کے بعد روزہ دار سلطان کا بجرا کنارے پر لگا۔ بھتیجے نے اُترتے ہی جھک کر قدم لئے۔ مگر عین اس وقت کہ بوڑھا چچا بغلگیر ہوکر محبت کی باتیں کر رہا تھا، خونیوں نے گھات سے نکل کر حملہ کیا۔ جلال الدین بجرے کی طرف یہ کہتا ہوا لپکا :

"اے علائی بدبخت چہ کردی!"

لیکن تاتاریوں نے کشتی تک پہنچنے کی نوبت نہ دی، کنارے ہی پر گرا کر سر کاٹ لیا۔[1] (رمضان ۶۹۵ھ مطابق ۱۲۹۵ء)۔

جو تھوڑے سے سپاہی جلال الدین کے ساتھ آئے تھے، اُنھوں نے اپنی کشتیاں موڑلیں، اور واپس چلے گئے۔ علاء الدین نے بھی تعاقب نہیں کیا۔ پھر اس نے چچا کی لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ظفر خاں سے کہا:-

"تمہاری فراست اور پیش بندی نے آج میری جان بچالی۔ اگر میں تمہارا کہنا نہ مانتا اور دلّی چلا جاتا، تو آج میرا حشر بھی یہی ہوتا!"

[1] تاریخ پاکستان و بھارت صفحہ ۲۸

تختِ کبریائی!

اب علاءالدین خلجی کے لئے راستہ صاف تھا۔ بادشاہت کا تاج ابھی تک اس نے زیبِ سر نہیں کیا تھا لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہ تھا کہ یہ تاج اس کے قبضہ میں آچکا تھا، اسے اختیار تھا، جب چاہے سر پر رکھ لے!

اب علاءالدین کے سامنے سب سے اہم سوال یہ تھا کہ کیا کرے؟ بادشاہت کا منصب اختیار کرنے کے لئے ضروری تھا کہ دلّی جائے، اور دلّی جاتے ہوئے یوں جھجک ہوتی تھی کہ جلال الدین کے بیکسانہ قتل نے مسلمانانِ دلّی میں نفرت اور غم و غصہ کے جذبات پیدا کر دیئے تھے۔ شجاعت اور دلیری کے باوجود علاءالدین کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ دلّی کا رُخ کرے!

اس موقع پر ایک مرتبہ پھر اُس نے اپنے رفیق و معتمد ملک ظفر خاں کو طلب کیا اور اُس کے سامنے یہ سوال رکھا۔ اس نے کہا:۔

"چچا کا قتل واقعی ایک بہت بڑا سانحہ ہے۔ میرے ہاتھ اس خون سے رنگین ہیں لیکن اگر میں یہ نہ کرتا تو خود میری جان کی خیر نہ تھی!"[1]

---

[1] تاریخ پاکستان و بھارت صـ ۲۷۱ ۔ بحوالہ فتوح السلاطین صـ ۲۴۳

ملک ظفر خاں۔ "مجھے بھی یہ اطلاع ملی ہے کہ دلی کے مسلمان برہم ہیں اور صاف بات یہ ہے کہ دلی ہی میں نہیں، ہر جگہ کے مسلمان اس بات سے خفا ہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے جب انہیں صحیح حالات معلوم ہوں گے تو وہ اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ ان کی برہمی کا اصل سبب یہ ہے کہ وہ آپ کو ظالم اور شہنشاہ مرحوم کو مظلوم سمجھ رہے ہیں۔ لیکن جب اصل حقیقت ان کے علم میں آئے گی تو نقشہ یکسر بدل جائے گا!"

علاء الدین۔ "ٹھیک کہتے ہو۔ لیکن اصل حقیقت کب سمجھ میں آئے گی؟ جب تک یہ حقیقت سمجھ میں نہ آئے اس وقت تک کیا ہوگا؟ یہ بھی تو سوچنا ہے!"

ملک ظفر خاں۔ "اس کی کوئی پروا نہیں۔ اس مشکل کا حل میرے پاس ہے!"

علاء الدین۔ "تو بتاتے کیوں نہیں تاکہ ہم اسی پر عمل کریں، اس کا تجربہ کریں، حالات کو درو براہ کرنے کی کوشش کریں"

ملک ظفر خاں۔ (مسکرا کر) "میرے آقا! وہ نسخہ تو بہت آسان ہے، سب جانتے ہیں کہ آپ نے وہ شعر نہیں سنا: ؎

اے زر تو خدا نہ و لیکن بخدا   ستار العیوب و قاضی الحاجاتی!

اس پر ہم عمل کریں گے!

علاء الدین۔ "یعنی انعام و اکرام، بذل و عطا، داد و دہش؟"

ملک ظفر خاں۔ "ہاں میرے آقا! زرپاشی سے تو قاتل اور لٹیرے بھی مقدس بن جاتے ہیں۔ آپ کی صورت تو بالکل برعکس ہے۔ آپ اگر قاتل ہیں بھی تو حفاظت خود اختیاری کے سلسلہ میں!"

علاء الدین۔ (سوچتے ہوئے) "ہاں تجویز معقول ہے ———— لیکن ایک سوال ابھی حل طلب باقی ہے!"

ملک ظفر خاں: "وہ کون سا سوال میرے ولی نعمت ——— ؟"

علاء الدین: "ملکہ جہاں ابھی دہلی میں ہیں، چچا مرحوم کے لڑکے بھی وہاں ہیں، ان لوگوں سے بہر حال عوام کو زیادہ ہمدردی ہوگی!"

ملک ظفر خاں: "غلام کو اپنے آقا کے خیال سے اختلاف ہے، جلال الدین کا بڑا لڑکا جو اس کا جانشین بننے کی صلاحیت رکھتا ہے، ہماری خوش قسمتی سے دلّی میں نہیں ملتان میں ہے۔ چھوٹا لڑکا عیش پسند، مغرور اور نااہل ہے، اس کی بادشاہت دلّی کے عوام قبول نہیں کریں گے۔ رہیں ملکہ جہاں، تو اب ان میں اتنی سکت نہیں کہ ہمارے آقا کے مقابلہ میں آسکیں ——— !"

علاء الدین: "ظفر خاں! ہم تمہاری اصابت رائے کے قائل ہیں۔ واقعی تم نے بڑے پتہ کی باتیں کہی ہیں۔"

ملک ظفر خاں: "بندہ نوازی اور حوصلہ افزائی ہے آقائے ولی نعمت کی!"

علاء الدین: "تو پھر گویا طے یہ پایا کہ ہمیں دلّی کی طرف کوچ کرنا چاہئے!"

ملک ظفر خاں: "بیشک، ——— بڑے اصرار کے ساتھ غلام کی یہ رائے ہے!"

ظفر خاں کی حوصلہ افزائی نے علاء الدین خلجی کے ڈگمگاتے ہوئے قدموں کو ثبات بخشا ورنہ دہلی جانے کے بجائے لکھنوتی جانے کا فیصلہ کرچکا تھا۔ تاکہ بقیہ زندگی آرام و آسائش کے ساتھ وہیں گزارے لیکن ظفر خاں کے اکسانے سے اپنا رخ بدل دیا، لکھنوتی کا ارادہ ختم کردیا، اور دلّی کی طرف چل پڑا۔ کڑہ سے چلتے وقت تک کوئی بہت بڑی فوج اس کے ساتھ نہیں تھی۔ لیکن بدایوں پہنچتے پہنچتے ساٹھ ہزار سپاہی اس کے جھنڈے تلے جمع ہوچکے تھے، جو نئے بادشاہ کی فوج میں اس لئے شریک ہوئے تھے کہ اگر ضرورت پڑی اور دلّی میں خونریزی کی نوبت آئی تو بہادری کے جوہر دکھائیں گے، اور منہ مانگا انعام پائیں گے۔ راستہ بھر علاء الدین دریا دلی کے ساتھ روپیہ نچھاور کرتا ہوا آیا تھا۔ اس

واقعہ نے اور زیادہ لوگوں کو اس سے پُر اُمید کر دیا تھا۔ بدایوں کا قدیم صوبہ دار مقابلہ کی سکت نہ پا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ بڑی آسانی سے علاء الدین نے یہاں اپنا تسلط قائم کر لیا۔ اب دلی کی منزل سامنے تھی۔ حوصلہ بلند تھا۔ ہمت جواں تھی۔ یہ لشکرِ گراں دلی کی طرف بڑھا۔ علاء الدین دلی کی طرف ــــ "اس شان سے چلا کہ تمام راستے سونے چاندی کے پھول نچھاور کرتا جاتا تھا۔ ہاتھی پر ایک چھوٹی سی منجنیق رکھوالی تھی۔ وہ یہ "اختر زر" (بجائے آگ کے) دُور دُور تک پھینک رہی تھی۔ خلقت انہیں لُوٹ لُوٹ کر اپنی جھولیاں بھر رہی تھی ــــــ "[1] جب علاء الدین دہلی میں پہنچا ہے تو اس کا دل دھڑک رہا تھا لیکن جب اس نے دیکھا کہ زر پاشی کام کر گئی، لوگوں کے دل خرید لئے گئے، تو اس کے ہونٹوں پر کامیابی کا تبسم نمودار ہوا۔ تمام اندیشے کافور ہو گئے۔" وہ اطمینان کے ساتھ دلی میں داخل ہوا۔ ملکۂ جہاں کی زندگی اب اس کے ہاتھ میں تھی۔ لیکن اس نے ملکہ کی جان بخشی کی اور کسی قسم کا تعرض نہیں کیا۔ دوسرے شہزادوں کو گرفتار کر کے ہانسی کے قلعہ میں نظر بند کر دیا۔ پھر بڑی دھوم دھام اور تزک و احتشام کے ساتھ جشنِ تاجپوشی منایا گیا۔ اس موقع پر پھر بے اندازہ دولت لٹائی گئی ــــ "قدیم امراء کے مناصب اور جاگیرات میں اضافے کئے گئے۔ مساکین و مستحقین کو صدقہ و خیرات کی مد میں لاکھوں روپے ملے۔ ہر طبقہ کے لوگوں میں اتنے انعام بٹے کہ محتاج فارغ البال اور فارغ البال مالا مال ہو گئے۔ ان رنگ رلیوں میں کسی کو یاد نہ رہا کہ جس شخص کی اطاعت گزاری کا

---

[1] امیر خسرو نے اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے: ؎

خوشا دریدش منزل بہ منزل
بہ از کردہ کلید کارِ مشکل!

چو با دہلی فتاد از فتح کارش
گرفت از منجنیق زر حصارش

سلطنت اُٹھائے ہیں، کل اس سے کتنے خفا تھے اور گالیاں دے رہے تھے[1] —————! [2]

علاء الدین کی یہ بہت بڑی کامیابی تھی۔ جو شخص کل تک اپنے گھر میں بے وقعت تھا۔ وُہ آج دُنیا کے ایک بہت بڑے مُلک کا بادشاہ تھا!

اپنی ہمتِ بلند کے سامنے علاء الدین کسی بڑے سے بڑے خطرہ کو خاطر میں نہ لاتا تھا کسی بات کو ناممکن نہیں سمجھتا تھا، اپنے آپ کو ہر بلندی اور رفعت کا مستحق خیال کرتا تھا۔ لیکن آج جو اعزاز اسے حاصل ہوا تھا، یہ خود اس کی توقع سے بھی زیادہ تھا۔ اس کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں آئی تھی کہ کسی دن دلّی کو اپنا پایۂ تخت بنا کر ہندوستان پر راج کرے گا۔ لیکن اس دُنیا میں ناممکن واقعات بھی جب عدم سے وجود میں آجاتے ہیں تو پھر وہ ایک معمولی واقعہ بن جاتے ہیں۔ چند ہی روز بعد اس غیر معمولی واقعہ کی اہمیت علاء الدین کے دل سے محو ہو گئی، اور وُہ اطمینان کے ساتھ تختِ حکومت پر بیٹھ کر خداوندی کے کرشمے دکھانے لگا! ————— وہ اب ایک ایسا شہنشاہ تھا، جس کے سامنے سب کی گردنیں جھکی تھیں جس کے دربار میں بڑے بڑے سرکش کانپتے اور تھراتے ہوئے حاضر ہوتے تھے جس کے حضور میں کسی بڑے سے بڑے آدمی کو لب کشائی کی جراٴت نہیں ہوتی تھی، جس کا ایک اشارۂ چشم لوگوں کی زندگی اور موت کا فیصلہ کر دیتا تھا جس کے فرمان سب کے لئے واجب التعمیل تھے۔ کسی کو مجالِ دم زدن نہ تھی۔ جس کی جنبشِ لب ملکوں، ریاستوں راجواڑوں اور راجاؤں کی قسمت کے فیصلے کیا کرتی تھی، اور ان فیصلوں کی پھر کہیں اپیل نہ تھی۔ اس لئے کہ علاء الدین خلجی نہ اپنے فیصلوں پر نظرِ ثانی کا عادی تھا، نہ کسی مشیر یا صلاح کار میں یہ

---

[1] تاریخ پاکستان و بھارت صـ ۲۴۳

[2] ضیاء الدین برنی لکھتا ہے کہ ساری خلقت روپے کی دیوانی ہو رہی تھی، سانگ تماشوں میں ایسی محو تھی کہ بادشاہ کے فعلِ قبیح اور کفرانِ نعمت کا کوئی ذکر بھی زبان پر نہ لاتا تھا۔" صـ ۲۴۸

ہمت تھی کہ اس کی بات ٹھکل سکے!

تخت حکومت پر متمکن ہونے کے بعد علاء الدین نے اپنے پرانے دوستوں، ساتھیوں اور رفیقوں کو ہر طرح سے نوازا۔ انہیں بے اندازہ مال و دولت کا مالک کر دیا۔ انہیں بڑے بڑے منصب پر فائز کر کے ان کی اہلیتوں اور صلاحیتوں کو چمکا دیا۔ ان کے کردار اور سیرت میں جلا پیدا کر دی،

اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ان لوگوں میں سرِ فہرست جو نام تھا، وہ تھا ملک ہزبرالدین ظفر خاں کا!

دیول دیوی!

یوں تو گجرات میں کئی ریاستیں تھیں، اور سب ہی آزاد و خود مختار تھیں لیکن بگلانہ نہ صرف رقبہ اور وسعت کے لحاظ سے، نہ صرف دولت و ثروت کے اعتبار سے بلکہ محل وقوع اور اہمیت کے سبب بھی دوسری تمام ریاستوں سے ممتاز اور یگانہ تھی۔ یہاں کا راجہ کرن رائے اپنی خود مختاری اور بہادری پر نازاں تھا اُسے فخر تھا کہ وہ آج تک کسی کا مطیع نہیں ہوا۔ اس کی ریاست کے حدود میں کسی دشمن نے قدم نہیں رکھا کوئی فوج بھی یہ جرأت نہیں کر سکی کہ اس کی سرزمین کو پامال کرنے کا ارادہ کرے۔ وہ اپنے دوسرے ہمعصر رجواڑوں، مارواڑ، جھالاواڑ اور اٹھل واڑہ وغیرہ کا مذاق اڑایا کرتا تھا کہ رسماً سہی لیکن یہ شہنشاہ دہلی کے مطیع اور باجگذار ہیں۔ اپنے اوپر ناز کیا کرتا تھا کہ دلی کا بادشاہ اس کی مونچھیں نیچی نہیں کر سکا ہے۔ کرن رائے اپنے آپ کو جس طرح فہم و فراست اور تدبر و حکمت عملی میں یکتائے روزگار سمجھتا تھا اسی طرح بہادری اور دلیری میں بھی یگانۂ عصر سمجھا کرتا تھا، وہ کسی حکومت کو خاطر میں نہ لاتا تھا نہ کسی شخصیت سے مرعوب و متاثر ہوتا تھا!

لیکن ادھر چند روز سے وہ خاصا پریشان اور دلگیر نظر آرہا تھا۔ دربار میں یا تو آتا ہی نہیں تھا یا اگر آتا تھا تو رانی اور راجکماری تک سے سیدھے منہ بات نہیں کرتا تھا۔ رانی کنولا دیوی سے اسے

محبت کا دعویٰ تھا، اور رانی بھی ایک ہندو عورت کی طرح اپنی زندگی کا مقصد صرف شوہر پرستی ہی سمجھتی تھی، وہ بے انتہا خوبصورت تھی۔ ہزاروں میں ایک، لاکھوں میں انتخاب، اس کی عمر تقریباً تیس سال کی تھی۔ لیکن کسی طرح بھی وہ بیس سال سے زیادہ کی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ اس کا نکھار، اس کی رعنائی، اس کی سحر طرازی، اس کی ادائیں، اس کا رنگ روپ، اس کی چھل بل، اس کی آواز، اس کی رفتار، اس کی گفتار، ہر چیز میں ایک آن تھی، ایک شان تھی۔ وہ پھولوں کا گہنا پہنتی تو اس کے حسن میں اضافہ نہ ہوتا، ہاں پھولوں کی شوبھا بڑھ جاتی۔ جب وہ ہیرے جواہرات کے خوش رنگ اور گراں قیمت زیور پہنتی تو ایسا معلوم ہوتا جیسے ان ہیروں کی قیمت پہلے بہت کم تھی، لیکن اب رانی کنولا دیوی کے جسم پر آنے کے بعد کچھ اور بڑھ گئی ہے، ——— وہی بات جسے غالبؔ نے بڑی خوبی اور بڑے مزے سے بیان کیا ہے:؎

ترے جواہرِ طرفِ کلہ کو کیا دیکھیں؛
ہم اوجِ طالعِ لعل و گہر کو دیکھتے ہیں!

رانی کنولا دیوی کی ہر بات میں ایک وقار تھا، ایک دبدبہ تھا۔ کرن رائے اس پر جان و دل سے شیدا تھا، اور وہ کرن رائے کی مورتی دل میں رکھ کر ہر آن پوجا کیا کرتی تھی۔

ان دونوں کی محبت کا پھل راجکماری دیول دیوی تھی۔ ہوبہو ماں کی تصویر، وہی رعنائی وہی زیبائی، وہی سحر طرازی اور بانکپن، وہی انداز دلبری، وہی شان دلربائی، فرق جو کچھ تھا، وہ عمر کا تھا۔ کنولا دیوی دُنیا کی تیس بہاریں دیکھ چکی تھی، اور دیول دیوی نے مشکل سے چودہ بہاریں اس دُنیا کی دیکھی ہوں گی۔ دونوں کو پاس پاس بٹھا دیا جائے تو کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ دونوں ماں بیٹی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ مان سکتا تھا کہ چھوٹی بڑی بہنیں ہیں۔ جن میں عمر کا تفاوت مشکل سے تین چار سال کا ہوگا!

دیول دیوی کے بعد کرن رائے کی کوئی اولاد نہیں ہوئی - اور اسے اس کا کوئی صدمہ بھی نہیں تھا۔ وہ دیول دیوی پر قانع تھا، اگر کوئی لڑکا بھی ہوتا تو وہ اس کو دیول دیوی سے زیادہ نہ چاہتا۔ کہنے کو وہ باپ تھا لیکن باپ کی سخت گیری کے بجائے ماں کی ممتا اس کے سینے میں لہریں مار رہی تھی۔ اس نے دیول دیوی کو بڑی اچھی تعلیم دلائی، بڑی اچھی تربیت دی، قدرت کی طرف سے وہ فطرت بھی ایسی لے کر آئی تھی جس میں شان، وقار اور دبدبہ تھا، اور ساتھ ہی ساتھ رحم بھی، مروت بھی، انسانیت بھی، ہمدردی بھی، وہ بڑی اچھی تیر انداز تھی، وہ بڑی اچھی شہسوار تھی، وہ بڑی اچھی مغنیہ تھی، وہ بڑی اچھی رقاصہ تھی۔ کوئی گن اور کوئی فن ایسا نہ تھا جو اسے نہ آتا ہو، اور ان تمام کمالات کے باوجود وہ باحیا تھی، با ادب تھی، سلیقہ شعار تھی، مہذب تھی۔ وہ جب باتیں کرتی تو ایسا معلوم ہوتا جیسے شجر و حجر تک اس کی باتیں سننے میں محو ہیں۔ جب کبھی اکیلے میں یا سہیلیوں کے جھرمٹ میں وہ گاتی، تو ایسا معلوم ہوتا جیسے آسمان سے سورج، چاند اور تارے جھک جھک کر اس کا گانا سن رہے ہیں۔ جب کبھی وہ خوش ہوتی اور ترنگ میں آکر مور کی طرح ناچنے لگتی تو ایسا معلوم ہوتا جیسے زمین اور آسمان رقص میں مصروف ہیں۔ جب کبھی اسے غصہ آتا، اور وفورِ غضب میں اس کا چہرہ سرخ ہو کر گلنار ہو جاتا تو یوں معلوم ہوتا جیسے یہ کائنات اس کے خوف سے لرز رہی ہے۔ جب کبھی وہ خوش ہوتی اور مسکراتی تو یہ معلوم ہوتا جیسے کلیوں نے چٹکنا اور پھولوں نے مسکرانا اسی سے سیکھا ہے۔ جب کبھی وہ صحنِ چمن کی گلگشت کو نکلتی تو یہ معلوم ہوتا جیسے نسیم سحر اٹکھیلیاں کرتی پھولوں کو چھیڑتی گزر رہی ہے۔ وہ ہمہ صفت موصوف تھی، کون سا کمال تھا جو اس میں موجود نہ ہو، کون سی خوبی تھی جو اس کی ذات میں جمع نہ ہو، کون سا ہنر تھا جو اسے آتا نہ ہو!

دیول دیوی صرف مسکرانا جانتی تھی، صرف ہنسنا جانتی تھی، کھیلنا جانتی تھی، عیش و طرب کے عالم میں زندگی بسر کرنا جانتی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی غم کسے کہتے ہیں، پریشانی کس چیز کا نام ہے، صدمہ کیا ہوتا ہے اور آنسو کب نکلتے ہیں اور کیوں نکلتے ہیں؛ وہ دوسروں کو اگر کبھی افسردہ اور مضمحل

دیکھتی تھی، تو حیران ہوتی کہ انہیں کیا ہوگیا ہے، کیوں یہ مسکراتے نہیں، ہنستے نہیں، زندگی سے لطف نہیں لیتے!

ع مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں؟

آخر پھر انہیں زندہ رہنے کی ضرورت کیا ہے؟ اگر یہ خوش نہیں رہ سکتے تو مر کیوں نہیں جاتے؟ ایسی زندگی کس کام کی جو خوشی سے خالی ہو، مسرت سے محروم ہو؟ وہ اس کا تصور ہی نہیں کر سکتی تھی کہ بغیر خوشی کے ہی کوئی زندگی ہو سکتی ہے؟ لیکن ادھر چند روز سے وہ بھی افسردہ اور ملول رہنے لگی تھی۔ یہ جانے بغیر کہ اس کو افسردگی اور ملال کہتے ہیں۔ وہ خوشی سے، مسرت سے، نشاط سے، کھیل اور تفریح سے، مجلس آرائیوں اور رنگ رلیوں سے دُور ہوتی جا رہی تھی ———— کیوں؟ ———— یہ وہ بھی نہیں جانتی تھی۔ اس کا معمول تھا کہ وقت کا اکثر حصہ وہ باپ کی آغوشِ شفقت میں بسر کرتی تھی، کھانا بھی زیادہ تر اُس کے ساتھ کھایا کرتی تھی، اسی کے پاس بیٹھ کر وہ کہانیاں سنتی تھی، اور طرح طرح کے اعتراض کیا کرتی تھی۔ لیکن ادھر چند دن سے یہ سارے مشاغل بند تھے، ———— نہ کہانی سُننے میں اس کا جی لگتا، نہ کھانا کھانے میں کوئی لذت ملتی تھی!

وہ تھوڑی دیر سہیلیوں میں بیٹھتی، کچھ وقت ماں کے پاس صرف کرتی، اور پھر باپ کے ایوان میں پہنچتی۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں راجہ کرن رائے اس کی آمد کا منتظر رہتا تھا، اور جب وہ آتی تھی، تو دُنیا و مافیہا سے بے خبر اس کے استقبال میں لگ جاتا تھا۔ خود اس سے کہانیاں کہتا تھا۔ طرح طرح کی دلچسپ باتیں کرتا تھا، جب تک وہ خود نہیں چلی جاتی تھی، کرن رائے کی یہی تمنا ہوتی تھی کہ ابھی کچھ دیر وہ اَور بیٹھے، کہانیاں سنے، کھیلے، تفریح میں حصہ لے۔

لیکن کیا بات تھی، اِدھر کئی دن سے یہ ایوانِ زرنگار سونا پڑا تھا، ———— ؟

کرن رائے کہیں باہر نہیں گیا تھا، وہ اپنی راجدھانی میں موجود تھا۔ وہ اپنے محل میں موجود تھا،

لیکن رتو اس میں کم آتا تھا، آتا بھی تو دو گھڑی کو، کسی مسافر کی طرح، ——— آیا اور گیا۔

یہ بات رانی کنولا دیوی کو بھی کھٹک رہی تھی۔ لیکن دیول دیوی کی تو حالت غیر ہوتی جا رہی تھی، وہ خوش خوش امید اور مسرت سے بھری ہوئی باپ کے ایوان میں دوڑتی ہوئی پہنچتی تھی، اور وہاں پہنچ کر اسے نہ پاکر مغموم و مایوس، آشفتہ اور دلگیر بجھے ہوئے دل کے ساتھ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی واپس آجاتی تھی۔ پھر اس کا کسی کام میں جی نہیں لگتا تھا۔ پھر وہ کسی مشغلہ سے دلچسپی نہیں لیتی تھی چُپ چاپ بستر پر لیٹ جاتی اور تخیلات کی دُنیا میں کھو جاتی۔ جیسے وہ کچھ سوچ رہی ہو، جیسے وُہ نہ جانے کس فکر میں ہو ———!

اس طرح کئی دن گزر گئے۔ ایک روز جب وہ پھر حسبِ معمول باپ کے ایوان میں پہنچی، اور اسے وہاں موجود نہ پایا۔ دلگیر و دل گرفتہ واپس آئی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اس کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ اتفاق سے رانی کنولا دیوی بھی اس وقت ادھر سے کسی کام کو گزر رہی تھی۔ اس نے جو دیول دیوی کو اس حالت میں دیکھا تو اس کا دِل دُھک دُھک کرنے لگا، وہ گھبرا گئی۔ بجلی کی سی تیزی سے وہ آگے بڑھی اور بیٹی کو سینے سے چپٹا کر اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"میری بچی! کیا بات ہے، تو رو کیوں رہی ہے، ——— کسی نے کچھ کہا؟"

اور دیول دیوی بجائے اس کے کچھ جواب دیتی، ماں کے محبت بھرے سینہ سے چپٹ کر رونے لگی۔ سسکیاں لے لے کر!

کنولا دیوی نے اپنے ہاتھ سے اُس کے آنسو پونچھے اور کہا:۔

"کیا بات ہے بیٹی؛ تُو اتنی دلگرفتہ کیوں نظر آرہی ہے؟ ——— کسی نے کچھ کہا؟ ——— کہا ہو تو مجھے بتا، میں اس کی زبان راکھ لگا کر نکال لوں گی! کوئی تجھ سے سخت کلامی سے پیش آیا؟ آیا ہو تو مجھ سے کہہ، میں اسے دیوار میں زندہ چنوا دوں گی! کسی نے تیری حکم عدولی کی؟ کی ہو تو مجھ

ے نہ چھپا۔ میں ابھی اسے کولہو میں پلوا دوں گی۔ لیکن میری بیٹی، میری بچی! منہ سے تو بول، کچھ تو بتا!"

دیول دیوی:۔ "نہیں ماتا! کسی نے مجھے کچھ نہیں کہا، کسی نے میری حکم عدولی نہیں کی، کوئی مجھ سے سخت کلامی سے نہیں پیش آیا!"

کنولا دیوی:۔ "پھر آخر بات کیا ہے؟ تیری آنکھوں میں آنسو کیوں تیر رہے تھے؟"

دیول دیوی:۔ "کئی دن سے پتا جی نظر نہیں آئے۔ آتے بھی ہیں تو بیٹھتے نہیں۔ اِدھر آئے اُدھر گئے۔ مجھے اُن کے بغیر کچھ اچھا نہیں لگتا!"

رانی کنولا دیوی نے بیٹی کی پیشانی کو بوسہ دیا، اور کہا:۔

"ہاں میں بھی کچھ ایسا ہی دیکھ رہی ہوں، لیکن پریشان ہونے کی بات نہیں۔ ابھی میں انہیں بلواتی ہوں، اور تیرے سامنے پوچھوں گی ـــــــــ چل تجھے آئینہ دکھاؤں، دیکھ تو اپنی کیا حالت بنالی ہے تونے؟

خطرناک سازش!

رانی کنولا دیوی نے اپنی اکلوتی اور چہیتی لڑکی، دیول دیوی کی داستانِ اضطراب خوب نمک مرچ لگا کر راجہ کرن رائے سے بیان کی۔ وہ اگرچہ پریشان اور مضمحل تھا، لیکن بیٹی کی کیفیت سن کر ضبط نہ کر سکا۔ رنو اس میں آیا، اور سیدھا دیول دیوی کے نگار خانہ میں پہنچا ——— اس کا رہنے کا کمرہ واقعی نگار خانہ تھا، ایسا سجا ہوا کہ دیکھ کر طبیعت میں خود بخود ایک رعنائی سی پیدا ہونے لگتی تھی۔

——— دیول دیوی اس وقت بھی اُداس اور چُپ چُپ بیٹھی تھی۔ باپ نے بڑی شفقت سے بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھا اور کہا:

"کیا بات ہے بیٹی، تم اس قدر پریشان اور اُداس کیوں ہو؟ ——— یہ بھی تو سوچو اس اُداسی کا اثر تمہاری ماں پر اور اس سے بھی زیادہ تمہارے باپ پر کیسا تکلیف دہ پڑتا ہے؟"

دیول دیوی نے ایک اندازِ خاص سے باپ کو دیکھا اور گویا ہوئی:۔

پتا جی! مجھے تو کوئی پریشانی نہیں، کئی دن سے آپ کو چُپ چُپ دیکھ رہی ہوں۔ آپ محل میں نہیں آتے۔ آتے ہیں تو ذرا دیر بیٹھ کر چلے جاتے ہیں، میری بات بھی نہیں پُوچھتے۔ اس لئے میرا دل رونے لگتا ہے، آنکھیں بہنے لگتی ہیں!"

کرن رائے :" نہیں بیٹی! ایسی تو کوئی بات نہیں!"

دیول دیوی :" پھر بھی کچھ نہ کچھ ضرور ہے، ——— آخر کیا بات ہے جس نے آپ کو بے کل کر رکھا ہے؟"

کرن رائے :" بیٹی! وہ تیرے سوچنے کی نہیں، اس کا تعلق امورِ مملکت سے ہے!"

دیول دیوی :" آپ تو کہتے ہیں، ایک دن مجھے راج پاٹ سنبھالنا ہوگا، اور پھر وہ بات نہیں بتاتے جو راج کی سلامتی سے تعلق رکھتی ہے؟"

کرن رائے :" جب تک تیرا باپ زندہ ہے ہر آفت جھیل لے گا، ہر وار اپنے سینہ پر روکے گا۔ جب وہ اس دُنیا میں نہ رہے، تب تجھے ضرورت پڑے گی کہ ان باتوں پر غور کرے!"

دیول دیوی :" نہیں پتاجی، آپ کو بتانا پڑے گا، میں آپ کو دکھی نہیں دیکھ سکتی۔ آپ کا اُترا ہوا چہرہ دیکھتی ہوں تو کلیجہ پر سانپ لوٹنے لگتا ہے، اگر میں لڑکا ہوتی جب بھی آپ مجھے اپنے راز سے یونہی بے خبر رکھتے۔ جب کیا آپ اپنا قوت بازو سمجھ کر خود ہی ہر بات نہ بتاتے؟"

کرن رائے :" ارے بیٹی تُو تو بڑی ضدی ہو گئی ہے، کہہ تو رہا ہوں کوئی خاص بات نہیں، مجھے اطلاع ملی ہے کہ کچھ لوگ میرے راج پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں، لیکن دیکھ لینا انہیں اس طرح مسل دوں گا جیسے مچھر!"

دیول دیوی :" وہ تو ٹھیک ہے پتاجی، میں جانتی ہوں آپ سے کوئی ٹکر نہیں لے سکتا، اور لے تو سر سلامت نہیں لے جا سکتا، لیکن ضرور وہ کوئی طاقتور دشمن ہے جس نے آپ جیسے ساونت اور سورما کو پریشان کر دیا ہے؟ ——— کیوں پتاجی؟"

کرن رائے :" ہاں بات تو ایسی ہی ہے — واقعی دشمن بڑا قوی، اور زبردست ہے!"

دیول دیوی :" کہیں مہاراجہ جھالاواڑ تو نہیں؟"

کرن رائے۔ (ہنس کر)" اس غریب میں اتنی جرأت کہاں سے آئی؟ وہ مجھ سے آنکھ بھی نہیں

ملا سکتا۔ اسے فخر ہے کہ میرا نیاز مند ہے!"

دیول دیوی۔ "تو پھر وہ مہارانا مارواڑ ہوں گے؟"

کرن رائے۔ "آخر تو بچہ ہے نا؟ ——— بھلا مہارانا مارواڑ میں اتنی سکت ہے کہ کرن رائے سے دو دو ہاتھ کر سکے۔ وہ تو میرا ایک وار سہنے کا دم بھی نہیں رکھتا!"

دیول دیوی۔ "تو وہ ضرور راجہ انہل واڑہ ہوگا؟ ——— دیکھئے پتا جی میں نے پتہ چلا لیا ———!"

کرن رائے۔ "نہیں بیٹی! یہ بات بھی نہیں، ——— راجہ انہل واڑہ تو موم کی ناک ہے۔ جدھر چاہوں موڑ دوں، وہ بھلا کیا میرے مقابلہ میں آنے کا حوصلہ کرے گا!"

دیول دیوی۔ (بچوں کی طرح ٹھنک کر) "اُونہوں! تو آخر کون ہے وُہ؟"

کرن رائے۔ "شمالی ہند پر مسلمان قبضہ کر چکے ہیں۔ اب اُن کے حوصلے بڑھ رہے ہیں اور وہ گجرات اور دکن پر بھی للچائی ہوئی نظریں ڈال رہے ہیں!"

دیول دیوی۔ "مسلمان؟ ——— میں نہیں جانتی انہیں، یہ لوگ کون ہوتے ہیں؟ بتائیے پتا جی!"

کرن رائے۔ "ان کا مذہب، ان کی زبان، ان کی قومیت، ان کی تہذیب، ان کا سماج، ان کی جنتری، ہر چیز ہم سے جُدا ہوتی ہے، ——— بالکل الگ!"

دیول دیوی۔ "دھرم بھی؟ (دانتوں تلے انگلی دبا کر) ہائے رام!"

کرن رائے۔ "ہاں بیٹی! ان کا دھرم بھی ہم سے الگ ہے، اور دھرم آیا بھی ان کے پاس کہاں سے۔ ناستک (دہریہ) ہیں اچھے خاصے! ——— وہ تو کہو ہماری نااتفاقی نے انہیں اس دیس کا بادشاہ بنا دیا ہے، ورنہ ایک پل بھی ہمارے مقابلہ میں نہیں ٹھہر سکتے!"

دیول دیوی۔ "تو کیا یہ بادشاہ بھی ہوتے ہیں؟"

کرن رائے۔ "ہاں بیٹی، مقدر میں بڑی طاقت ہوتی ہے، جسے جو چاہے بنا دے، ——— بھلا

بتاؤ تو، رہنے والے کہیں کے، اور حکومت کر رہے ہیں ہمارے دیس پر ——— !"

دیول دیوی۔ "یہ تو بہت بُری بات ہے۔ اس کا ضرور تدارک ہونا چاہئے کچھ!"

کرن رائے۔ "تیرا باپ غافل نہیں ہے، اور ایسا تدارک کر رہا ہے کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے یہ مسلمان مٹ جائیں گے!"

دیول دیوی۔ (خوش ہو کر) "ہاں پتاجی، کوئی ایسا جتن کیجئے کہ پھر کبھی یہ سر نہ اُٹھا سکیں!"

کرن رائے۔ "اگر قبر میں سے مُردے سر اٹھا سکتے ہیں، تو پھر یہ بھی اُٹھا لیں گے ——— !"

دیول دیوی۔ "تو آپ نے ایسا بندوبست کیا ہے کہ یہ بالکل نابود ہو جائیں گے؟"

کرن رائے۔ "ہاں! ایسے نابود ہوں گے کہ ان کی خاک بھی کسی کو ڈھونڈے سے نہیں ملے گی۔ یہ مٹ جائیں گے، غارت ہو جائیں گے۔ ان کے مرد، عورتیں، بچے سب موت کے گھاٹ اُتار دیئے جائیں گے۔"

دیول دیوی۔ (تأسف کے لہجہ میں) "عورتیں اور بچے بھی؟ ——— پتاجی عورتوں اور بچوں کا کیا قصور ہے بھلا؟ انہیں بچا لیجئے گا کسی طرح۔ بس مردوں کا صفایا کر دیجئے گا، اچھی طرح سے!"

کرن رائے۔ "نہیں تو نہیں جانتی۔ سانپ کا بچہ سنپولیا ہوتا ہے، اور ان کی عورتیں بھی بڑی نٹ کھٹ ہوتی ہیں۔ یہ سب اسی قابل ہیں کہ ان کی جڑ کاٹ دی جائے۔ انہیں پھر اُبھرنے اور پنپنے کا موقع نہ دیا جائے۔ یہ ظالم ہیں، سفاک ہیں، ستمگر ہیں!"

دیول دیوی۔ (بھولے پن سے) "ہائے رام! ظالم بھی ہیں؟"

کرن رائے۔ "ہاں بیٹی! بہت زیادہ۔ ان کی تلوار معصوموں اور بے گناہوں سب پر چلتی ہے۔ اور جو سامنے آتا ہے، اسے کاٹ کر رکھ دیتے ہیں! ——— اسی لئے تو کہتا ہوں ان کے بچوں کو بھی نہیں بچنا چاہئے۔ بڑے ہو کر اگر زندہ رہے تو وہ بھی ایسے ہی بن جائیں گے جیسے باپ دادا!"

دیول دیوی۔ "پھر ٹھیک ہے، ان کے بچوں اور عورتوں پر بھی رحم نہ کیجئے گا ——— تو پتاجی

کیا آپ فوج لے کر حملہ کرنے جائیں گے ؟"

کرن رائے ۔ (کچھ سوچتے ہوئے) "نہیں بیٹی نہیں، میں نہیں جاؤں گا !"

دیول دیوی ۔ "پھر کون جائے گا؟ ——— کیا کسی اور کو بھیجیں گے آپ ؟"

کرن رائے ۔ "ہاں ایسے لوگوں کو سرکوبی کے لئے بھیج رہا ہوں جو انہیں چھٹی کا دودھ یاد دلا دیں گے !"

دیول دیوی ۔ "پتاجی ! بتا تو دیجئے ان کا دھرم کیا ہے ؟ ہندو ہی ہوں گے ؟"

کرن رائے ۔ "نہیں، نہ وہ ہندو ہیں نہ مسلمان، کچھ اور ہی ہیں !"

دیول دیوی ۔ "کیا وہ بھی ناستک ہیں ؟"

کرن رائے ۔ "ہاں یہی سمجھ لو، وہ نہ بھگوان کو مانتے ہیں، نہ مورتی پوجا کو !"

دیول دیوی ۔ "ہتے کہاں ہیں، کہاں سے آئیں گے، وہ مسلمانوں کو مارنے ؟"

کرن رائے ۔ "تو نے بیٹی تاتاریوں کا نام تو سنا ہوگا ؟"

دیول دیوی ۔ (سہم کر) "وہی ——— چنگیز ——— ؟"

کرن رائے ۔ (خوش ہو کر) "ہاں بیٹی چنگیز بھی تاتاری تھا ۔ اور اس نے جو کچھ کیا، کون نہیں جانتا اس نے دنیا کا تختہ الٹ کر رکھ دیا ۔ اس نے مسلمانوں کو ملیامیٹ کر دیا ۔ اس نے ان کے بڑے بڑے بادشاہوں کو ختم کر دیا !"

دیول دیوی ۔ "لیکن وہ تو مر چکا تھا، کیا پھر سے زندہ ہو گیا ؟"

کرن رائے ۔ (ہنس کر) "نہیں بیٹی مُردے زندہ نہیں ہوتے، اسی تاتاری قوم کا ایک فرد ہے قتلغ خواجہ ۔ اب وہی اُن کی سرداری کر رہا ہے ۔ اسے میں نے اس کام پر آمادہ کیا ہے ۔ اپنا ایک خاص پیامی بھیج کر، اور وہ راضی بھی ہو گیا ہے !"

دیول دیوی ۔ (خوش ہو کر) "یہ تو بہت اچھا ہوا ——— کب چلیں گے وہ اپنے دیس سے ؟"

کرن رائے :" ممکن ہے چل چکا ہو، ممکن ہے چلنے والا ہو - بہرحال وہ آیا ہی چاہتا ہے!"

دیول دیوی :" یہ تو آپ نے بڑی اچھی خبر سنائی - آج سے میں ہر روز پرارتھنا کیا کروں گی کہ قتلغ خواجہ اپنا لشکر لے کر جلد آئے - اور مسلمانوں پر چڑھائی کر کے ان کا سارا کس بل نکال دے! ـــــ جب سے میں نے یہ سنا ہے کہ یہ مسلمان ظالم اور سفاک ہوتے ہیں، بڑی نفرت ہو گئی ہے مجھے اُن سے، جی چاہتا ہے خود تلوار لے کر گھس پڑوں - ان کی راجدھانی میں، اور جو سامنے آئے اسے مُولی گاجر کی طرح کاٹ کر رکھ دوں!"

کرن رائے :" نہیں، تجھے اس کی ضرورت نہیں پڑے گی - لوہے کو لوہا کاٹتا ہے، ظلم کو ظلم ہی دُور کرتا ہے - تاتاریوں کو آ لینے دے - پھر ان مسلمانوں کا مزاج نہ درست ہو جائے تب کی بات ـــــ اور اس کے بعد پھر میں اپنے پڑوسیوں سے سمجھوں گا اچھی طرح -"

دیول دیوی :" پڑوسیوں سے؟ ـــــ پڑوسیوں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے پتا جی؟"

کرن رائے :" تو نہیں جانتی میری بچی، ـــــ یہ وہ پڑوسی ہیں جن کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ یہ آستین کے سانپ ہیں، تو بھی مبالغہ نہ ہوگا - یہی ہیں جنہوں نے ہم پر مسلمانوں کو مسلط کیا ہے - ان کی اطاعت قبول کر کے ہندو قوم کی توہین کی ہے!"

دیول دیوی :" ایسے ہندو کون ہیں؟ ـــــ میں تو نہیں جانتی انہیں؟"

کرن رائے :" یہ جھالاواڑ، مارواڑ، انہل واڑہ، یہ سارے لوگ وہی تو ہیں، اور کون ہیں؟ ـــــ ان سب لوگوں نے دلی کی بادشاہی کے سامنے سر جھکا رکھا ہے - دلی کے مسلمان بادشاہ کو خراج دیتے ہیں - اس کے ایک اشارہ پر اپنے بھائی بندوں سے لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتے ہیں ـــــ کیا میں انہیں یونہی چھوڑ دوں گا ـــــ؟ ہرگز نہیں - ایسا سبق دوں گا کہ عمر بھر یاد کریں گے - یہی نہیں، ان کی سات پشتیں یاد رکھیں گی!"

دیول دیوی :۔ "یہ تو بڑا اچھا ہوگا پتا جی، ـــــــ لیکن ایک بات تو بتایئے!"

کرن رائے :۔ "وہ کون سی بات ہے بیٹی ـــــــ؟"

دیول دیوی :۔ "جب مسلمانوں کی سرکوبی کا انتظام آپ کر چکے، تو پھر اتنے پریشان کیوں ہیں؟ پھر تو خوش ہونا چاہئے آپ کو، ـــــــ کیا وجہ ہے اب بھی آپ کو دُکھی دیکھ رہی ہوں؟"

کرن رائے :۔ "بات یہ ہے بیٹی کہ ویسے تو میں بہت خوش ہوں، لیکن ایک بات سے ڈر لگتا ہے!"

دیول دیوی :۔ "وہ کون سی بات ہے پتا جی؟"

کرن رائے :۔ "یہ کہ تاتاری بڑے خود غرض، اجڈ اور احسان فراموش ہوتے ہیں!"

دیول دیوی :۔ "ہوا کریں۔۔ ان سے ہمیں کون سا ناتہ کرنا ہے۔ آئیں گے اور اپنا کام کر کے چلتے بنیں گے!"

کرن رائے :۔ "ہاں ـــــــ لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ آئیں اور نہ جائیں ـــــــ!"

دیول دیوی :۔ "پتا جی ایک بات اور بھی ہو سکتی ہے!"

کرن رائے :۔ "وہ بات بھی کہہ ڈال میری بچی!"

دیول دیوی :۔ "مسلمانوں کو کاٹ کر ہماری طرف پلٹ پڑیں، ـــــــ آخر احسان فراموش جو ٹھہرے ـــــــ پھر کیا ہوگا؟"

کرن رائے :۔ (اور زیادہ پریشان ہو کر) "ہاں تو نے میرے دل کی بات کہہ دی۔ یہی اندیشہ میرے دل میں بھی پیدا ہو رہا ہے۔ اور اگر ایسا ہوا تو واقعی لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ بھلا ان وحشیوں کو کون سمجھاتا اور مناتا پھرے گا۔ مسلمان لاکھ کچھ ہوں، ہزار بُرے ہوں، لیکن آدمی تو ہیں۔ مگر یہ کمبخت تو آدمی بھی نہیں، اچھے خاصے درندے ہیں!"

دیول دیوی :۔ (ڈر کر) "پتا جی انہیں منع کر دیجئے!"

کرن رائے :۔ "کاہے سے منع کر دوں؟"

دیول دیوی۔ "یہاں آنے سے ——— انہیں پیام بھیج دیجئے کہ یہاں نہ آئیں۔ جہاں ہیں وہیں رہیں، ہم درگزرے ان کی دوستی اور رفاقت سے ——— بھلا ایسے لوگوں پر کس طرح بھروسہ کیا جاسکتا ہے؟"

کرن رائے۔ "بالکل نہیں کیا جاسکتا، ——— لیکن انہیں اب منع بھی نہیں کیا جاسکتا، اگر منع کرا بھیجوں تو جانتی ہو انجام کیا ہوگا؟"

دیول دیوی۔ "نہیں جانتی پتاجی ——— آپ ہی بتائیے کیا ہوگا؟"

کرن رائے۔ "یہ اُلٹے پیٹ پڑیں گے اِدھر، دہلی بعد میں جائیں گے پہلے ہمارے مہمان بنیں گے آکر!"

دیول دیوی۔ "یہ تو بہت بُرا ہوگا پتاجی۔ پھر اب ——— ؟"

کرن رائے۔ "یہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں بیٹی ——— بات تو یہ ہے کہ غلطی ہوئی لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا ہے، واپس نہیں آسکتا، ——— بھگوان رحم کرے ہم سب پر!"

دیول دیوی۔ "خود آپ کون سے کم تھے کسی سے؟ انہیں بلانے کی بجائے خود ہی فوج لے کر دہلی پر چڑھ دوڑتے ——— کیا آپ مسلمانوں سے جیت نہیں سکتے پتاجی؟"

کرن رائے۔ "کیوں جیت نہیں سکتا، لیکن کہہ تو رہا ہوں غلطی ہوگئی، اور ایسی غلطی ہوئی، کہ اب اس کی اصلاح نہیں ہوسکتی کسی طرح؟"

دیول دیوی۔ "پتاجی، مجھے تو ڈر لگنے لگا، تاتاریوں کے نام سے!"

کرن رائے۔ "تو ایک بہادر باپ کی بیٹی ہے ——— اور بہادر لوگ کسی سے نہیں ڈرتے!"

دیول دیوی۔ "پتاجی! اگر مسلمانوں کو معلوم ہوگیا کہ آپ نے یہ حرکت کی تھی، تو وہ آپ سے بگڑ نہیں جائیں گے؟"

کرن رائے۔ "بگڑ جائیں ——— میری تلوار انہیں سدھارنا جانتی ہے!"

دیول دیوی :- "ہاں اس سے تو مجھے اطمینان ہے۔ لیکن تاتاریوں سے ضرور خوف معلوم ہو رہا ہے۔۔ ـــــــ پتاجی ان تاتاریوں کا تو کوئی دھرم نہیں؟"

کرن رائے :- "اچھا بیٹی! مجھ سے ایک وعدہ کرے جلدی سے، مجھے ابھی ضروری کام سے باہر جانا ہے ـــــــ!"

دیول دیوی :- "کاہے کا وعدہ لینا چاہتے ہیں آپ پتاجی؟"

کرن رائے :- "یہ کہ اب مجھ سے روٹھے گی نہیں۔ خفا نہیں ہوگی مجھ سے، پریشان نہیں رہا کرے گی۔ روئے گی نہیں، اُداس بھی نہیں رہے گی، خوب ہنسے گی، کھیلے گی، دلچسپیوں میں اپنا وقت صرف کرے گی، ـــــــ بول کرتی ہے نا وعدہ؟"

دیول دیوی :- (مسکرا کر) "ہاں کرتی ہوں، لیکن ایک وعدہ آپ کو بھی کرنا پڑے گا؟"

کرن رائے :- "کس قسم کا وعدہ لینا چاہتی ہے اپنے پتا سے، جلدی سے بتا!"

دیول دیوی :- "یہ کہ آپ بھی پریشان نہیں رہا کریں گے!"

کرن رائے :- "اچھا بھئی وعدہ کرتا ہوں، ـــــــ بس تو خوش ہو گئی اب یا نہیں؟"

دیول دیوی :- "اور کھانا یہیں رنواس میں ہمارے ساتھ کھایا کریں گے!"

کرن رائے :- "اچھا یہ بھی منظور، ـــــــ اب مجھے باہر جانے دے!"

سادگی ــــــ!

دیول دیوی کے دل کا بوجھ اتر گیا۔ راجہ کرن سانے نے اپنی محبت پدری کا ایسا منتر پھونکا، کہ اس کی ساری پریشانی اور افسردگی دُور ہو گئی۔ اب وہ پھر وہی دیول دیوی تھی جس کی جوت سے سارا رنواس جگمگایا کرتا تھا، جو بلبل کی طرح چہکا کرتی تھی، اور جس کی چہک سے محل کے اس چمنستان میں ایک نئی رونق، ایک نئی زندگی پیدا ہو جایا کرتی تھی۔ اب پھر وہی قہقہے تھے، وہی سکھیوں کا جمگھٹ، وہی سہیلیوں کا جھرمٹ، وہی باغ اور چمن کی سیریں۔ وہی سیر و شکار، افسردگی کے بادل گھر کر تو بڑے زور سے آئے تھے، لیکن مسرت کی چکاچوند کر دینے والی روشنی کے سامنے ٹھہر نہ سکے، پھٹ گئے!

راجکماری دیول دیوی نے ابھی جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تھا۔ جوانی کی سرحد میں ابھی داخل نہیں ہوئی تھی، لیکن اس کے حسن و جمال کی شہرت نے بہت سے طلبگار پیدا کر دیئے تھے۔ شمع پر پروانے تصدق ہوتے رہتے ہیں، اور وہ یہ بھی نہیں جانتی کون زندہ بچا، کون جل کر خاک ہو گیا؟ اسے یہ جاننے کی ضرورت بھی نہیں۔ وہ خود کسی کو بُلاتی نہیں۔ کسی سے جل مرنے کو کہتی نہیں۔ کوئی خود ہتھیلی پر جان رکھ کر آتا ہے، تو وہ منع بھی نہیں کر سکتی، روک بھی نہیں سکتی۔ یہی حال راجکماری دیول دیوی

کا تھا۔ اسے خود ابھی تک یہ احساس پیدا نہیں ہوا تھا کہ وہ جوانی کی منزل سے روز بروز قریب ہوتی جا رہی ہے۔ اسے یہ احساس بھی نہیں تھا کہ اس کے حسن نے بہت سے دلوں میں ہلچل پیدا کردی ہے جن کے دن بیقراری اور اشکباری میں کٹتے ہیں، اور راتیں اختر شماری اور فریاد و فغاں میں بسر ہوتی ہیں۔ وہ یہ بھی نہیں جانتی تھی عشق کسے کہتے ہیں۔ اور محبت کیا چیز ہوتی ہے؟ اور یہ راز تو اسے قطعی نہیں معلوم تھا کہ دل جب کسی کو چاہنے لگتا ہے، تو پھر اسے حاصل کرنے کی تمنا بھی کرنے لگتا ہے۔ ان سب باتوں سے وہ بے خبر تھی، انجان تھی۔ نہ کوئی ایسا تھا کہ اسے یہ گُر کی باتیں بتاتا، نہ خود اس کے دل میں کبھی اس قسم کے خیال نے خلش پیدا کی۔ وہ الھڑ تھی، اور اسی طرح ہر روز حسین سے حسین تر ہوتی چلی جا رہی تھی۔۔۔ ــــــ!

ادھر چند روز سے محل میں ایک راجکمار آیا ہوا تھا۔ اس کا نام گوبند تھا۔ یہ ایک پڑوسی ریاست کا راجکمار تھا۔ اس کے باپ اور راجہ کرن رائے میں بڑی دوستی تھی۔ کرن رائے اسے بہت مانتا تھا، اصرار کرکے بلاتا تھا، اور منت کرکر کے روکتا تھا۔ اور سچی بات یہ ہے کہ راجکمار تھا بھی بڑا طرحدار اور بانکا۔ بڑی بڑی آنکھیں، خوبصورت سا نازک دہانہ، کشادہ پیشانی، مردانہ وقار اور جلال کا پیکر، جب کبھی وہ محل میں آجاتا، ایک دھوم مچ جاتی، ایسا معلوم ہوتا جیسے کوئی تہوار آگیا۔ ہر شخص اس کی پرستش میں لگا رہتا تھا۔ خود راجہ کرن رائے کی یہ حالت تھی کہ وہ کام چھوڑ کر گھنٹوں اور پہروں اسے اپنے پاس بٹھاتا، اس کی باتیں سنتا، اس سے باتیں کرتا، مگر جی نہ بھرتا! البتہ ایک راجکماری دیول دیوی تھی جو اسے خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ ویسے تو بڑی ملنسار اور خلیق تھی۔ لیکن اگر آن کا سوال آجاتا، تو پھر اس سے بڑھ کر مغرور اور متکبر بھی کوئی نہ تھا۔ راجکمار گوبند پرشاد جتنا تھا۔ اس سے زیادہ اپنے آپ کو سمجھتا تھا، بس یہی بات راجکماری دیول دیوی کو ناپسند تھی"! ـــــــ اسی لئے نہ وہ اسے منہ لگاتی، نہ اس سے اخلاق و تپاک سے گفتگو کرتی!

اتفاق کی بات راجکماری اپنی سہیلیوں کے ساتھ محل کے پائیں باغ میں آنکھ مچولی کھیل رہی تھی۔ کھیلتے کھیلتے وہ ایک کنج کی طرف جا نکلی۔ یہاں اس نے دیکھا، دو آنکھیں اسے گھور رہی ہیں وہ متحیر ہوئی، کچھ ڈری، کچھ جھجکی لیکن ہمت کرکے آگے بڑھتی چلی گئی۔ وہاں پہنچ کر دیکھتی کیا ہے، راجکمار گوبند پرشاد چھپے ہوئے اس کے جمال جہاں آرا کا نظارہ کر رہے ہیں۔ یہ بات راجکماری کو پسند نہ آئی۔ اس نے تیوری چڑھا کر کہا۔

"آپ یہاں؟ —— آخر کیوں؟"

گوبند پرشاد۔ "کوئی خاص وجہ تو نہیں۔ محل میں جی نہ لگا، ٹہلتے ٹہلتے ادھر آگیا، یہاں آیا، تو آپ کو آنکھ مچولی کھیلتے دیکھا، یہ منظر کچھ ایسا پسند آیا کہ بس یہاں اطمینان سے بیٹھ کر اسے دیکھنے میں محو ہو گیا —— آپ کو میرا یہ فعل ناگوار گزرا؟"

ہوا کے خوشگوار جھونکوں نے راجکماری کے ریشمی بالوں کو منتشر کر دیا تھا، وہ اپنے خوبصورت اور ملائم بالوں کو سنبھالتی ہوئی بولی:۔

دیول دیوی۔ "ہاں —— بھلا مردوں کا لڑکیوں کے مجمع میں کیا کام؟"

گوبند پرشاد۔ "لیکن مجھے کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے!"

دیول دیوی۔ "کیا میں نہیں دیکھ رہی ہوں آپ کو؟ —— کیا میرا دیکھ لینا کافی نہیں ہے؟"

گوبند پرشاد۔ "ہاں جی کافی ہے، لیکن یہ کھیل ویل چھوڑو، آؤ کچھ باتیں کریں۔"

دیول دیوی۔ "آپ سے باتیں کروں —— ؟ یہاں؟ —— واہ کہیں ایسا ہو سکتا ہے بھلا؟"

گوبند پرشاد۔ "کیوں نہیں ہو سکتا؟ —— کیا حرج ہے اس میں؟"

دیول دیوی۔ "یہ تو میں نہیں جانتی کیا حرج ہے؟ لیکن جانتی ہوں ایسا کرنا نہیں چاہئے —— ماتا جی نے مجھے منع کیا ہے!"

گوبند پرشاد: "مجھ سے ملنے سے؟ —— مجھ سے باتیں کرنے سے؟"

دیول دیوی: "نہیں آپ کا نام تو نہیں لیا، کئی مہینہ ہوئے جب اُنہوں نے مجھ سے کہا تھا خبردار! بڑے بوڑھوں کے علاوہ کسی غیر مرد سے کبھی بات نہ کرنا!"

گوبند پرشاد: (ہنس کر) "سمجھ گیا، ماتاجی نے غیر مرد سے باتیں کرنے کو منع کیا ہے نا؟"

دیول دیوی: "ہاں —— !"

گوبند پرشاد: (قہقہہ لگا کر) "لیکن مَیں غیر کب ہوں؟"

دیول دیوی: "تو کیا اپنے ہیں؟"

گوبند پرشاد: "ہاں بھئی بالکل اپنا۔ دیکھتی نہیں ہو تمہارے پتاجی مجھے کتنا مانتے ہیں؟ اور ماتاجی کب کم مانتی ہیں؟ بھلا مَیں غیر ہوتا، تو اس طرح کا برتاؤ کیا جاتا مجھ سے —— ؟ (کھسک کر) آؤ یہاں بیٹھ جاؤ، ذرا دیر، بڑی ضروری باتیں کرنا ہیں!"

وہ گوبند کے دلائل کا مقابلہ نہ کر سکی۔ آ کر اس کے قریب بیٹھ گئی، گوبند پرشاد کا تنفس تیز ہو گیا۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا:۔

"راجکماری! تم نہیں جانتیں آج مَیں کتنا خوش ہوں۔ اگر مَیں راجہ ہوتا، تو تمام قیدیوں کو چھوڑ دیتا، اور خزانہ کا دروازہ کھول دیتا۔"

دیول دیوی: "ارے یہ کیوں؟ ایسی کون سی خوشی کی بات ہوئی ہے؟"

گوبند پرشاد: "اس سے بڑھ کر خوشی کی بات کیا ہو سکتی ہے کہ تم میرے پاس بیٹھی ہو" میرے پاس! کتنی حسرت تھی تم کبھی ملو، تو تمہیں پاس بٹھا کر دل کی باتیں کروں!"

دیول دیوی: "تو کرتے کیوں نہیں باتیں؟ —— بیٹھی تو ہوں!"

گوبند پرشاد: "ہے اجازت؟ —— عرض مدعا کروں؟"

دیول دیوی: "آخر وہ ایسی کونسی بات ہے جس کے لئے میری اجازت لی جا رہی ہے؟"

گوبند پرشاد: "ابھی میں نے کہا تھا، شاید تم نے توجہ سے سنا نہیں ——— دل کی بات!"

دیول دیوی: "کیا ہوا ہے آپ کے دل کو؟"

گوبند پرشاد: "بیقرار ہے ——— تمہیں اس کی بیقراری پر رحم نہیں آتا؟"

دیول دیوی: "یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ میں نہیں سمجھتی! نہیں!"

گوبند پرشاد: "ہاں تم نہیں سمجھتیں، تم نہیں جانتیں، سمجھ بھی نہیں سکتیں، جان بھی نہیں سکتیں!"

دیول دیوی: "کیوں آخر؟ ——— کیا آپ مجھے بیوقوف سمجھتے ہیں؟"

گوبند پرشاد: "نہیں راجکماری، تمہیں بیوقوف سمجھ کر تمہارا اپمان (توہین) نہیں کر سکتا۔ بات یہ ہے کہ

ابھی سن ہی کیا ہے جو بے باکیاں ہوں
تمہیں آئیں گی شوخیاں آتے آتے

دیول دیوی: "پھر آپ ایسی باتیں کرنے لگے، جن سے میری طبیعت اُلجھتی ہے ——— جو کچھ کہنا ہے کہئے، ورنہ میں جاتی ہوں سکھیاں میری راہ دیکھ رہی ہوں گی!"

گوبند پرشاد: "راجکماری! میں تم سے محبت کرتا ہوں! ——— بتاؤ کیا تم بھی محبت کرتی ہو مجھ سے؟"

دیول دیوی: "میں نہیں جانتی محبت کسے کہتے ہیں ——— کیا چیز ہوتی ہے محبت؟"

گوبند پرشاد: "آہ، ——— تم کتنی بھولی ہو، ———"

جملہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ دیول دیوی کی سکھیاں اسے تلاش کرتی ہوئی آئیں، یہاں ان دونوں کو باتیں کرتے دیکھ کر سب کی سب کھلکھلا کر ہنس پڑیں ——— اس ہنسی میں طنز تھا، جیسے اُنہوں نے کوئی چوری پکڑ لی ہو۔ راجکماری دیول دیوی گھبرا کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ گوبند پرشاد بھی سٹپٹا گیا۔ ٹھہر نہ سکا، فوراً

چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد ان سکھیوں نے پھر ہنسنا شروع کیا، اور اس وقت تک ہنستی رہیں جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو گیا۔ راجکماری دیول دیوی نے ذرا ترش رو ہو کر پوچھا :۔

"آخر کیا بات ہے، تم لوگ اتنا ہنس کیوں رہی ہو ——— ؟"

اس سوال کے جواب میں پھر نقرئی قہقہے گونجنے لگے۔ ان میں ایک سہیلی جو ذرا مُنہ چڑھی تھی اس نے مسکتے ہوئے کہا۔

"راجکماری! اطمینان رکھو، ہم کسی سے نہیں کہیں گے ——— یہ راز ہمیں تک رہے گا!"

اب تو دیول دیوی اور گھبرائی۔ اس نے ذرا پریشان ہو کر کہا :۔

"کیا نہیں کہو گی؟ ——— میں نے کوئی جرم کیا ہے ؟"

دوسری بولی ——— "ہاں کیا تو ہے جرم، لیکن اس عمر میں سب ہی اس طرح کے جرم کرتے ہیں !۔ ——— آج وہ، کل ہماری باری ہے !" یہ کہہ کر وہ پھر زور زور سے ہنسنے لگی۔

دیول دیوی۔ "اری پگلیو! آج کیا ہو گیا ہے تمہیں ؟ ——— آخر کیوں ہنسے جا رہی ہو؟"

وہ بولی ——— "ہنسنے اور خوش ہونے کی تو بات ہے ! ——— ہنسیں نہیں تو کیا روئیں ؟"

دیول دیوی۔ "کیا بات ہے آخر، کچھ ہمیں بھی تو بتاؤ !"

ایک اور سہیلی نے کہا :۔

"جان کی امان پاؤں تو عرض کروں میری سرکار ! ——— بات یہ ہے کہ واقعی راجکمار گوبند پرشاد بڑے خوبصورت ہیں، اس سے اچھی جوڑی ہو بھی نہیں سکتی کوئی، اور ——— بھگوان مبارک کریں !"

یہ سنتے ہی راجکماری دیول دیوی نے تڑسے ایک طمانچہ اپنی سہیلی کے مُنہ پر جڑ دیا، ——— اور آشفتہ مزاجی کے ساتھ کہنے لگی :۔

"واہ ری! ——— خبردار جو ایسی باتیں کبھی میرے سامنے کیں ——— وہ بیچارے تو اپنے دل کا دُکھڑا رو رہے تھے، اور محبّت کرنے کو کہہ رہے تھے، اور یہ چلی ہے جڑی بلانے ——— ابھی جا کر ماتا جی سے کہتی ہوں، اگر چوٹی نہ کاٹ ڈالی جائے تیری، تب کی بات!"

اس خفگی کے جواب میں وہ سہیلی تو ہٹ گئی تھی، ذرا سہم گئی، لیکن دوسری سکھیوں پر کوئی دہشت نہیں طاری ہوئی۔ وہ بدستور مسکراتی رہیں!

اب تو دیول دیوی کے بھی کان کھڑے ہوئے، وہ سوچنے لگی، ضرور کوئی خاص غلطی مجھ سے، یا راجکمار سے سرزد ہوئی ہے۔ ورنہ ان سکھیوں کے اس طرزِ عمل کا مطلب کیا ہے؟"

یہ سوچ کر وہ تیر کی طرح ماں کے پاس پہنچی۔ رانی کنولا دیوی اس وقت قدِ آدم آئینہ کے سامنے بیٹھی اپنے حُسن جہاں آرا کا نظارہ کر رہی تھی، اور ایک کنیز بڑے ادب لیکن بڑے انہماک سے اس کے کنگھی چوٹی کر رہی تھی۔ کنولا دیوی نے، دیول دیوی کو یوں حواس باختہ اور پریشان دیکھا تو گھبرا گئی۔ ہاتھ کے اشارے سے کنیز کو روکا، اور بیٹی سے پوچھا:۔

"کیا بات ہے؛ تُو اس وقت اتنی پریشان کیوں نظر آ رہی ہے؟"

دیول دیوی نے قدرے رُکتے رُکتے اور جھجکتے جھجکتے کہا:۔

"ماتا جی! محبت کسے کہتے ہیں؟"

یہ لفظ سُن کر کنولا دیوی کا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے سنجیدہ بن کر دریافت کیا۔

"محبت! ——— ؟ یہ لفظ تجھے کہاں سے معلوم ہُوا؟ کس سے سُنی تو نے یہ بات؟"

دیول دیوی۔ "وہ ہمارے ہاں راجکمار گوبند پرشاد ٹھہرے ہوئے ہیں نا! ———"

کنولا دیوی: "ہاں ہاں ٹھہرے ہوئے ہیں تو ——— کیا وہ کہہ رہے تھے؟"

دیول دیوی۔ (سادگی سے) "ہاں وہ کہہ رہے تھے۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ کیا تم بھی کرتی

ہو مجھ سے محبت ہ؟"

کنولا دیوی۔ (زیرِ لب تبسم کے ساتھ) "پھر تُو نے کیا جواب دیا؟"

دیول دیوی۔ "کچھ نہیں ——— پہلے بتا تو دیجئے محبت کسے کہتے ہیں؟ ——— اور ماتا جی آج مجھے رادھا پر بڑا غصہ آیا۔ میں نے اسے مار دیا!"

کنولا دیوی۔ "رادھا کو مار دیا تو نے؟ ——— آخر کیا کیا تھا اس بیچاری لڑکی نے؟"

دیول دیوی۔ "کہہ رہی تھی بڑی اچھی جوڑی رہے گی تم دونوں کی ——— بھلا ایسی باتیں سُن سکتا ہے کوئی؟"

جو کنیز کنولا دیوی کا سنگھار کر رہی تھی، اُس نے کہا:۔

"بیٹی! اس میں خفا ہونے کی کیا بات ہے؟ ہم تو بھگوان سے چاہتے ہیں کہ ایسا ہو جائے۔ بڑی خوشی ہوئی کہ یہ معلوم ہو گیا، راجکمار بھی تمہیں چاہتا ہے!"

کنولا دیوی نے مسکراتے ہوئے اپنی بیٹی کو چھاتی سے لگا لیا اور کہا:۔

"بیٹی! محبت، پریم کو کہتے ہیں، یہ بڑی اچھی چیز ہوتی ہے، جب گوبند اور تم ایک دوسرے سے پریم کرنے لگو گے، تو واقعی تم دونوں ایک ہو جاؤ گے۔ کوئی لڑکی ماں باپ کے گھر سدا رہتی نہیں ایک نہ ایک دن اس کا بیاہ ہوتا ہے، اور وہ سسرال جاتی ہے، میاں بیوی میں پریم ہو تو یہ نئی زندگی اچھی طرح نبھ جاتی ہے، اور پریم نہ ہو تو پھر جہنم سے بدتر ہو جاتی ہے ——— گوبند بڑا اچھا لڑکا ہے، جب وہ تم سے مِلا کرے تو اس سے اچھی اچھی باتیں کیا کر، اور اس کی باتوں کا اخلاق اور شگفتگی سے جواب دیا کر!"

اتنے میں گال سہلاتی ہوئی رادھا آگئی ——— اسے دیکھ کر کنولا دیوی اور دیول دیوی ساتھ ساتھ مسکرا دیں!

علاء الدین اور ——— !؟

ہندو مسلم تاریخ میں دو ان پڑھ اور ناخواندہ بادشاہ ہوئے ہیں۔ پہلا علاء الدین خلجی، اور دوسرا اس کے تقریباً تین سو سال بعد جلال الدین اکبر۔ یہ دونوں اَن پڑھ اور ناخواندہ تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ بلا کے دلیر اور بہادر، معاملہ فہم اور سیاست داں، دُور اندیش اور مدبّر بھی، اور سب سے بڑھ کر عجیب اتفاق یہ کہ دونوں کی طبیعت اور مزاج میں بھی بڑی حد تک یکسانیت تھی۔ اکبر بھی علماء سے بیزار رہتا تھا۔ علاء الدین خلجی بھی انہیں "ریاکار اور مکّار" سمجھتا تھا۔ اس لئے نہ صرف یہ کہ انہیں خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ بلکہ انہیں حقیر، ناکارہ سمجھتا تھا۔ ان کے فتووں کی پروا نہیں کرتا تھا۔ ان کی مذہبی اہمیت کا قائل نہیں تھا۔ ان کے تقدس اور جامۂ پارسائی کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ اکبر کی طرح خلجی بھی ایک نئے دین کا ڈول ڈالنے کی فکر میں تھا۔ اگر کہیں اسے بھی ابوالفضل، فیضی اور ملّا مبارک جیسے "جی نیس" لوگ مل جاتے تو بہت ممکن تھا اس کی گمراہی پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتی۔ اور وہ اکبر سے تین سو برس پہلے ایک نئے دین کا بانی بن چکا ہوتا۔ اس نے ایک نئے دین کی داغ بیل ڈال دی تھی۔ اور اپنے چار یار[1] بھی منتخب کر لئے تھے۔ لیکن جلد ہی اُکتا کر اس مشغلہ سے دستبردار ہو گیا!

[1] مؤرخ برنی کا بیان ہے کہ وہ اپنے چچا کی انعام و تفہیم سے اس ارادے سے باز آ گیا، اور فتوحات کی طرف متوجہ ہو گیا۔

طبیعت کے اعتبار سے علاء الدین خلجی بہت سخت تھا۔ ایک طرف وہ اولعزم بادشاہ تھا۔ مانا ہُوا سپہ سالار تھا، نہایت سخت گیر آقا تھا، کٹر محتسب بھی تھا۔ دوسری طرف وہ بہترین مدبّر اور منتظم بھی تھا۔ اس نے تقریباً بیس سال تک دبدبا و طنطنہ کے ساتھ حکومت کی اور اس کے بنائے ہوئے نظام میں اس طویل مدّت کے اندر ذرا بھی جھول نہیں پیدا ہُوا۔

شروع میں خلجی کی یہ حالت تھی کہ وہ رحم و کرم سے یکسر ناآشنا تھا۔ چاہتا تھا جو بات مُنہ سے نکل جائے، وہ پوری ہو، ذرا بھی تأمّل کی صورت میں اُن کی شمشیرِ آبدار میان سے باہر نکل پڑتی تھی۔

چونکہ وہ علماء کا استخفاف کرتا تھا، اور تھا مطلق العنان بادشاہ، اس لئے اس پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ وہ من کا موجی، اور مرضی کا بادشاہ تھا، جو چاہتا تھا کرتا تھا۔ جو چاہتا تھا کہتا تھا۔ نہ کسی میں یہ ہمّت تھی کہ اسے ٹوکے، نہ یہ حوصلہ تھا کہ اس کی بات کی تردید کرے۔ جب وہ سزا دینے پر آتا تھا تو سراپا قہر و جلال بن جاتا تھا، نہ صرف یہ کہ کسی قسم کی رعایت نہیں کرتا تھا بلکہ نہایت ہولناک اور لرزہ خیز سزائیں دیتا تھا۔ ذمّیوں کے ساتھ بھی اس کا رویّہ اپنے پیش رو کے مقابلے میں سخت تھا۔ جب مسلمان اس کی بیداد کے خلاف لب کشائی نہیں کر پاتے تھے، تو غیر مسلم کیا کہتے۔ وہ بھی خاموشی سے یہ کیفیت دیکھتے تھے، اور صبر و شکر کر کے رہ جاتے تھے۔ شہر میں بڑے بڑے علماء اور مشائخ موجود تھے، لیکن خلجی کو ٹوکنے کا کسی میں یارا نہیں تھا۔

لیکن بیانہ کے ایک عالم مولانا مغیث الدین سے یہ کیفیت نہ دیکھی گئی۔ وہ کفن سر سے لپیٹ کر میدان میں اُتر آئے۔ انہوں نے اپنی تقریروں میں، جمعہ کے خطبوں میں، مجالس وعظ میں خلجی کے اس طرزِ عمل کے خلاف بے باکی اور بے خوفی سے نکتہ چینی شروع کر دی۔ جو خدا سے ڈرتا ہے، پھر وہ کسی سے نہیں ڈرتا، کسی بڑے سے بڑے بادشاہ اور فرمانروا کو خاطر میں نہیں لاتا۔ نہ پھانسی کے پھندے سے خائف ہوتا ہے، نہ سنگین اور تلوار کا نام اس پر دہشت طاری کرتا ہے۔ مولانا مغیث الدین اسی قسم

کے برگزیدہ لوگوں میں تھے۔ وہ صرف خدا سے ڈرتے تھے۔ اس لئے علاءالدین خلجی جیسے باجبروت اور شمشیر برہنہ مطلق العنان بادشاہ کو بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ وہ بڑی آزادی سے نکتہ چینی کرتے تھے اور اس کی پروا نہیں کرتے تھے کہ اس اعلانِ حق کا انجام کیا ہوگا؟ انہوں نے طے کر لیا تھا کہ اپنی جان دے دیں گے، لیکن اعلانِ حق سے باز نہیں آئیں گے!

شدہ شدہ یہ خبر علاءالدین خلجی کے کانوں تک پہنچی۔ وہ بھلا یہ بات کب برداشت کر سکتا تھا کہ اس کے حدودِ مملکت میں کوئی شخص اس پر نکتہ چینی کرے۔ اس کے افعال و اعمال پر تنبیہ کرے۔ اس کے فیصلہ کو غلط ٹھہرائے۔ اور اس کی قائم کی ہوئی رائے کی تغلیط کرے۔ یہ سُن کر وہ آگ بھبوکا ہو گیا۔ اس نے کوتوالِ شہر عین الملک کو بلوایا۔ عین الملک شہر کا بڑا کامیاب کوتوال تھا۔ وہ خلجی کا شاگرد تھا۔ بالکل اپنے استاد کے نقشِ قدم پر چل رہا تھا۔ مجرم اس کا نام سُن کر دہل جاتے تھے۔ بدمعاش اور غنڈے اس کے حدودِ اختیار سے باہر بھاگ گئے تھے۔ وہ نظم اور انتظام کے معاملہ میں بڑا سخت تھا۔ جو لوگ کسی جرم میں ماخوذ ہوتے تھے انہیں عبرت انگیز سزائیں دیتا تھا۔ سارے شہر پر اس نے اپنی دھاک بٹھا رکھی تھی۔ ہر شخص جانتا اور مانتا تھا کہ عین الملک کے دورِ اقتدار میں کسی قسم کی دھاندلی نہیں چل سکتی۔ لیکن اس کٹر منتقلہ کا آدمی ہونے کے باوجود مولانا مغیث الدین پر ہاتھ ڈالنے کی اسے بھی ہمت نہ ہوئی۔ اگرچہ دوسرے ذرائع سے اس نے پوری کوشش کی کہ مولانا اپنا رویہ بدل دیں۔ آج جب خلجی نے اسے طلب کیا تو وہ سارے کام چھوڑ کر ہانپتا کانپتا اس کے حضور میں پہنچا اور مؤدب کھڑا ہو گیا۔ خلجی کا مزاج اس وقت برہم تھا۔ ہمیشہ وہ عین الملک سے اخلاق و تپاک کا برتاؤ کرتا تھا۔ مسکرا مسکرا کر باتیں کرتا تھا۔ اکثر اپنے حضور میں بیٹھنے کی اجازت دے دیتا تھا۔ لیکن آج اس کی ساری شگفتگی کافور ہو چکی تھی۔ نہ تبسم تھا، نہ ملاطفت۔ تیوریاں چڑھی ہوئی تھیں۔ آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ یہ کیفیت دیکھ کر بےچارہ عین الملک سہم گیا۔ اس کی یہ ہمت بھی نہ پڑی کہ پوچھے

بارگاہ ہمایونی میں کیوں اسے طلب کیا گیا ہے ؟

علاءالدین خلجی نے بڑی ترشی اور تلخی کے ساتھ پوچھا۔

"عین الملک! شہر کے بارے میں تم سے جو بات پوچھی جائے وہ تمہیں معلوم ہونی چاہئے!"

عین الملک:- "غلام حتی الامکان، شہر کی ہر بات سے اپنے آپ کو باخبر رکھنے کی کوشش کرتا ہے جہاں پناہ!"

علاءالدین خلجی:- "ہوں ــــــــ یہ مولانا مغیث الدین کون بزرگ ہیں ؟"

عین الملک:- "بیانہ کے رہنے والے ہیں، ایک عرصہ سے دلی میں مقیم ہیں۔"

علاءالدین:- "کیا کرتے ہیں ــــــــ مشغلہ کیا ہے ؟"

عین الملک:- "وعظ و پند ــــــــ تذکیر و نصیحت!"

علاءالدین:- "کس قسم کے آدمی ہیں ؟"

عین الملک:- "یہ تو مجھے نہیں معلوم ــــــ اس لئے کہ کبھی ملنے کا اتفاق نہیں ہوا!"

علاءالدین:- "شاید اسی لئے تمہیں یہ بات بھی نہیں معلوم ہوگی، کہ مولانا مجلس وعظ میں جس گنہگار کے جرائم پر زیادہ توجہ دیتے ہیں، وہ ہندوستان کا بادشاہ خلجی ہے!"

عین الملک:- "جہاں پناہ! ــــــــ مجھے معلوم ہے وہ سلطان عالم و عالمیان پر نکتہ چینی کرتے رہتے ہیں!"

علاءالدین:- (برہم ہو کر) "پھر بھی ان کی گردن سلامت ہے! پھر بھی ان کی زبان قطع ہونے سے محفوظ ہے؟ پھر بھی وہ آزادی کے ساتھ چلتے پھرتے ہیں؟ ــــــــ کیوں عین الملک یہی ہے تمہارا انتظام؟ یہی ہے تمہاری فرض شناسی ــــــــ ؟"

عین الملک:- "وہ حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیا کے حاضر باشوں میں ہیں!"

علاء الدین۔ "تو ــــــــ؟ اس سے کیا ہوتا ہے؟ کیا کہنا چاہتے ہو تم؟"

عین الملک۔ "اس لئے غلام ان پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہیں کر سکا کہ مبادا سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء کو یہ بات گراں گزرے!"

علاء الدین۔ "اور اگر انہیں گراں گزرے تو کیا ہوگا؟"

عین الملک۔ "تو سارا شہر زیر و زبر ہو جائے گا۔ مخلوقِ خدا میں اضطراب پیدا ہو جائے گا۔ شہر میں غدر کی سی کیفیت رونما ہو جائے گی۔ ــــــــ آقائے ولی نعمت! وہ اجسام پر نہیں قلوب پر حکومت کرتے ہیں!"

علاء الدین۔ "ایک میان میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں۔ اجسام اور قلوب الگ الگ نہیں ہیں۔ جو اجسام پر حکومت کرتا ہے۔ قلوب پر بھی اس کی فرمانروائی رہے گی!"

عین الملک۔ "سلطان والا شان جو چاہیں وہ کر سکتے ہیں۔ لیکن غلام کا یہ فرض ہے کہ وہ اونچ نیچ سمجھا دے!"

علاء الدین۔ "میں نہ علماء کا قائل ہوں نہ صوفیاء کا۔!"

عین الملک۔ "اور جہاں پناہ، یہی کیفیت علماء اور صوفیاء کی بھی ہے۔ ــــــــ علماء کی کم، اور صوفیاء کی زیادہ، ــــــــ!"

علاء الدین۔ "کس کیفیت کی طرف اشارہ کر رہے ہو تم ــــــــ؟"

عین الملک۔ "یہ کہ وہ بھی نہ کسی شہریار کو خاطر میں لاتے ہیں نہ بادشاہ جم جاہ کو!"

علاء الدین۔ "بادشاہ ان کی امداد کے بغیر زندہ رہ سکتا ہے۔ کیا وہ بھی بادشاہ کی امداد سے بے نیاز ہو کر رہ سکتے ہیں؟"

عین الملک۔ "جس عالم اور جس صوفی کا ذکر اس وقت ہو رہا ہے، کم از کم ان کی تو یہی کیفیت ہے!

علاءالدین: "ہمارے خزانے سے انہیں کچھ نہیں ملتا ـــــــ ؟"

عین الملک: "نہیں جہاں پناہ کچھ نہیں ملتا!"

علاءالدین: "یہ تم نے اچھا نہیں کیا عین الملک! تمہیں چاہئے تھا کہ انہیں کچھ دیتے رہتے۔ اب مولانا کی مخالفت کا راز سمجھ میں آ گیا، ہمارے خزانے میں کچھ کمی نہیں آ جائے گی، اگر انہیں بھی کچھ ملتا رہے ـــــــ!"

عین الملک: "غلام نے کوشش کی تھی ـــــــ!"

علاءالدین: "مگر ـــــــ؟ انکار کر دیا اُنہوں نے؟"

عین الملک: "صاف انکار ـــــــ بڑی سے بڑی رقم، بڑی سے بڑی جاگیر، بڑے سے بڑا تحفہ پیش کرنے میں مجھے کچھ تامل نہ تھا ـــــــ لیکن کسی کو کوئی چیز زبردستی تو نہیں دی جا سکتی ـــــــ؟"

علاءالدین: "یہ بات ہے؟ ـــــــ!"

عین الملک: "جہاں پناہ! ـــــــ یہی بات ہے!"

علاءالدین: "ہم مولانا مغیث الدین سے ملنا چاہتے ہیں! ـــــــ کیا تم انہیں لا سکتے ہو؟"

عین الملک: "کوشش کروں گا، سلطان ذی جاہ!"

مولانا مغیث الدّین!

عَاینُ الْمُلْک دوسرے روز مولانا مغیث الدین کی خدمت میں حاضر ہُوا، وہ مسندِ درس پر بیٹھے چند طلبہ کو حدیث و تفسیر کا درس دے رہے تھے۔ عین الملک، ایک کونے میں مؤدب ہو کر بیٹھ گیا۔ جیسے وہ بھی کوئی طالب علم ہو۔ مولانا آج جس حدیث پر حقائق و معارف کے دریا بہا رہے تھے، اتفاق سے وہ عین الملک کی آمد سے خاص تعلق رکھتی تھی۔ حدیث کی عبارت تھی:۔

افضل الجهاد كلمة الحقّ عند سلطان جابر۔ (یعنی جابر فرمانروا کے سامنے حق بات کہنا سب سے اچھا جہاد ہے!)

اس حدیث کے نکات پر مولانا نے ایسی شُستہ اور رواں تقریر کی کہ جو لفظ اُن کے مُنہ سے نکلتا تھا، وہ ٹھیک دِل پر جا کر اثر انداز ہوتا تھا۔ طلبہ کے تأثر کا جو عالم تھا، وہ تو تھا ہی۔ لیکن خود عین الملک کی اثر پذیری کی یہ کیفیت تھی کہ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی جاری تھی۔ دنیا کی بے ثباتی، اغراضِ دُنیا کی بے مائگی، آخرت کی دائمی زندگی اور اس کے برکات و خصائل پر ایسی منجھی ہوئی تقریر عین الملک نے کاہے کو کبھی سُنی ہوگی۔ آج سُنی تو آنکھیں کُھل گئیں۔ دُنیا سے جی سیر ہوگیا، دولت و ثروت کی وقعت ختم ہوگئی، حق و صداقت اور راستی کی منزلت قائم ہوگئی۔

درس ختم ہو جانے کے بعد مولانا عین الملک سے مخاطب ہوئے:۔

"معاف کیجئے گا۔ میں آپ کو پہچان نہ سکا ——— !"

عین الملک: مجھے اپنا تعارف کراتے ہوئے شرم آتی ہے۔ یوں سمجھ لیجئے ایک سگِ دُنیا حاضر ہوا ہے!

مولانا مغیث الدین: "نہیں ایسا نہ کہیئے، ——— انسان اشرف المخلوقات ہے۔ نہ وہ جمادات کے مانند بے جان، نباتات کی طرح بے بس نہیں ہے۔ پتھر اپنی جگہ سے جنبش نہیں کر سکتا۔ درخت اپنے اوپر قادر نہیں، جانور اتنی عقل نہیں رکھتا کہ بھلے اور بُرے میں تمیز کر سکے لیکن انسان نہ پتھر ہے نہ درخت، نہ چرند نہ جانور، اسے خدا نے عقل دی ہے، ارادہ دیا ہے۔ نیک و بد میں تمیز کرنے کی صلاحیت دی ہے، ادراک کی قوت عطا فرمائی ہے۔ اس دُنیا میں جو کچھ ہے وہ اس کے لئے ہے۔ سورج، سمندر، دریا، صحرا، جنگل، وحوش و بہائم سب اس کے غلام ہیں، اور وہ ان میں سے کسی کا غلام نہیں۔ وہ ان سب کا آقا ہے، وہ ان پر حکمرانی کرتا ہے ——— البتہ اس کے گلے میں اگر غلامی کا حلقہ ہے، تو خدا کا ——— وہ خدا کا غلام ہے، اس کی مرضی کا تابع اور پابند ہے۔ خوش نصیب ہے وہ جو رضائے الٰہی کے لئے اپنے تئیں وقف کر دے۔ اور بدنصیب ہے وہ جو خدا کا بندہ ہو کر بھی اس سے بغاوت کرے، اس سے روگرداں ہو۔ اس کی نافرمانی کرے، ——— لیکن میں تو تقریر کرنے لگا۔ ہاں تو آپ کس لئے تشریف لائے ہیں ؟"

عین الملک: نہیں مولانا! اپنی تقریر جاری رکھئے، مجھے لطف آ رہا ہے، لذت مل رہی ہے۔ بہت کچھ پا رہا ہوں میں ——— !"

مولانا مغیث الدین: "اس ہیچمدان کے خیالات و کلمات سے اگر آپ کچھ دلچسپی رکھتے ہیں، تو شوق سے جب چاہیں تشریف لائیں مجلس درس میں، مجلس وعظ میں، خطبۂ جمعہ میں۔

اسی سامنے والی مسجد میں جمعہ پڑھاتا ہوں!"

عین الملک :- "بہت خوب۔ انشاءاللہ حاضر ہوا کروں گا ـــــــ!"

مولانا مغیث الدین :- "آپ نے یہ نہیں بتایا کہ اس وقت کس مقصد سے تشریف لائے تھے؛ میرے لائق اگر کوئی خدمت ہو تو اُس کے لئے ہمہ تن تیار اور مستعد ہوں!"

عین الملک :- "بندہ نوازی ہے حضورِ والا کی ـــــــ غلام کا نام عین الملک ہے۔ اس شہر کا کوتوال ہے، ـــــــ!"

مولانا مغیث الدین :- (مسکرا کر) "اچھا اچھا۔ مَیں سمجھ گیا، شاید آپ مجھے گرفتار کرنے آئے ہیں مَیں خدا سے اپنے لئے استقامت کی دعا کرتا ہوں ـــــــ بسم اللہ، چلئے!"

عین الملک :- "میری یہ جراُت تو نہیں کہ آپ کو گرفتار کرنے حاضر ہوں۔ ایسی نوکری کو ٹھوکر مار دینا زندگی کی سب سے بڑی سعادت سمجھتا ہوں ـــــــ بات یہ ہے کہ بادشاہ سلامت نے آپ کو یاد فرمایا ہے۔ وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں!"

مولانا مغیث الدین :- "خلجی مجھ سے ملنا چاہتا ہے ـــــــ؟"

عین الملک :- "جی، ـــــــ آپ سے ملنے کے مشتاق ہیں بادشاہ سلامت!"

مولانا مغیث الدین :- "علماء کا یہ دستور نہیں کہ وہ بادشاہوں کے دربار کا طواف کریں، ان کی خدمت میں حاضری دیں، ان کے در پر سوالی بن کر پہنچیں، ـــــــ!"

عین الملک :- "مَیں جانتا ہوں، مجھے معلوم ہے، ـــــــ لیکن آپ خود کب جا رہے ہیں، آپ کو تو خود بادشاہ نے یاد کیا ہے!"

مولانا مغیث الدین :- "بادشاہ کے یاد کرنے کی صورت میں بھی علماء اپنا اصول نہیں توڑتے!"

عین الملک :- "تو مَیں بادشاہ سلامت سے عرض کر دوں کہ آپ نہیں تشریف لائیں گے؟"

مولانا مغیث الدین: "جی تو یہی چاہتا تھا کہ تم خلجی سے یہی کہہ دیتے، اور ہم نہ جاتے لیکن ——— نہیں چلو ہم چلیں گے!"

عین الملک: "یا حضرت! یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔ انکار کرتے کرتے آپ راضی کیسے ہو گئے؟"

مولانا مغیث الدین: "ہمیں اپنے حضرت (سلطان المشائخ) کی ایک بات یاد آ گئی۔ کل ہی شب کا واقعہ ہے ہم اپنے دوسرے اخوانِ طریقت کے ساتھ حضرت سلطان المشائخ کی خدمت میں حاضر تھے، انہوں نے اس بندۂ ناچیز کی طرف دیکھا اور تبسم کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ——— حق کا اعلان مسجد اور مدرسہ ہی میں نہیں ہونا چاہئے، دربارِ سلطانی میں بھی ہونا چاہئے۔ حضرت یہ فرما کر خاموش ہو گئے۔ میں بھی چپ ہو رہا۔ اب اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت نے مکاشفہ سے معلوم کر لیا تھا کہ دربارِ سلطانی میں اظہارِ حق کا وقت آ گیا ہے ——— آپ اگر اجازت دیں تو میں دو منٹ کے لئے گھر میں ہو لوں، پھر ابھی آپ کے ہمراہ چلتا ہوں!"

عین الملک: "خادم کو شرمندہ نہ کیجئے۔ آپ جتنی دیر کے لئے چاہیں تشریف لے جا سکتے ہیں!"

مولانا مغیث الدین، عین الملک سے اجازت لے کر گھر کے اندر تشریف لے گئے، اور چند ہی منٹ میں واپس تشریف لے آئے۔ بڑی خندہ جبینی کے ساتھ عین الملک سے کہا:۔

"چلئے، میں آ گیا، ——— !"

مولانا مغیث الدین عین الملک کے ساتھ خلجی کے دربار کی طرف بڑھ رہے تھے۔ لیکن نہ ان کے چہرے پر ہراس تھا، نہ دہشت۔ اطمینان کی کیفیت چھائی ہوئی تھی۔ ہونٹوں پر تبسم موجود تھا!

راستہ میں عین الملک نے پوچھا:۔

"مجھے یہ سوچ کر ذہنی اذیت ہو رہی ہے۔ کہیں میری زحمتِ انتظار کے باعث آپ اپنے کام

ادھورے چھوڑ کر تو جلدی سے نہیں تشریف لے آئے ہ ——— اگر یہ بات ہو، تو اب بھی میں واپس چلنے کو تیار رہوں!"

مولانا مغیث الدین: "آپ کی اس عنایت کا شکریہ، ——— میں نے اپنا کام کر لیا!"

عین الملک: "وہ کون سا ایسا کام تھا، جو اس قدر جلد انجام پا گیا؟"

مولانا مغیث الدین: "بہت مختصر ——— کچھ امانتیں لوگوں کی رکھی تھیں، وہ بیوی کو دے دیں، اور سمجھا دیا۔ پھر اسے وصیت کی اور چلا آیا۔"

عین الملک: (چونک کر) "وصیت؟ ——— یا حضرت یہ کیا؟ وصیت کیسی؟"

مولانا مغیث الدین: "یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہاں سے واپسی نہ ہو؟"

عین الملک: (اور زیادہ متحیر ہو کر) "یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ واپسی نہ ہو؟"

مولانا مغیث الدین: "خلجی کو اپنی حکومت و طاقت پر ناز ہے۔ وہ ضرور یہ چاہے گا کہ میں وہ کہوں جو اس کا اشارۂ چشم ہو اور میں یہ کر نہیں سکتا۔ بادشاہ بالعموم نازک دماغ ہوتے ہیں۔ مخالفت کی تاب نہیں لاتے، اور خلجی تو خاص طور پر کوئی ایسی بات نہیں سُن سکتا جو اس کی مرضی کے خلاف ہو۔"

عین الملک: "تو کیا حضرت کا خیال ہے کہ شہنشاہ قتل کا حکم صادر کر دیں گے؟"

مولانا مغیث الدین: "ہاں ——— یہ ناممکن تو نہیں؟ ——— اگر میرا خیال غلط ہے، تو واپس چلا آؤں گا۔ لیکن اگر صحیح ہے تو پھر بغیر وصیت کے تو اس دنیا سے رخصت نہیں ہوں گا؟ میرے ذمہ کسی کا حق تو باقی نہیں رہ جائے گا؟"

عین الملک مولانا کی ان باتوں سے بے حد متأثر ہوا۔ اس نے بڑے ادب اور تعجب سے دریافت کیا "آپ مرنے کے لیے بالکل تیار ہیں؟ ——— موت کا ذرا بھی ہراس نہیں آپ کے دل میں؟"

مولانا مغیث الدین: "اگر ہراس کے بعد موت سے کوئی بچ سکتا تو کچھ معنی بھی تھے لیکن جب وقت

اتنی ہی یقینی ہے، جتنا اس وقت دن کا ہونا تو پھر اس سے فائدہ؟ ——— آپ نے ایک بات اور بھی پوچھی ہے، کیا میں مرنے کے لئے تیار ہوں؟"

عین الملک :"جی ہاں! یہ میں نے پوچھا تھا ———"

مولانا مغیث الدین :"اب یہی سوال میں آپ سے کرتا ہوں۔ بتائیے کیا آپ مرنے کے لئے تیار ہیں؟"

عین الملک سٹپٹا گیا۔ اس نے اپنے حواس مجتمع کر کے کہا۔

"جی نہیں، ——— قطعاً نہیں!"

مولانا مغیث الدین :"لیکن آپ کے ارادہ کا موت پر کچھ اثر پڑ سکتا ہے؟"

عین الملک :"یا حضرت! اس سوال کا مطلب میں نہیں سمجھ سکا!"

مولانا مغیث الدین :"آپ نہیں مرنا چاہتے ہیں نا؟ ——— یہی تو کہا تھا ابھی آپ نے؟"

عین الملک :"جی ——— میں نے یہی عرض کیا تھا، واقعی میں مرنا نہیں چاہتا ابھی؟"

مولانا مغیث الدین :"لیکن اگر موت آ جائے تو آپ کیا کریں گے؟ ——— کیا مرنے سے انکار کر دیں گے؟"

عین الملک :"یہ کیسے ہو سکتا ہے، انکار سے کہیں موت ٹل سکتی ہے؟ موت آ جائے تو مرنا ہی پڑے گا!"

مولانا مغیث الدین :"اور موت کے آنے کا وقت کیا ہے؟"

عین الملک :"کوئی نہیں ——— وہ ہر وقت آ سکتی ہے۔ ہر جگہ آ سکتی ہے! ہر کسی کو آ سکتی ہے!"

مولانا مغیث الدین :"آپ نے خود ہی اپنے سوال کا جواب دے دیا ——— جب یہ حقیقت ہے کہ موت سے فرار نہیں، تو زیادہ باعزت طریقہ یہی ہے کہ آدمی اس کے لئے ہر وقت

تیار رہے۔ اس حل کچھ تھوڑا سا ثواب بھی ہے ۔ــــــــــ !"

عین الملک مولانا کا قائل تو حلقۂ درس ہی میں ہو چکا تھا، اس گفتگو نے اُور زیادہ قائل کر دیا۔
اب قصرِ شاہی آ چکا تھا، ذرا سے انتظار کے بعد دونوں کی ایوانِ شاہی میں طلبی ہوئی۔ علاء الدین
پیکرِ جلال و جبروت بنا تختِ شاہی پر بیٹھا تھا۔ اس نے نخوت اور پندار کے ملے جلے جذبات کے
ساتھ مولانا کی طرف دیکھا، لیکن مولانا نے پرواہ نہ کی۔ معمولی طرح سے السلام علیکم کا نعرہ بلند کیا، اور
اپنی جگہ پر کھڑے ہو گئے۔

علاء الدین :- "آپ ہیں مولانا مغیث الدین ؟"

مولانا مغیث الدین :- "خاکسار کا نام یہی ہے ۔ــــــــــ ! مجھے مغیث الدین کہتے ہیں۔"

علاء الدین :- "میں آپ سے چند مسئلے دریافت کرنا چاہتا ہوں ؟"

مولانا مغیث الدین :- "اگر مقصد میری گردن مارنا ہے تو سامنے کھڑا ہوں۔ جلاد کو حکم دیجئے، وہ
آپ کی خوشی پوری کر دے گا۔ اور اگر واقعی کچھ نہیں معلوم ہے اور اسے معلوم کرنے کا شوق ہے تو پوچھئے۔"

علاء الدین :- "نہیں میں واقعی معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن قبل اس کے کہ مسئلے دریافت کروں
ایک اَور بات پوچھنا چاہتا ہوں !"

مولانا مغیث الدین :- "ضرور پوچھئے، انشاء اللہ جواب شافی دینے کی کوشش کروں گا !"

علاء الدین :- "میں نے سنا ہے آپ اپنے مجالس وعظ اور خطبات جمعہ میں مجھ پر نکتہ چینیاں کرتے ہیں۔"

مولانا مغیث الدین :- "آپ نے صحیح سنا ہے ــــــــــ ! واقعی میں آپ پر نکتہ چینی کرتا رہتا ہوں !"

علاء الدین :- "کیا بادشاہ پر نکتہ چینی کرنا جائز ہے ؟"

مولانا مغیث الدین :- "جائز ! ــــــــــ ثواب ہے ! بادشاہ سلامت !"

علاء الدین :- "اچھا یہ بتایئے، میں ذمیوں (غیر مسلموں) کے ساتھ رعایت اور نرمی کا برتاؤ کرتا ہوں"

کیا یہ شرعاً جائز ہے ـــــــ ؟"

مولانا مغیث الدین: "جائز ہی نہیں مستحسن ہے،! ـــــــ قابلِ تعریف، باعثِ اجرِ آخرت!"

علاء الدین: "میں رشوت خوروں کے ساتھ بہت سختی سے پیش آتا ہوں، اور انہیں بغیر کسی رورعایت کے سزا دیتا ہوں، ـــــــ شریعت کا فتویٰ کیا ہے اس باب میں؟"

مولانا مغیث الدین: "شریعت آپ کے ساتھ ہے۔ وہ لوگ اسی کے مستحق ہیں!"

علاء الدین: "چچا مرحوم کی بادشاہت کے وقت میں نے دیوگری پر تاخت کی تھی۔ اور مالِ غنیمت حاصل کیا تھا، وہ اب تک میرے پاس ہے۔ اس کا مصرف کیا ہے؟"

مولانا مغیث الدین: "آپ نے اب تک اسے روکے رکھا، غلطی کی۔ وہ مجاہدین کا ہے، اور انہی میں برابر برابر تقسیم ہونا چاہئے ـــــــ وہ آپ کی ملکیت نہیں، آپ اس کے مالک نہیں!"

یہ سن کر خلجی کے ماتھے پر شکن پڑ گئی لیکن اس نے ضبط سے کام لیا۔ پھر پوچھا:-

"اور یہ مالِ غنیمت جو میں نے اپنی بادشاہی کے زمانہ میں حاصل کیا ہے، اس میں میرا، اور میری بیوی بچوں کا کتنا حق ہے؟"

مولانا مغیث الدین: "میں دیکھ رہا ہوں آپ کے تیور بگڑے ہوئے ہیں لیکن شریعت کے معاملہ میں بلا رورعایت سچ سچ کہنے پر مجبور ہوں۔ آپ کے سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ سارا روپیہ آپ کا اور آپ کے بیوی بچوں کا نہیں، بیت المال کا ہے ـــــــ!"

علاء الدین۔ (بگڑ کر) "یہ میرا مال نہیں ـــــــ؟ یہ میرا مال نہیں جسے میں نے جیتا ہے؟"

مولانا مغیث الدین: "قطعاً نہیں۔ یہ بیت المال کا مال ہے۔ اس میں سے آپ اپنے اور اپنے متعلقین کے لئے اتنا ہی لے سکتے ہیں جو شریعت کی اصطلاح میں بہ قدرِ کفاف کہلاتا ہے۔ یعنی اس پر آپ کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا دوسرے مسلمانوں کا، دوسرے سپاہیوں کا! دوسرے الفاظ

میں یوں سمجھئے کہ آپ میں اور عامۃ المسلمین کے استحقاق میں کوئی فرق نہیں —— زیادہ خرچ، جو ملکی مصالح اور حکومت کے رعب وداب کے واسطے ضروری ہو، اس کے جواز کی گنجائش نکل سکتی ہے!"

علاءالدین :- "یہ جو میں باغیوں اور فتنہ انگیزوں کو ان کے رفقا سمیت سزائے قتل دیتا ہوں اور ان کا سارا مال ومتاع ضبط کرلیتا ہوں، اسی طرح چوروں اور بدکاروں کو قتل کرادیتا ہوں شرابیوں کو کنوئیں میں قید کراتا ہوں —— پھر تو آپ ان سب باتوں کو بھی خلافِ شریعت قرار دیں گے؟"

مولانا مغیث الدین :- "یہ سب سزائیں شریعت کے خلاف ہیں۔ ان کے جواز کا کوئی پہلو نہیں نکل سکتا!"

علاءالدین :- "کیا آپ یہ طے کرکے آئے ہیں کہ میری ہر بات کی مخالفت کریں گے۔ میرے ہر قدم کو شریعت کے خلاف قرار دیں گے۔ میرے ہر فیصلہ کو شریعت سے ٹکرائیں گے؟"

مولانا مغیث الدین :- "اگر آپ نے یہ طے کرلیا ہے کہ شریعت پر عمل نہیں کریں گے، تو میرے پاس مخالفت کرنے کے سوا اور چارۂ کار کیا ہے؟ —— کیا آپ کی خاطر میں خدا کو خفا کرلوں؟ کیا آپ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے میں اس سے بگاڑ کرلوں۔ جو ہر وقت آپ کے جاہ وجلال، دبدبہ اور طنطنہ کو ختم کردینے کی قوت رکھتا ہے؟ کیا اس چندروزہ زندگی کے لئے میں اس زندگی کا سودا کرلوں، جو ہمیشہ رہنے والی ہے، جو کبھی ختم نہ ہوگی؟ —— اگر آپ نے مجھے اتنا کمزور سمجھا ہے تو یہ آپ کی غلطی ہے۔ بیشک میں کمزور اور کم مایہ ہوں، لیکن اتنا نہیں جتنا آپ نے سمجھ رکھا ہے!"

علاءالدین :- "لیکن میری نیت نیک ہے۔ لوگ بیہودہ حرکتوں کے اتنے عادی ہوچکے ہیں کہ بغیر

سخت سزا کے قابو میں نہیں آتے۔ مجھے اُمید ہے خدا معاف کرے گا!"

مولانا غیاث الدین: "آپ جانیئے اور خدا جانے، ——— مَیں تو صرف وہی کہوں گا جو شریعت کہتی ہے۔ ویسے آپ میں اور خدا میں کیا راز و نیاز ہیں؟ ——— یہ مَیں نہیں جانتا —! مجھے اس سے دلچسپی بھی نہیں!"

علاء الدین: "مولانا! مَیں آپ کی باتوں سے خوش ہُوا۔ مَیں آپ کو خلعتِ فاخرہ اور زرِ نقد انعام دینا چاہتا ہوں!"

مولانا غیاث الدین: "زرِ نقد اور خلعتِ فاخرہ کی مجھے ضرورت نہیں۔ مَیں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ آپ کو ہدایت نصیب کرے!"

رازو نیاز!

دُوسرے دن پھر موقعہ پاکر راجکمار گوبند پرشاد نے راجکماری دیول دیوی کو وہیں راج محل کے پائیں باغ میں پالیا۔ کل کی طرح پھر فرمائش کی۔

"آؤ کچھ دیر بیٹھیں، باتیں کریں!"

وہ مسکراتی ہوئی آئی۔ اور اس کے قریب بیٹھ گئی۔ کہنے لگی :-

"لو بیٹھ گئی آکر، کہو کیا کہتے ہو لیکن ذرا جلدی، زیادہ دیر نہیں بیٹھ سکتی!"

گوبند پرشاد:- "بیٹھ جاؤ گی تو کیا بگڑ جائے گا ——— جب تک ہم کہیں، تب تک بیٹھو!"

دیول دیوی:- "آخر تم نے مجھے سمجھا کیا ہے، کچھ میں تمہاری داسی ہوں ——— نہیں بیٹھتی!"

یہ کہہ کر وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ جیسے اب جایا چاہتی ہے۔

گوبند پرشاد:- "تم تو خفا ہوگئیں! ——— بھلا کوئی یوں خفا ہوتا ہے!"

دیول دیوی:- "پھر تم نے کیوں خفا کیا ہمیں؟"

گوبند پرشاد:- "اچھا چوک ہوئی۔ شما (معاف) کرو۔ سنو! میں بڑی ضروری بات کہنا چاہتا ہوں!"

وہ پھر بیٹھ گئی۔ مسکرائی، اور گوبند پرشاد کی طرف دیکھے بغیر بولی :-

"تو کہو پھر ——— مجھے بھی تو آج ایک بڑا ضروری کام ہے، ——— اچھا اب جانے دو، پھر آجاؤں گی کسی وقت، جب تم بلاؤ گے!"

گوبند پرشاد: "چلی جانا! لیکن بات تو سن لو پوری طرح، بڑی ضروری بات ہے۔"

دیول دیوی: "وہی پریم اور محبت کی بات ہو گی ——— ؟ کیوں جی؟"

وہ مسکرانے لگی۔ راجکمار کے ہونٹوں پر بھی تبسم کھیلنے لگا۔

گوبند پرشاد: "ہاں، ——— بس وہی! مجھے تو وہی ایک بات آتی ہے اور کچھ نہیں!"

دیول دیوی: "اچھا تو تم پریم کرتے ہو ہم سے ——— ؟ یہی بات ہے نا؟ کچھ اور تو نہیں؟"

گوبند پرشاد: "ہاں ——— بہت زیادہ پریم کرتا ہوں۔ اتنا زیادہ کہ تم اندازہ نہیں لگا سکتیں!"

دیول دیوی: "سچ؟ ——— میں نے رادھا سے پوچھا تھا، وہ تو کہتی تھی یہ راجہ اور راجکمار دن میں سو سو بار پریم کرتے ہیں! ——— اور تم کس کس سے پریم کرتے ہو؟ دیکھو سچ کہنا!"

گوبند پرشاد: "کسی سے نہیں کرتا۔ جب سے تمہیں دیکھا ہے، سب کو بھول چکا ہوں، اب کوئی یاد نہیں۔ من میں تم بسی ہوئی ہو، اور وہ ہر وقت تمہاری ہی مالا جپا کرتا ہے۔ جانے کیا کر دیا ہے تم نے اس بے چارے پر ——— ! یوں لگتا ہے جیسے تم بن زندگی نہیں کٹ سکتی!"

دیول دیوی: "رادھا بتا رہی تھی، اس طرح کی باتیں یہ راجہ اور راجکمار سب کے کرتے ہیں۔ نہ جانے اور کس کس سے تم نے ایسی باتیں کی ہوں گی!"

گوبند پرشاد: "اونہہ، یہ رادھا کون اُلو کی پٹھی ہے ——— ؟ بکواس کیا کرتی ہے ہر وقت!"

دیول دیوی: "واہ ہماری بڑی اچھی سکھی ہے۔ گالی کیوں دے رہے ہو اسے، ابھی جا کر ماتا جی سے شکایت کر دوں گی!"

گوبند پرشاد: "نہیں نہیں، ایسا نہ کرنا، رادھا بڑی اچھی ہے۔ لیکن ہمارے معاملے میں بولتی کیوں

ہے ؛ کیا حق ہے اُسے ؟"

دیول دیوی :- "وہ تو مجھے اونچ نیچ سمجھا رہی تھی، کوئی دشمن تھوڑے ہے !"

گوبند پرشاد :- "بڑی دوست ——— اچھا مان لیا وہ بڑی اچھی اور بڑی سچی ہے - اس نے دوسروں کے بارے میں جو کچھ کہا، وہ بالکل سچ ہے، میرے بارے میں جو کچھ کہا وہ غلط ہے، بالکل غلط ہے !"

دیول دیوی :- "یہ کیسے ؛ ——— ایک بات دوسروں کے لئے سچ ہے، تمہارے لئے غلط کیوں ہو گئی ؛"

گوبند پرشاد :- "بات یہ ہے کہ دوسروں کے بارے میں اس لئے سچ ہے کہ اس نے انہیں دیکھا، جانچا اور پرکھا ہوگا، مجھے وہ کیا جانے ؟"

دیول دیوی :- (تائید میں گردن ہلا کر) "ہاں یہ ٹھیک ہے ! تمہیں واقعی وہ نہیں جانتی !"

گوبند پرشاد :- "اب تو یقین آ گیا میری بات کا ؛ میں جھوٹ تو نہیں کہتا ؛"

دیول دیوی :- "ہاں آ گیا یقین، سچ کہہ رہے ہو تم، وہ پگلی ہے !"

گوبند پرشاد :- "مانتی ہو میں تم سے سچا پریم کرتا ہوں، ——— ؛"

دیول دیوی :- "ہاں مانتی ہوں، تمہارا پریم سچا ہے ! تم واقعی دل سے چاہتے ہو مجھے !"

گوبند پرشاد :- "اور تم خود ——— تم خود بھی مجھ سے پریم کرتی ہو یا نہیں ——— ؛ اس سوال کا جواب بھی دو !"

دیول دیوی :- "ابھی نہیں ——— ! ابھی نہیں چاہ سکتی ہوں تمہیں !"

گوبند پرشاد :- "ابھی نہیں ——— ؛ پھر کب چاہو گی ؛ کیا انتظار ہے کسی بات کا ؛"

دیول دیوی :- "ایسا ہی سمجھ لو ! ——— واقعی انتظار ہے ایک بات کا ——— پھر چاہنے لگوں گی ؛"

گوبند پرشاد :- "تو وہ بات بھی بتا دو، کیوں پریشان کر رکھا ہے خواہ مخواہ ؛"

دیول دیوی: "بتا تو دوں۔ لیکن تم پھر گالیاں دینے لگو گے میری سکھی کو، ــــــ بیچاری رادھا!"

گوبند پرشاد: "نہیں ایک گالی بھی نہیں دوں گا، ــــــ بتاؤ، لیکن چھپانا نہیں!"

دیول دیوی: "وہ کہتی تھی، پریم کسی سے اس وقت کرنا جب آزما لینا۔ آزما لوں گی تب کروں گی پریم تم سے ــــــ!"

گوبند پرشاد: "ہاں یہ اس نے بڑی اچھی بات کہی ہے ــــــ تو پھر آزما کیوں نہیں لیتیں؛ مجھے، میرے پریم کو اچھی طرح کسوٹی پر کس لو۔ اگر کھرا نکلے تو محبت کرنا، نہیں تو دھتکار دینا کتے کی طرح اپنے در سے!"

دیول دیوی: "واہ! کہیں ایسا ہو سکتا ہے۔ آپ اتنے بڑے راجکمار آپ کو دھتکار دوں گی بھلا؟"

گوبند پرشاد: "نہیں، میں راجکمار نہیں، ــــــ میں راجکمار نہیں ــــــ!"

دیول دیوی: (مسکرا کر) "پھر کیا ہیں آپ؟ ــــــ بھکاری؟ ــــــ بتائیے۔"

گوبند پرشاد: "ہاں دوسروں کے لئے میں راجکمار ہوں اور تمہارے لئے بھکاری، صرف بھکاری!"

دیول دیوی: "نہیں، راجکمار راجکمار ہی رہتا ہے، وہ بھکاری کیسے ہو سکتا ہے؟"

گوبند پرشاد: "میں جو ہوں! ــــــ مجھے دیکھ لو، یہ بیٹھا ہے تمہارے در کا بھکاری!"

دیول دیوی: "نہیں، ایسا نہ کہئے، آپ راجکمار ہیں، بڑے اچھے راجکمار ہیں، مجھے بہت اچھے لگتے ہیں آپ؟"

گوبند پرشاد: (خوش ہو کر) "میں اچھا لگتا ہوں تمہیں؟ پھر سے کہنا، میں اچھا لگتا ہوں تمہیں؟"

دیول دیوی: "ہاں بہت زیادہ اچھے لگتے ہیں آپ ہمیں تو!"

گوبند پرشاد: (جوشِ مسرت سے بے خود ہو کر) "واقعی؟ ــــــ سچ؟ کیسے مان لوں راجکماری؟"

دیول دیوی: "آپ میری بات مانتے کیوں نہیں؟ ــــــ کہہ جو رہی ہوں آپ مجھے بہت اچھے

لگتے ہیں ــــــ !"

گوبند پرشاد: "تو میں سمجھ لوں، میرا پریم بے اثر نہیں رہا۔ تم بھی مجھ سے محبت کرتی ہو؟

دیول دیوی! تم نے مجھے زندہ کر دیا!"

دیول دیوی: "واہ یہ کیسے؟ ــــــ آپ اچھے خاصے تو بیٹھے ہیں، زندہ سلامت! میں کیوں

زندہ کرتی ــــــ؟ زندہ کرنا اور مارنا تو پرماتما (خدا) کا کام ہے!"

گوبند پرشاد: "نہیں تم ہی نہیں، تم نے میرا پریم قبول کر کے میری محبت کا جواب محبت سے دے کر

مجھے نئی زندگی دی!"

دیول دیوی: "لیکن میں آپ سے پریم تو نہیں کرتی! یہ خیال آپ کے دل میں کیسے آیا؟"

گوبند پرشاد: (مضمحل ہو کر) "کیا کہا، تم مجھ سے محبت نہیں کرتیں؟ میں نے غلط سنا تھا؟

غلط سمجھا تھا؟ میرے کانوں نے مجھے دھوکا دیا تھا؟ کیا ابھی تم نے یہ نہیں کہا کہ میں تمہیں

اچھا لگتا ہوں ــــــ؟"

دیول دیوی: "ہاں کہا تھا ــــــ اور اب بھی کہتی ہوں، سچ آپ مجھے اچھے لگتے ہیں!"

گوبند پرشاد: "میں تمہیں اچھا لگتا ہوں، لیکن تم مجھ سے پریم نہیں کرتیں ــــــ کیسی

عجیب بات ہے یہ؟"

دیول دیوی: "کیا جو چیز اچھی لگتی ہے، آدمی اس سے پریم بھی کرنے لگتا ہے ــــــ؟"

گوبند پرشاد: "ہاں ــــــ اچھی اسی وقت لگتی ہے جب پریم ہو جاتا ہے۔ بغیر پریم کے کیسے

اچھی لگ سکتی ہے؟"

دیول دیوی: "یہ میں اب بھی کہتی ہوں آپ مجھے اچھے لگتے ہیں۔ لیکن پریم تو میں ابھی نہیں کر سکتی

آپ سے، صاف صاف بات ہے یہ!"

گوبند پرشاد: "اوہ! آخر کیوں؟ کس چیز کا انتظار ہے؟ یہ تامّل کیوں؟ کس لئے؟"

دیول دیوی: "اس وقت کروں گی جب آزما لوُں گی آپ کو، اچھی طرح سے!"

گوبند پرشاد: "پھر آزماؤ، دیر کیا ہے؟ کہو تو گردن کاٹ کر رکھ دوں تمہارے قدموں پر؟"

دیول دیوی: "واہ، کیا آپ کی جان لینا ہے اس طرح آزما کر ـــــــ درگزری ایسے آزمانے سے!"

گوبند پرشاد: "میری جان کو اتنا قیمتی کیوں سمجھتی ہو ـــــــ تمہارے ایک اشارہ پر مَیں اس سے دستبردار ہو سکتا ہوں!"

دیول دیوی: (معصومیت سے) "آپ میرے کہنے سے اپنی جان دے سکتے ہیں؟ گردن کاٹ لیں گے اپنی؟"

گوبند پرشاد: (سینہ ٹھونک کر) "ہاں، ـــــــ کہہ کے تو دیکھو! صرف ایک اشارہ ہی کافی ہے تمہارا!"

دیول دیوی: "مَیں ایسا پاپ نہیں کر سکتی، کسی اَور طرح آزماؤں گی۔ جان لے کر آزمایا، اور آپ سچے نکلے تو پھر پریم کس سے کروں گی؟"

وہ ہنسنے لگی۔ پھر ایک ادا سے بولی:۔

"بڑے بیوقوف ہیں آپ، ـــــــ بھلا کوئی ایسی بات کہتا ہے!"

گوبند پرشاد: "مَیں چاہتا ہوں جب یہاں سے جاؤں تو تمہاری محبت لیے کر جاؤں!"

دیول دیوی: "تو کیا آپ جا رہے ہیں یہاں سے؟ اتنی جلدی، ابھی آپ کو رہنا پڑے گا!"

گوبند پرشاد: "چند دن میں مجھے جانا ہے! جانا چاہتا تو نہیں لیکن مجبور ہوں!"

دیول دیوی: "کیوں جاتے ہیں ابھی رہئے، اتنی جلدی کی کیا ضرورت ہے؟ نہ کوئی کام ہے نہ کاج، دل گھبرا گیا ہوگا یہاں سے؟"

گوبند پرشاد: "پتا جی کا بلاوا آیا ہے ـــــــ راج کا کوئی کام ہے! ورنہ مَیں ابھی چلا جاتا؟"

دیول دیوی: "اچھا جایئے ـــــــ لیکن جلدی آجایئے گا ـــــــ! کیجئے وعدہ؟"

گوبند پرشاد ۔ "اس وقت تک نہیں جاؤں گا جب تک تم آزما نہیں لوگی، میں نے کہا نا! اس طرح جانا چاہتا ہوں کہ تمہاری محبت میرے ساتھ ہو ——— ! میرے ساتھ ساتھ چلے، میرے ساتھ ساتھ ہے!"

دیول دیوی ؛ "تو اتنی جلدی کیسے آزمالوں ——— ابھی کوئی ترکیب تو سوچی نہیں میں نے، ذرا غور کر لینے دیجئے!"

گوبند پرشاد ۔ "سوچ لو ——— کتنی دیر لگتی ہے اس میں ؟ کون سا اتنا بڑا اور اہم کام ہے ؟"

دیول دیوی ؛ "اچھا رادھا سے پوچھوں گی ——— ! وہی بتائے گی کچھ!"

گوبند پرشاد ۔ "پھر تم نے رادھا کا نام لیا ؛ اس نام سے چڑ ہونے لگی ہے مجھے!"

دیول دیوی ۔ "تو کیا ہوا ؟ ——— آپ تو مفت میں جلتے ہیں اس سے، وہ بڑی اچھی ہے، اُس دن مَیں نے مار بھی دیا، پھر بھی وہ نہیں روٹھی !"

گوبند پرشاد ۔ "تم نے اُسے مارا کیوں ؟ کیا خطا کی تھی اس نے ؟ اب تو مجھے ہمدردی ہونے لگی بیچاری سے !"

دیول دیوی ۔ "چڑا رہی تھی مجھے ——— کہہ رہی تھی تمہاری اور راجکمار کی جوڑی بڑی اچھی رہے گی!"

گوبند پرشاد ۔ "یہ بات تو اس نے انعام کے قابل کی تھی ۔ خواہ مخواہ مار دیا بیچاری کو!"

دیول دیوی ۔ (مسکرا کر) "بڑی عمر ہے، وہ دیکھئے، اسی طرف آرہی ہے، اب دیجئے انعام، مُنہ بھر دیجئے اس کا موتیوں سے !"

گوبند پرشاد ۔ "ضرور انعام دوں گا، ——— ! مُنہ مانگا، وہ بڑے سے بڑے انعام کی مستحق ہے!"

اتنے میں رادھا قریب آگئی ——— دیول دیوی نے اس سے کہا :

دیول دیوی ؛ "مُنہ کھول، ——— راجکمار تیرا مُنہ موتیوں سے بھریں گے، ——— سچ ! اری کھول، مجھے کیا ٹکر ٹکر دیکھے جارہی ہے ؟

دیول دیوی: "خبردار ——— وہ خود آرہے ہیں!"

اتنے میں شکاری لباس میں ملبوس، گوبند پرشاد سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ یوں بھی وہ جامہ زیب تھا، لیکن اس وقت واقعی وہ بڑا بانکا سجیلا سپاہی معلوم ہورہا تھا۔ دیول دیوی اسے دیکھ کر خوش ہوگئی، لیکن جھوٹ موٹ خفا ہوتی ہوئی بولی:۔

دیول دیوی: "بڑی دیر کردی آپ نے ——— ہم تو جارہے تھے، رادھا کا شکریہ ادا کیجئے، اس نے ہمارے گھوڑے کی باگ پکڑ لی، کہ راجکمار کو آلینے دیجئے ——— کہاں رہ گئے تھے آپ؟"

گوبند پرشاد: "کیا بتاؤں، کب کا آچکا ہوتا، لیکن جیسے ہی کمرے سے باہر نکلا، کمبخت بلی نہ جانے کب سے انتظار کررہی تھی میرا۔ راستہ کاٹ گئی!"

راجکماری دیول دیوی ہنسنے لگی:۔

"اور آپ ڈر گئے؟ ——— میں تو ان باتوں کی پروا نہیں کرتی ذرا بھی!"

گوبند پرشاد: "بزرگ جن باتوں کو مانتے چلے آئے ہیں نا، ہم کیسے نہ مانیں، ماننا ہی پڑتی ہیں!"

راجکماری نے کوئی جواب نہ دیا، گھوڑے کو ایڑ لگائی، اور شکار پر روانہ ہوگئی۔ سب لوگ اس کے پیچھے پیچھے تھے۔ راجکماری اور راجکمار کے گھوڑے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ محافظ سپاہی ان سب کو اپنے گھیرے میں لئے ہوئے تھے۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد گوبند پرشاد نے کہا:۔

"میں نہیں جانتا تھا تم اتنی اچھی سوار ہو، گھوڑا خاصا سرکش معلوم ہوتا ہے، لیکن کس طرح کان دبائے ہوئے چل رہا ہے، ——— کمال ہے بھئی یہ تو!"

دیول دیوی: "شریف گھوڑا ہے، پہچانتا ہے، ——— گھوڑے کی وفاداری تو ضرب المثل ہے!"

گوبند پرشاد: "ہاں وہ تو ہے ——— لیکن فطرت اور جبلت نہیں بدلتی، وفادار گھوڑا بھی سرکش

ہو سکتا ہے، اکو سکتا ہے!"

دیول دیوی۔ ہوتا ہوگا ——— ہمارا گھوڑا تو بڑا اچھا ہے! بڑا نیک، بڑا سعادت مند!"

گوبند پرشاد: سواری کا فن کس سے سیکھا ہے تم نے؟ بہت اچھی طرح چڑھ لیتی ہو تم تو!"

دیول دیوی: "ایک سواری کیا ——— سب کچھ جانتی ہوں، تیر چلا لیتی ہوں، نیزہ گھماتی ہوں، تلوار چلانا بھی جانتی ہوں ——— پچھلی دفعہ جو میلہ ہوا تھا، اس میں یہ میرا گھوڑا سب سے آگے نکل گیا تھا دوڑ میں، پتا جی نے انعام بھی دیا تھا، بہت خوش مجھ سے تھے!"

گوبند پرشاد۔ (مسکرا کر) "اور شکار کرنا کس سے سیکھا؟ یہ بھی تو بتاؤ؟"

دیول دیوی: "یہ بھی آ گیا ——— ! سیکھنے سے سب کچھ آ جاتا ہے، کوشش شرط ہے!"

گوبند پرشاد: "میرا مطلب یہ ہے کہ یہ فن تو تمہیں بڑا اچھا آتا ہے ——— !"

دیول دیوی: "آتا تو ہے ——— لیکن آپ نے کس سے سنا؟ کیسے جانا آپ نے؟"

گوبند پرشاد: "سننے کی کیا ضرورت تھی، دیکھ لیا ——— ! شنیدہ کے بود مانند دیدہ!"

دیول دیوی: "یہ آج آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں، آپ نے شکار کرتے کب دیکھا مجھے؟ ——— جھوٹ تو نہ بولیے!"

گوبند پرشاد: "راجکماری میں جھوٹ نہیں بولتا ——— کیا میں تمہارا شکار نہیں ہوں؟ کیا تمہاری آنکھوں کے تیر میرا دل نہیں چھید چکے ہیں؟ ——— تمہیں خبر بھی نہیں کہ شکار کس طرح پھڑپھڑا رہا ہے!"

دیول دیوی ہنسنے لگی۔ اس نے کہا:

"آپ کو ایسی باتیں بتا کہاں سے آ گئیں! ——— کس سے سیکھا آپ نے یہ فن؟"

گوبند پرشاد: "کسی سے نہیں، واقعہ بیان کرنے پر کسی ہدایت کی ضرورت نہیں ہوتی!"

دیول دیوی: "اچھا نہیں ہوتی ہوگی، ——— یہ بتلایئے آپ شکار کس طرح کرتے ہیں؟

ٹھیک ٹھیک بتایئے۔ کچھ اور نہ کہنے لگئے گا ——— ! جو بات پوچھ رہی ہوں بس اسی کا جواب دیجیے گا ——— !"

گوبند پرشاد: "اگر یہ بات ہے تو میں آپ کا سوال سمجھ نہیں سکا اچھی طرح سے، ذرا صاف صاف کہیئے!"

دیول دیوی: "میں یہ پوچھ رہی ہوں کہ آپ شکار کو مارتے ہیں یا پکڑتے ہیں؟"

گوبند پرشاد: "شکار کو پکڑنے کا کیا سوال، تیر چلایا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا، قصہ ختم ——— !"

راجکماری کھلکھلا کر ہنس پڑی

گوبند پرشاد: "ارے تم تو ہنسنے لگیں، شاید تمہیں میرے نشانہ پر بھروسہ نہیں؟ ———

راجکماری! میں اپنی بڑائی نہیں کرتا۔ لیکن اتنا اچھا تیر انداز ہوں کہ آج تک میرا تیر خطا نہیں گیا!"

دیول دیوی: "ہونہہ، بڑائی نہیں کرتے، اور یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ بڑائی نہیں ہے؟"

گوبند پرشاد: "دیکھ لینا ابھی چل کر، جس جانور پر اشارہ کر دوں گا، ایک ہی جھٹکی میں اگر پھڑکتا ہوا نظر نہ آئے، تو میرا نام گوبند پرشاد نہیں!"

وہ مسکرانے لگی، لیکن اس تبسم میں طنز تھا:-

"نام بدل دینے سے کیا ہوگا ——— کیا پھر آپ، آپ نہ رہیں گے، کچھ اور ہو جائیں گے؟

اچھا یہ مانے لیتی ہوں، آپ بڑے قدر انداز ہیں، آپ کا نشانہ کبھی خطا نہیں جاتا، تیر ہمیشہ ٹھیک نشانہ پر بیٹھتا ہے۔ لیکن میرے سوال کا جواب تو اب بھی رہا جاتا ہے ——— !"

گوبند پرشاد: "وہ تو میں نے دے دیا / اب اور کیا معلوم کرنا چاہتی ہو؟"

دیول دیوی: "میں شکار کی جان نہیں لیتی اسے پکڑ لیتی ہوں ——— ! کیا آپ بھی ایسا کر سکتے ہیں؟"

گوبند پرشاد: "وہ کس طرح؟ بھئی ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔ شکار پکڑا کس طرح جاتا ہے؟"

دیول دیوی :۔ مثلاً ہرن کی ڈار میں نے دیکھی۔ اس میں سے کسی ایک کو پسند کر کے تاک لیا، اور گھوڑا اس کے پیچھے ڈال دیا، اور سکھیوں کو منع کر دیا کہ اس پر کوئی تیر نہ چلائے۔ اب وہ لاکھ چوکڑیاں بھرے لیکن میں اس کا پیچھا کر کے اس طرح گانس لیتی ہوں کہ چاروناچار گرفت میں آجاتا ہے۔ پھر واپسی میں سکھیوں کے ساتھ وہ ہرن ہوتے ہیں جن کی گردن کٹی ہوتی ہے، جن کا خون نکل چکا ہوتا ہے، جن کی جان جا چکی ہوتی ہے، اور میرے ساتھ وہ ہرن ہوتا ہے جو زندہ ہوتا ہے، میں اسے پال لیتی ہوں۔ ——— مجھ سے کسی کی ہتیا نہیں ہوتی۔ ہمارے راج محل میں آپ نے ہرن دیکھے تو ہوں گے ؟"

گوبند پرشاد :۔ "ہاں دیکھے ہیں ——— بڑے خوبصورت ہیں، بہت سے !"

دیول دیوی :۔ "یہ سب میرے پکڑے ہوئے ہیں اور اسی طرح ——— !"

گوبند پرشاد :۔ "واہ بھئی کمال ہو گیا ——— واقعی کمال ہے یہ ! تم تو بڑی باکمال نکلیں ؟"

دیول دیوی :۔ "وہ تو ہوں۔ مگر بتایئے آپ بھی کر سکتے ہیں ایسا شکار ؟"

گوبند پرشاد :۔ "جی تو چاہنے لگا یہ باتیں سن کر ——— آج کوشش کروں گا !"

اتنے میں گھوڑا بڑھا کر رادھا بھی پاس آگئی۔ اس نے گوبند پرشاد سے کہا :۔

"واہ ! آپ بھی اچھے رہے۔ میری جگہ پر مستقل قبضہ جمائے ہوئے ہیں !"

گوبند پرشاد :۔ "یہاں کون سی جگہ ہے جس پر میں نے قبضہ کر لیا ؟"

رادھا :۔ "ہمیشہ راجکماری کے ساتھ ساتھ میرا گھوڑا چلتا تھا، آج آپ براجمان ہیں، بس بہت ہو گیا، اب آپ پیچھے ہٹیئے میں راجکماری کے ساتھ ساتھ چلوں گی !"

گوبند پرشاد :۔ "تو کس نے منع کیا ہے ؟ ——— ایک طرف میں ہوں، دوسری طرف تم آجاؤ !"

رادھا :۔ "واہ ! ہم باتیں کریں گے راجکماری سے ——— !"

گوبندپرشاد: شوق سے باتیں کرو ــــــ میں منع کب کرتا ہوں!؟"

رادھا: "اور اگر آپ کے سامنے کرنے کی نہ ہوں، تو؟"

گوبندپرشاد: "ایسی باتیں گھر پر کرنا۔ یہاں ہم شکار کی باتیں کر رہے ہیں۔ تمہیں صرف اتنی اجازت دی جاسکتی ہے کہ چاہو تو اس بات چیت میں شریک ہو جاؤ۔ اگر یہ منظور نہیں، تو جہاں سے آئی ہو، وہیں چلی جاؤ ــــــ!"

دیول دیوی: "اری کیوں لڑ رہی ہے خواہ مخواہ، سارا راستہ تو طے ہو گیا۔ اب پہنچے جاتے ہیں جنگل میں ــــــ اور تجھے باتیں بھی ایسی کیا کرنی ہیں؟ ــــــ چل ہٹ، شرارت کی باتیں نہ کیا کر!"

گوبندپرشاد: "اچھا تو پھر راجکماری یہ بات طے ہو گئی۔ ہم دونوں اپنا شکار ماریں گے نہیں پکڑ لیں گے؟"

دیول دیوی: "ہاں، ــــــ منظور ہے مجھے!"

رادھا: "ہم تو اپنی باتیں کچھ نہ کہہ سکے، اور یہاں شکار کا سارا منصوبہ طے ہو گیا!"

گوبندپرشاد: "اور کیا ــــــ دیکھنا آج کیا لطف آتا ہے!"

رادھا: "وہ تو ابھی سے معلوم ہے!"

گوبندپرشاد: "کچھ بھی نہیں معلوم ہے ــــــ کیوں راجکماری یہ رادھا کیسا شکار کھیلتی ہے؟"

دیول دیوی: "بہت اچھا ــــــ اس کا تیر بھی ہمیشہ نشانہ پر بیٹھتا ہے!"

رادھا: (گوبند سے مخاطب ہو کر) "ہاں بچے رہیئے گا ذرا میرے تیر سے!"

گوبندپرشاد: "تو کیا مجھ پر تیر چلاؤ گی؟ چلا چکی، ناکام کوشش نہ کرو!"

رادھا: "کیا ہوا؟ ــــــ آپ مجھ پر چلا کر دیکھ لیجئے۔ کاٹ نہ دوں تو میرا ذمہ!"

دیول دیوی: "ہاں راجکمار! واقعی یہ تیر چلاتی بھی غضب کا ہے اور کاٹتی بھی غضب کا ہے۔ بڑے بڑے تیر اندازوں سے شرط باندھ کر ہمیشہ جیتتی ہے ——— !"

گوبند پرشاد: "نہ جانے کیسے اناڑی ہوں گے وہ؟"

رادھا: "آپ تو بڑے اُستاد ہیں تیر چلانے میں ——— ؟ آیئے یہیں ہو جائے مقابلہ!"

یہ کہہ کر رادھا نے کمان سنبھالی۔

دیول دیوی نے اس سے تیر بھی چھین لیا اور کمان بھی۔

"کچھ دیوانی ہوئی ہے! راجکمار سے مقابلہ کرے گی، یہ حوصلہ؟"

رادھا: "آپ کو یاد نہیں ہے، پچھلے میلہ میں خاص راجہ صاحب سے میں نے مقابلہ کیا تھا ——— جیتی تھی یا نہیں ——— ؟"

دیول دیوی: "وہ اَور بات تھی ——— پتا جی نے خود ہی تو شرط اور انعام مقرر کیا تھا ——— یہاں تو خواہ مخواہ بھڑ رہی جاتی ہے ——— بس اپنی جگہ واپس جا، ہمیں راجکمار سے باتیں کرنے دے!"

دیول دیوی نے تیر کمان رادھا کو واپس کر دیا۔ وہ پھر مسکراتی ہوئی جا کر اپنی سہیلیوں میں مِل گئی۔ اس کے جانے کے بعد گوبند پرشاد نے دیول دیوی سے پوچھا۔

گوبند پرشاد: "واقعی، یہ بڑی اچھی تیر انداز ہے؛ یا گپ اڑا رہی تھی؟"

دیول دیوی: "ہاں راجکمار، پتا جی تک کو ہرا چکی ہے۔ ——— بڑی نٹ کھٹ ہے، اچھا ہُوا آپ چُپ ہو رہے، ورنہ نہ جانے کیا ہوتا اس وقت۔ میں تو گھبرا گئی تھی ——— سچ!"

گوبند کی خاموشی اب تک قائم تھی!

ہرن کا شکار !

تھوڑی دیر میں یہ لوگ شکار گاہ پہنچ گئے، ہرنوں کی تلاش تھی، لیکن وہ کہیں نظر نہیں آرہے تھے - بڑی دیر تک۔ ان کے لالچ میں دوسرے شکار پر نظر بھی نہ ڈالی کسی نے - اتنے میں ایک ڈار ہرنوں کی نظر آئی - رادھا نے آہستہ سے کہا :-

" راجکماری، ــــــــــــ وہ دیکھئے !"

وہ بولی " ہاں دیکھ لیا، ــــــــ تم لوگ ابھی تیر نہ چلانا !"

پھر وہ راجکمار گوبند پرشاد سے مخاطب ہوئی :-

" دیکھئے، وہ دو کالے ہرن، ایک ساتھ جو نظر آرہے ہیں، ــــــــ !"

گوبند پرشاد - " وہ بیچ میں ــــــ ؛ وہ کالے کالے ــــ ؟"

دیول دیوی - " ہاں ہاں وہی، ــــــــــ بس انہی دونوں کو پکڑنا ہے - میں گھوڑا بڑھاتی ہوں - آپ بھی آیئے میرے پیچھے پیچھے !"

یہ کہہ کر دیول دیوی آگے نکلی، اور گھوڑا دوڑاتی ہوئی سیدھی ڈار کی طرف بڑھی - گھوڑے کی ٹاپ کی آواز ہی سن کر ہرنوں کے کان کھڑے ہو گئے تھے - لیکن جب ایک گھوڑے کو سرپٹ اپنی طرف

دوڑتے ہوئے دیکھا، تو یہ ڈار کائی کی طرح پھٹ گئی اور سارے ہرن ہوا سے باتیں کرتے ہوئے اِدھر اُدھر تتر بتر ہو گئے۔ لیکن راجکماری نے جس ہرن کو تاک لیا تھا، اس کے پیچھے گھوڑے کو کاوے دیتی رہی، اور گوبند پرشاد بھی دوسرے ہرن کا تعاقب زور شور سے کرتا رہا!

ڈار کے باقی ماندہ منتشر ہرنوں پر راودھا اور راجکماری کی دوسری سکھیوں نے تیر اندازی کی مشق شروع کر دی۔ کوئی اِدھر گرا، کوئی اُدھر، کوئی زخمی ہو کر بھاگ کھڑا ہوا۔ کوئی اتنی تیزی سے چھپاک کے ساتھ نکل گیا کہ تیر بھی اس تک نہیں پہنچ سکا۔ یہاں تو ہرنوں کے ساتھ قتل وغارت کا یوں بازار گرم تھا، ادھر دیول دیوی اپنے کالے ہرن کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہی تھی۔ وہ ہرن کیا تھا شعلۂ جوالہ تھا، سن سے آیا اور سن سے نکل گیا لیکن دیول دیوی کا گھوڑا بھی غضب کا تھا۔ کہاں ہرن جیسا سبک پا اور صبا رفتار جانور جو قلابھی کھا سکتا تھا، اور جسامت کی کمی کی وجہ سے جب اور جدھر چاہے مُڑ سکتا تھا، اور کہاں وہ گھوڑا، جو لاکھ تیز رفتار اور سریع السیر ہو لیکن تیزی اور چالاکی میں کسی طرح ہرن کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا، پھر بھی اس کی باگ دیول دیوی کے ہاتھ میں تھی، اور وہ بجلی کی سی تیزی اور سرعت کے ساتھ ہرن کا تعاقب کر رہا تھا۔ کھائیاں، خندق، جھاڑ جھنکار، ندی، نالہ، ہر منزل وہ ہرن کے ساتھ ہی طے کر لیتا تھا ———— لیکن اب تک ہرن ہاتھ نہیں آیا تھا۔ گھوڑا پسینہ پسینہ ہو چکا تھا، اور خود راجکماری تھک کر چور اور پسینہ سے شرابور ہو چکی تھی لیکن ہرن قریب آتا تھا اور بندوق کی گولی کی طرح سن سے نکل جاتا تھا!

سب سے زیادہ قابلِ رحم حالت اس جنگ میں راجکمار گوبند پرشاد کی تھی ————!

شروع میں تو اس نے دوسرے ہرن کا جوش و خروش کے ساتھ تعاقب جاری رکھا لیکن جب وہ چوکڑیاں بھر کر نگاہوں سے اوجھل ہونے لگا، تو یہ بیچارہ کچھ نہ کر سکا، سوا اس کے کہ حسرت اور بے بسی کے ساتھ اسے اس وقت تک دیکھتا رہا، جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو گیا

اور جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا، تو اب گوبند پرشاد نے راجکماری دیول دیوی کا تعاقب شروع کیا ——— شاید وہ ڈر رہا تھا کہ ہرن کی طرح کہیں یہ بھی آنکھوں سے اوجھل نہ ہو جائے!

راجکماری کبھی کبھی ایک لمحہ کے لئے مُڑ کر گوبند پرشاد کو دیکھ لیتی تھی۔ اس کی بے بسی سے لطف لیتی تھی، اور تازہ دم ہو کر پھر اپنا کام شروع کر دیتی تھی۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ اس نے دیکھا کہ جس ہرن کو گوبند پرشاد نے اپنے لئے تاکا تھا وہ زد سے نکل گیا اور یہ حضرت سوائے کفِ افسوس ملنے کے کچھ نہ کر سکے ——— تو وہ ایک مرتبہ زور سے ہنس پڑی۔ یہ آواز یا تو گوبند پرشاد تک پہنچی نہیں یا وہ اتنا حواس باختہ ہو رہا تھا کہ سُنا نہیں، صرف ہرن کی چوکڑیاں دیکھنے میں مصروف رہا۔

اسی طرح بڑی دیر ہو گئی۔ اب حالت یہ تھی کہ راجکماری کا گھوڑا بھی ہانپنے لگا تھا اور وہ خود بھی تھک کر نڈھال ہوئی جا رہی تھی، لیکن ایک عزم تھا جو اُسے اپنے کام میں مصروف رکھے ہوئے تھا۔ وہ جان کی بازی لگا کر بھی ہرن کو پکڑ لینا چاہتی تھی، ——— اور گوبند پرشاد کی حالت تو لمحہ بہ لمحہ بہت زیادہ غیر ہوتی چلی جا رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا وہ گھوڑے سمیت اب گرا، اور اب گرا۔ بڑی مشکل سے وہ اپنا لنگر قائم رکھے تھا، اور خود گھوڑے کا بھی یہ حال تھا کہ پاؤں رکھتا کہیں تھا، اور پڑتا کہیں تھا!

اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا !

اور راجکماری کی سکھیاں اور سہیلیاں بہت پیچھے رہ گئی تھیں، اسی طرح محافظ سپاہی بھی۔ راجکماری کے گھوڑے کی گرد نہ پا سکے۔ وہ تعاقب کرتے کرتے نہ جانے کہاں بھٹک گئے جا کر، ——— اب صورت یہ تھی کہ سکھیاں کہیں اور تھیں، سپاہی کسی اور طرف؛ اس وسیع سنسان اور پُرہول شکارگاہ میں صرف ایک راجکماری تھی جو اب تک بے انتہا تھک جانے کے باوجود تن تنہا ہرن کا تعاقب جاری رکھے ہوئے تھی، یا پھر گوبند پرشاد تھا جو زندگی سے مایوس، مضمحل اور دل شکستہ

حالت میں اس کے پیچھے پیچھے چلا جا رہا تھا ——— کئی بار اس کا جی چاہا کہ آواز دے :-

راجکماری پلٹ آؤ ۔ یہ ہرن نہیں بھوت ہے، یہ تمہاری جان لینا چاہتا ہے ۔ اور میں تو مرا جا رہا ہوں ، رحم کرو مجھ پر اور اپنے آپ پر ——— !"

لیکن جب وہ راجکماری کے تند و تیز عزم کو دیکھتا تو دل ہی دل میں شرما کر چپ ہو جاتا پھر کھسک کھسک کر اس کے پیچھے دوڑنے لگتا تھا !

اب کافی اندھیرا پھیل چکا تھا ، دل ہی دل میں خود راجکماری بھی مایوس ہوتی جا رہی تھی ۔ اس نے بہت سے ہرنوں کو گرفتار کیا تھا ۔ بغیر ذرا سا بھی زخم پہنچائے ہوئے ۔

لیکن یہ نہ جانے کیسا جی دار تھا کہ کسی طرح قابو ہی میں نہیں آتا تھا ، آخر راجکماری نے سوچا ، اس کے پاؤں پر تیر چلا کر زخمی کرے ، اور گرفتار کرے ۔ لیکن پھر آن یاد آگئی ۔ اس نے ارادہ بدل دیا اور فیصلہ کر لیا کہ یہ بھی اسی طرح گرفتار ہوگا جس طرح دوسرے ہرن پکڑے گئے تھے --- !

لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ عین مایوسی کی تاریکی میں امید کا چاند چمکنے لگتا ہے ۔ اس وقت بھی ایسا ہی ہوا ۔ بے چاری راجکماری بالکل مایوس ہو چکی تھی ۔ کہ دفعتہً وہ کالا ہرن چوکڑی بھولا ۔ راجکماری نے فوراً پھندا ڈالا ، اور اسے گرفتار کر لیا ۔

وہ خوشی سے بے تاب ہو کر چیخی :-

"راجکمار ! ——— میں نے ہرن پکڑ لیا !!"

گرتے پڑتے راجکمار بھی پاس پہنچ گئے ۔

دیول دیوی ۔ (خوشی سے بے تاب ہو کر) " راجکمار ! یہ دیکھو ——— یہ ! یہ رہا وہ کالا ہرن ، پریشان کر دیا اس نے تو !"

گوبند پرشاد:- "ہاں دیکھ لیا ——— بڑا کام کیا تم نے، بڑا پالا مار لیا!

دیول دیوی:- "اس نے تھکا مارا، ہلکان کر دیا ہمیں تو، ——— آپ بھی بہت تھک گئے ہوں گے؟

گوبند پرشاد:- "ہاں ——— کچھ یونہی سا، معمولی سا!"

دیول دیوی:- "لیکن آپ تو تنہا ہیں ——— ؟ ارے!"

گوبند پرشاد:- "ہاں ——— وہ لوگ پیچھے رہ گئے ہیں شاید ——— آتے ہوں گے

ورنہ ہم جا کر پکڑ لیں گے انہیں ——— آؤ اب چلیں ———!"

دیول دیوی:- "آپ غلط سمجھے، مجھے ان لوگوں کی فکر نہیں ہے، آتے ہوں گے یا ہم انہیں

جا لیں گے ——— لیکن وہ آپ کا ہرن کہاں ہے؟"

گوبند پرشاد وسٹ پٹا گیا، ——— لیکن دیول دیوی کو ذرا رحم نہ آیا اس پر!

دیول دیوی:- "آپ تو چپ کھڑے ہیں! ——— بتایئے کہاں ہے وہ میرا دوسرا ہرن؟"

گوبند پرشاد:- "وہ تو نکل گیا، ——— کم بخت چھلاوہ تھا!"

دیول دیوی:- "واہ! آپ بڑے کم ہمت ہیں، چھوڑ دیا آپ نے اسے، میں نے سوچا تھا

جوڑی پالوں گی!"

گوبند پرشاد:- "میں نے خود بھی یہی سوچا تھا، ——— بڑا افسوس ہوا اس کے نکل جانے

کا۔ لیکن اب کیا کیا جائے؟"

دیول دیوی:- "تو آپ نے کیوں جانے دیا اسے ———؟"

گوبند پرشاد:- "کچھ مجھ سے پوچھ کر گیا؟ ——— ہرن کی چال بجلی کی چال ہوتی ہے، بھاگ

گیا، پھر نظر ہی نہیں آیا!"

دیول دیوی:- "اوہ، میرا ہرن کیوں نہیں بھاگ گیا؟ یہ بھی تو چھلاوہ تھا، بجلی تھا، آندھی تھا!"

گوبند پرشاد:- "یہ اتنا تیز نہیں ہے، جتنا وہ تھا ـــــــ وہ تو قیامت تھا!"

دیول دیوی:- "باتیں نہ بنا یئے! (محبوبانہ انداز میں حکم دیتے ہوئے) جایئے پکڑ کے لایئے اسے کسی طرح!"

یہ فرمائش سن کر گوبند پرشاد اور گھبرایا۔ بڑی مشکل سے اس نے اپنے حواس مجتمع کئے اور کہا:-

"وہ نہیں ملے گا اب، ـــــ! نہ جانے کس ملک میں جا نکلا ہوگا، یہاں کہاں؟"

دیول دیوی:- "کیوں نہیں ملے گا؟ کیا اپنا دیس چھوڑ کر بھاگ گیا کہیں؟ ـــــــ یہیں ہوگا، کہیں تھکا تھکایا!"

گوبند پرشاد:- "ہاں میں نے اسے تھکا تو مارا تھا ـــــــ تھک کر خستہ ہو چکا تھا!"

دیول دیوی:- "تو جایئے پھر، آسانی سے قابو میں آجائے گا۔ ڈھونڈیئے تو ہمت تو کیجئے ـــــ!"

گوبند پرشاد:- "راجکماری! اب تو اندھیرا بڑھتا جا رہا ہے، اب نہیں ملے گا، کل پھر آئیں گے اور جس طرح بنے گا پکڑ لے جائیں گے ـــــ اب چلیے بہت دیر ہو گئی، ماتا جی آپ کا انتظار کر رہی ہوں گی!"

دیول دیوی:- "میں تو بغیر اسے لئے نہیں جاتی، کسی طرح بھی نہیں ٹلوں گی یہاں سے!"

گوبند پرشاد:- "تم تو ضد کرتی ہو راجکماری ـــــــ بھلا اب مل سکتا ہے؟"

دیول دیوی:- "اچھا تو آپ میرے اس نوگرفتار ہرن کی رکھوالی کیجئے، میں آس پاس کا چکر لگا آتی ہوں ـــــــ ضرور یہیں کہیں ہوگا!"

یہ کہہ کر بغیر گوبند پرشاد کے جواب کا انتظار کئے گھوڑے کو ایڑ لگا کر وہ ہوا ہو گئی۔ وہ بے چارہ منہ دیکھتا رہ گیا!

گوبند پرشاد اس وقت اتنا تھک چکا تھا کہ اب اس سے ایک قدم نہیں چلا جا رہا تھا۔ اپنی بے کسی پر اس کا جی چاہ رہا تھا کہ پھوٹ پھوٹ کر رو دے، لیکن رونے کے لئے بھی ہمت اور طاقت

کی ضرورت ہوتی ہے!

کوئی پون گھنٹے کے بعد اس کے کانوں میں گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز آئی لیکن سوار نظر نہ آیا۔ وُہ حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اتنے میں ایک سوار آتا دکھائی دیا۔ گوبند پرشاد سمجھ گیا کہ یہ دیول دیوی ہے، اور واقعی وہ دیول دیوی ہی تھی، ——— لیکن تنہا نہیں، اس کے ساتھ وہ ہرن بھی تھا، جس کی تلاش میں وہ گئی تھی، اور جس سے گوبند پرشاد یکسر مایوس ہو چکا تھا۔ راجکماری نے گھوڑے سے اُترتے ہوئے بڑے مسرور لہجہ میں کہا:۔

"راجکمار! وہ دوسرا ہرن بھی مل گیا ——— یہ رہا! یہ دیکھئے! کتنا خوبصورت ہے!"

گوبند پرشاد آنکھیں مل مل کر دیکھنے لگا۔

دیول دیوی۔ (مسکرا کر) "کیا آپ سمجھ رہے ہیں یہ کوئی دوسرا ہے؟ وہی ہے وہی!"

گوبند پرشاد۔ (جل کر) "نہیں یہ وہ نہیں کوئی دوسرا ہے، وہ کہاں سے مل جائے گا، جانے کہاں نکل گیا ہوگا؟"

دیول دیوی۔ (جلاتے ہوئے) "واہ ساری ڈار میں دو ہی ہرن تو اس رنگ کے تھے۔ ایک کو میں نے تاکا تھا، دوسرے کو آپ نے!"

گوبند پرشاد۔ "مل گیا، اچھا ہؤا، میں بحث نہیں کرتا!"

دیول دیوی: "اچھا ایک بات تو بتلایئے، ——— کیا آپ نے اس پر تیر چلایا تھا ———؟"

گوبند پرشاد: "کئی تیر چلائے کم بخت پر، لیکن ایک جو کھایا ہو اس نے؟"

دیول دیوی۔ "آپ نے تیر کیوں چلایا؟ ——— میں نے منع جو کر دیا تھا!"

گوبند پرشاد۔ "منع تو کیا تھا، اور شروع میں میں نے اس ممانعت کا خیال بھی رکھی لیکن

جب چوکڑیوں پر چوکڑیاں بھرنے لگا اور کسی طرح ہاتھ نہیں آیا تو کیا کرتا؛ ـــــ آدمی ہوں، آگیا غصہ!"

دیول دیوی۔ "آپ کو غصہ آگیا ہرن پر؛ ـــــ آپ یہ چاہتے تھے کہ وہ اپنا بچاؤ نہ کرے، گردن جھکا کر سامنے کھڑا ہوجائے آکر؛"

گوبند پرشاد۔ "نہیں، لیکن اس نے پریشان بہت کیا تھا۔ عاجز کر رہا تھا، اس کے سوا کوئی اور چارۂ کار ہی نہ تھا!"

دیول دیوی۔ "پہلے بھی آپ نے زخمی کردیا ہمارے ہرن کو ـــــ ناکارہ ہوگیا بیچارہ، بھلا کوئی جانوروں پر غصہ کرتا ہے؛ ـــــ یہ لیجیے اپنا تیر! پہچان لیجیے وہی ہے؛"

گوبند پرشاد نے تیر ہاتھ میں لے کر دیکھا اور خوش ہوکر جواب دیا:۔

"ہاں وہی ہے؛ میں اپنا تیر پہچانتا ہوں، ـــــ تو یوں سمجھئے، یہ حضرت زخمی تھے، اس لئے مل گئے، ورنہ وہ کنویں جھکائے ہوتے انہوں نے کہ ساری رات ختم ہوجاتی!"

دیول دیوی۔ "لیکن آپ تو زخمی کرنے کے بعد بھی نہ پکڑ سکے ـــــ میں پکڑ تو لائی!"

گوبند پرشاد۔ "اچھا بھئی تم جیتیں ہم ہارے ـــــ بس اب تو خوش ہوگئیں؟"

دیول دیوی۔ "جی معاف کیجئے، آپ صرف ہارے ہی نہیں بلکہ آزمائش میں بھی پورے نہیں اُترے!"

گوبند پرشاد۔ "کیا مطلب؛ ـــــ واہ اس کا آزمائش سے کیا تعلق؟"

دیول دیوی۔ "کیوں نہیں؛ جب آپ میری خاطر سے اتنا کام نہ کرسکیں گے، تو کیا کرسکیں گے۔ میرے لئے آپ اپنی جان قربان کررہے تھے، لیکن ایک معصوم جانور کی جان نہ بچا سکے جائیے بھی ہم نہیں بولتے آپ سے!"

گوبند پرشاد۔ "خفا ہوگئیں تم تو؟"

دیول دیوی۔ "ہاں ـــــ بہت زیادہ!"

ـــــ ٭ ـــــ

آزمائش!

اِس وقت گوبند پرشاد پر متضاد کیفیتیں طاری تھیں!

وہ اپنی ناکامی پر دل میں شرمندہ تھا، ـــــــ جو کام وہ نہ کر سکا، اسے ایک اس سے

چھوٹی عمر کی لڑکی نے کر لیا، اور وہ بھی بڑی کامیابی کے ساتھ!

وہ دیول دیوی سے اس وقت کچھ متنغض بھی تھا۔ وہ اپنی کامیابی اور اس کی ناکامی کو بار بار

مختلف فقروں اور جملوں سے نمایاں کر رہی تھی، آخر اس کی کیا ضرورت تھی، ـــــــ!

لیکن یہ باتیں ایسی نہ تھیں جنہیں زبان پر لایا جا سکتا۔ یہ صرف دل ہی میں رہ سکتی تھیں

اس کنجِ قفس سے باہر نہیں نکل سکتی تھیں!

دیول دیوی بے انتہا تھکی ہوئی اور نڈھال ہونے کے باوجود اس وقت بہت خوش تھی

نے بہت بڑا معرکہ سر کیا تھا، اور اسی تناسب سے گوبند پرشاد کو اپنی شکست پر افسوس تھا!

جب دیول دیوی اپنا قصیدۂ فخریہ جی بھر کر سنا چکی تو راجکمار نے کہا:۔

"راجکماری بہت دیر ہو گئی ہے، اور محل پہنچتے پہنچتے رات ہو جائے گی، اب چلو!"

دیول دیوی:۔ "ہاں یہی میں بھی سوچ رہی ہوں۔ لیکن نہ راد ھا کا پتہ ہے نہ محافظوں کا

گوبند پرشاد :"وہ راستہ میں مل جائیں گے — نہ بھی ملیں تو ہم لوگ تو وقت پر پہنچ جائیں گے!"

دیول دیوی :"لیکن راستہ معلوم ہے آپ کو؟ — ہم کہاں ہیں، یہ مجھے بالکل نہیں معلوم!"

گوبند پرشاد :"یہ تو بڑی بڑی بات ہوئی! پھر کیا ہوگا؛ اب کیا کیا جائے؛ میں تو نہیں جا رہا ہوں راستہ!"

دیول دیوی :"یہی تو میں بھی سوچ رہی ہوں، آپ ہی بتلائیے کچھ؟"

گوبند پرشاد :"کیا بتاؤں؛ میں تو بالکل ناواقف ہوں اس راستے سے! — لیکن تم تو آتی رہتی ہو سیر و شکار کو — ؟"

دیول دیوی :"آتی تو رہتی ہوں، لیکن ہر مرتبہ کسی نئی جگہ — اور شروع میں جہاں ہم نے ڈار دیکھی تھی، وہاں سے تو راستہ کسی نہ کسی طرح معلوم کر لیتی، لیکن اب تو ہم بہت آگے نکل گئے ہیں۔ رات بھی ہو چلی ہے، بالکل عقل کام نہیں کرتی۔ ہم کہاں ہیں اور ہمیں کدھر جانا چاہیے — ؟"

گوبند پرشاد :"کہہ رہا تھا، ضد نہ کرو۔ لیکن تم کب سنتی ہو کسی کی، یہ سب ان کمبخت ہرنوں کا کیا ہوا ہے۔ جی چاہتا ہے مار ڈالوں، دونوں کو — !"

دیول دیوی :"ان کے مارنے سے اگر راستے کا پتہ چل جائے تو میں تیار ہوں، — مجھے تو ڈر لگ رہا ہے!"

گوبند پرشاد :"لیکن یہاں کھڑے رہنے سے بھی تو راستہ نہیں ملے گا، کسی نہ کسی طرف چلنا بہرحال چاہیے!"

دیول دیوی :"چلئے، — لیکن بھٹک کر اگر کسی اور غلط راستے پر پڑ گئے تو نہ جانے کہاں نکلیں جا کر، دوست کی سرحد پر یا دشمن کی سرزمین پر؟ دوست ہوا جب تو کوئی بات نہیں، اور دشمن ہوا تو جان کی خیر نہیں!"

گوبند پرشاد۔ "دشمن ؟ ـــــــ یہاں دشمن کون ہوسکتا ہے آپ کا ؟"

دیول دیوی۔ "یہ بھی خوب کہی، دوست دشمن سب کے لگے رہتے ہیں، خاص طور پر راجہ پالالم تو پتا جی کا جانی دشمن ہے، اور اس کی سرحد اس طرف ہے کہیں، اور اگر ہم کہیں اس کے پنجے میں آ گئے تو مجھے اپنی جان کی تو پروا نہیں آپ مفت میں مارے جائیں گے۔ وہی مثل ہوئی، گیہوں کے ساتھ گھن بھی پسا !"

گوبند پرشاد۔ "تم سمجھتی ہو میں آسانی سے مر جاؤں گا ؟ ــــــ بہتوں کے سر کاٹ لوں گا تب کوئی میرا سر کاٹ سکے گا !"

دیول دیوی۔ (سہم کر) "آپ مرد ذات ہیں، آپ تو دفعتی یہ کریں گے۔ میں ٹھہری عورت، میں کیا کروں گی ؟"

گوبند پرشاد۔ "کیسی باتیں کر رہی ہو راجکماری ؟ جب تک میں زندہ ہوں، کوئی ہاتھ لگا سکتا ہے تمہیں ــــ ؟ خون کی ندیاں بہا دوں گا !"

دیول دیوی۔ "میرے لئے ؟ ــــــ میری خاطر ؟ ؟ ــــــ مجھے بچانے کے لئے ؟ ؟ ؟"

گوبند پرشاد۔ "اور کس کے لئے ؟ کس کی خاطر ؟ ــــــ وقت آنے دو پھر دیکھ لینا، جھوٹ کہتا تھا یا سچ ؟"

دیول دیوی۔ "بھگوان ایسا وقت نہ لائے، میرا تو اس خیال سے دل ہولتا ہے، ــــــ دیکھئے کچھ لوگ آ رہے ہیں سرپٹ گھوڑے دوڑاتے ہوئے ؟ ــــــ شاید رادھا وغیرہ اور ہمارے محافظ سوار ہیں، نہ جانے کہاں کہاں ڈھونڈا ہوگا ہمیں ؟ ــــــ انعام دوں گی سب کو ــــــ !"

گوبند پرشاد۔ "ہاں غالباً وہی ہیں ! ــــــ قریب آ گئے اب تو !"

اتنے میں پندرہ بیس سوار گھوڑے دوڑاتے ہوئے آئے، اور ان دونوں کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ دیول دیوی نے چپکے سے گوبند پرشاد سے کہا:۔

"یہ تو کوئی اور لوگ معلوم ہوتے ہیں، ہمارے سوار تو نہیں ہیں!"

گوبند پرشاد نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اتنے میں ان سواروں میں سے ایک آگے بڑھا اور اس نے کڑک کر تحکمانہ لہجہ میں کہا:۔

"تم لوگ کون ہو، اور یہاں ایسے ناوقت کیا کر رہے ہو ——— ؟"

نہ دیول دیوی نے کوئی جواب دیا، نہ گوبند پرشاد نے۔

وہ سوار اب کی ذرا غصہ سے بولا:۔

"بتاؤ ——— ورنہ میرا کوڑا چلتا ہے اور پھر اگر ضرورت ہوئی تو تلوار بھی!"

گوبند پرشاد کی گھگھی بندھی ہوئی تھی۔ دیول دیوی نے حوصلے سے کام لیا:۔

"میں ہوں دیول دیوی ———!"

سوار۔ "دیول دیوی کون؟ ——— بگلانہ کے راجہ کرن رائے کی بیٹی!؟"

دیول دیوی۔ "ہاں ہاں وہی، ——— میں ہوں دیول دیوی، راجہ کرن رائے کی راجکماری!"

سوار نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور اپنے ایک ساتھی سے مخاطب ہو کر کہا:۔

"واہ بھئی، بڑے اچھے وقت گھر سے نکلے تھے، راجکمار پالما لم جس دیول دیوی کے عشق میں جان دے رہے ہیں وہ یہی ہے۔ دوستو اسے پکڑ لو اسے لے چلو، ہیرے جواہرات سے دامن بھر دیا جائے گا تمہارا!"

پھر وہ دیول دیوی سے مخاطب ہوا:۔

"چلو دیول دیوی ہمارے ساتھ چلو، راجکمار تمہارے ساتھ بیاہ رچائے گا، ریاست بھر میں

جشن منایا جائے گا، بڑے سُکھ اور آرام سے رہو گی وہاں!"

دیول دیوی: "میں نہیں جاتی —— میں اس سے شادی نہیں کروں گی!"

سوار: "ارے واہ کیسے نہیں کرو گی؟ —— کیوں نہیں جاؤ گی؟ چلنا پڑے گا!"

دیول دیوی: "میری منگنی ہو چکی ہے۔ میں ایک کے دامن سے بندھ چکی ہوں!"

سوار: "اوہو! پھر تو ہم ہرگز تمہیں نہیں چھوڑ سکتے —— تمہیں چلنا پڑے گا ہمارے ساتھ!"

دیول دیوی: (روکر) "میں نہیں جاؤں گی، کسی طرح نہیں جاؤں گی!!!"

سوار: "چلنا پڑے گا تمہیں، —— ہمارے ساتھ چلو، ہم وعدہ کرتے ہیں راجکمار تمہیں ہاتھ بھی نہیں لگائے گا!"

دیول دیوی: "پاپیو! پھر مجھے کیوں لئے جا رہے ہو؟"

سوار: "ہمارا راجکمار بڑا بہادر ہے۔ ہم جا کر تمہارے منگیتر کو اطلاع دیں گے کہ تم گرفتار کر لی گئی ہو۔ اگر وہ چاہے تو لڑ کر ہمارے راجکمار سے تمہیں چھین لے —— ہمارا راجکمار اکیلا لڑے گا تمہارے منگیتر سے، یہ ہمارا قول ہے!"

دیول دیوی: (گوبند پرشاد سے) "سُن رہے ہو، یہ تم سے لڑنے کو کہہ رہے ہیں؟"

سوار: "کیا یہی تمہارا منگیتر ہے؟ —— یہ؟"

دیول دیوی: "ہاں یہی، —— راجکمار گوبند پرشاد! یہ بھی راجکمار ہے!"

سوار: "اچھا اچھا، یہ ہیں راجکمار گوبند پرشاد؟ نام تو سُنا ہے ان کا، —— تو راجکمار صاحب، پھر چلئے ہمارے ساتھ، اگر آپ جیت گئے تو راجکماری دیول دیوی کو اپنے ساتھ لیتے آیئے گا، اور اگر ہار گئے تو پھر مجبوری ہے، اچھا ہوا آپ یہیں مل گئے۔ ہمیں آپ کے پاس نہیں جانا پڑا۔ آیئے اُٹھیئے، بس اب دیر نہ کیجئے، رات بڑھ رہی ہے —— !"

دیول دیوی:" تم جاکر اپنے راجکمار کو یہیں بُلا لاؤ، ہم نہیں جاتے، ہم کیوں جائیں؟"

سوار:- "اچھا یہ کیجئے ہمارے راجکمار کو چھوڑیئے، یہ راجکمار گوبند پرشاد اکیلے مجھ سے لڑلیں — ساتھیو! خبردار تم بیچ میں نہ بولنا، ——— اگر یہ جیت گئے تو آپ شوق سے ان کے ساتھ چلی جایئے، اور اگر یہ ہار گئے تو پھر آپ کو بے شک ہمارے راجکمار سے شادی کرنا پڑے گی، — کہیئے یہ تو منظور ہے؟"

دیول دیوی:" ہاں یہ منظور ہے، ہم وہاں نہیں جائیں گے، یہاں جس کا جی چاہے راجکمار سے لڑلے، میں بھی وعدہ کرتی ہوں، اگر وہ جیت گیا تو اس کے ساتھ چلی جاؤں گی!"

سوار:- "بس تو پھر دیر کیا ہے؟ آیئے راجکمار صاحب، دو دو ہاتھ ہو جائیں ہمارے آپ کے ——— اوہ آپ گھوڑے پر سوار نہیں ہیں، میں بھی اترا جاتا ہوں، ——— مقابلہ برابر کا ہونا چاہئے ——— آیئے!"

یہ کہہ کر وہ سوار گھوڑے سے اُترا اور گوبند پرشاد کے بالکل سامنے تلوار سونت کر کھڑا ہو گیا۔

سوار:" راجکمار صاحب نکال لیجئے تلوار میان سے، ——— میں آپ کے ساتھ ایک رعایت اور کرتا ہوں۔ پہلے آپ وار کیجئے، اگر بچ گیا تو میں پھر وار کروں گا، ——— اب تو آپ کو کوئی عذر نہیں ہے؟"

دیول دیوی:" ہاں کوئی عذر نہیں ہے، ——— منظور ہے، بالکل منظور ہے!"

سوار:" لیکن میں آپ سے تو لڑنا نہیں چاہتا، لڑنا تو راجکمار سے ہے، آپ بول رہی ہیں ان کی طرف سے اور یہ خاموش ہیں!"

پھر سوار نے گوبند پرشاد سے کہا:-

"بتایئے کیا ارادہ ہے آپ کا؟ لڑنا ہے تو تلوار نکال لیجئے میان سے!"

گوبند پرشاد - (لرزتی ہوئی آواز سے) "لیکن میری منگنی تو ابھی راجکماری سے نہیں ہوئی ہے ــــ!"

سوار زور سے ہنس پڑا - اُس نے کہا:-

"کیا کہا آپ نے؛ ابھی آپ کی منگنی نہیں ہوئی ہے راجکماری سے! کیوں راجکماری صاحبہ! آپ جھوٹ بول رہی تھیں؛ ــــــ بس اب باتیں ختم، چلئے چپ چاپ ہمارے ساتھ!"

دیول دیوی نے بڑی بے بسی سے گوبند پرشاد سے پوچھا:-

"تو کیا میں چلی جاؤں؛ ــــ راجکمار میں چلی جاؤں ان کے ساتھ؟"

گوبند پرشاد - "میں کیا کہہ سکتا ہوں، فیصلہ بہر حال تم ہی کو کرنا ہے، جو مناسب سمجھو کرو۔"

سوار - "اب باتوں کا وقت نہیں ہے - معاملے کا تصفیہ ہو گیا، راجکماری آپ جھوٹ بولیں، خواہ مخواہ راجکمار کو پھانس رہی تھیں - وہ تو کہئے خود راجکمار نے آپ کے جھوٹ کا بھانڈا عین چوراہے پر پھوڑ دیا، ــــ آئیے ــــ!"

دیول دیوی - "نہیں، میں نہیں جاؤں گی، ہرگز نہیں جاؤں گی ــــ!"

سوار - "تو ہمیں زبردستی کرنا پڑے گی، گستاخی معاف ــــ!"

دیول دیوی - "مار ڈالو، لیکن تم نہیں لے جا سکتے، ہاں میری لاش کو لے جا سکتے ہو!"

سوار - "توبہ کیجئے، مریں آپ کے دشمن، آپ چلیں گی بالکل اسی طرح (بندھے ہوئے ہرنوں کی طرف اشارہ کر کے) جیسے یہ، ــــ!"

دیول دیوی - "ناممکن ــــ قطعاً ناممکن، یہ نہیں ہو سکتا، یہ نہیں ہو گا!"

سوار نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، لپک کر دیول دیوی کا ہاتھ پکڑ لیا زور سے، اور کہا:-

"یہ سختی کی ابتدا ہے، اس سے زیادہ سختی کرنے پر مجبور نہ کیجئے، بس چپ چاپ چلی چلئے!"

دیول دیوی نے گوبند پرشاد کی طرف حسرت سے دیکھا اور کہا:-

"راجکمار! یہ مجھے پکڑے لئے جاتے ہیں، بچایئے! بچا لیجئے مجھے!!"

سوار: "راجکمار صاحب! آپ ٹھنڈے ٹھنڈے جایئے، —— ہم آپ سے اب کوئی تعرض کرنا نہیں چاہتے۔ راجہ کرن رائے کو بتا دیجئے گا، راجکماری خیریت سے ہیں"۔ — دیکھئے، یہ داہنی طرف جو راستہ نظر آرہا ہے، اس پر ایک میل چلنے کے بعد بائیں طرف مڑ جایئے گا۔ بس وہ سیدھا راستہ بنگلانہ کلاں ہے —— چلو راجکماری!"

یہ کہہ کر وہ راجکماری کو گھوڑے پر بٹھا کر اپنے ساتھیوں سمیت جدھر سے آیا تھا، اُدھر چلا گیا، اور گوبند پرشاد کچھ نہ کر سکا!

آزمائش میں شکست

راجکماری دیول دیوی کی فریاد و فغاں کی دردناک صدا، سناٹے میں بڑی دیر تک گونجتی رہی۔ پھر راجکمار گوبند پرشاد غم و الم کا پیکر بنا تن تنہا اس راستہ پر چل پڑا، جو راجکماری کو اغوا کرنے والے سوار نے بتایا تھا۔ اندھیرا اور بڑھ گیا تھا۔ راستہ پہلے بھی سنسان تھا۔ اب اور زیادہ ہو گیا تھا۔ پتہ کھڑکتا تھا اور راجکمار کا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا تھا۔ لیکن وہ ہمت سے کام لے کر برابر آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ کوئی ایک میل چلنے کے بعد جب وہ موڑ آیا جہاں سے اسے راستہ بدلنا تھا، تو پھر اس کے کانوں میں گھوڑوں کے ہنہنانے اور ان کے سرپٹ دوڑنے کی آوازیں آنے لگیں۔ جیسے جیسے یہ آواز قریب آتی جاتی تھی، ویسے ویسے بے چارے راجکمار پر دہشت طاری ہوتی جاتی تھی۔ رات کا وقت، اندھیرا گھپ، منزل نامعلوم، فضا خطرات سے بھری ہوئی، ایسے موقعوں پر بڑے سے بڑے جیالے کا دل کانپ جاتا۔ راجکمار تو پھر راجکمار تھا۔ اس کے دل میں طرح طرح کے اندیشے اور وسوسے پیدا ہو رہے تھے۔ کہیں یہ وہی لوگ نہ ہوں، جو ابھی راجکماری کو پکڑ لے گئے تھے۔

'یقیناً وہی ہیں!

لیکن واپس کیوں آرہے ہیں ؟

کیا مجھے پکڑنے کے لئے — !

یقیناً یہ مجھے گرفتار کریں گے، —— لیکن کیوں ؟

میں نے ان کا کیا بگاڑا ہے — ؟"

وہ یہی سوچ رہا تھا کہ وہ سوار بالکل قریب آگئے۔ اندھیرے میں وہ اُن کی صورت نہ پہچان سکا ان سواروں میں سے کسی نے درشتی کے ساتھ پوچھا :۔

"اے شخص! تو کون ہے ؟ —— کہاں جارہا ہے ؟"

اس آواز میں نسائیت تھی، اور یہ کچھ گوش آشنا بھی تھی، —— "کون ہوسکتی ہے یہ عورت ؟ ضرور یہ رادھا ہے ؟" لیکن راجکمار نے بحث میں پڑنا مناسب نہ سمجھا ۔اس نے بڑی سنجیدگی اور متانت کے ساتھ کہا :۔

"میرا نام راجکمار گوبند پرشاد ہے —— !"

یہ سنتے ہی رادھا گھوڑے سے اُتری اور اس کے بالکل قریب آگئی ۔اس نے تاریکی میں اس کی صورت دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا :۔

"راجکمار آپ ؟ —— اور راجکماری کہاں ہیں ؟ ہم تو ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گئے، سارا علاقہ چھان مارا لیکن پتہ نہ چلا ۔اب مایوس ہوکر واپس جا رہے تھے۔ دل میں ڈرتے ہوئے کہ دیکھیں وہاں جاکر کیا گت بنتی ہے ۔ راجہ اور رانی صاحبہ مار ہی ڈالتے ہم سب کو خالی ہاتھ کرا بھلا اس سے بڑھ کر بھی کوئی اندھیر ہوسکتا تھا کہ بغیر راجکماری کے واپس ہوں —— خیر بھگوان کا شکر ہے ملاقات راستہ میں ہوگئی !"

گوبند پرشاد خاموشی سے رادھا کی یہ لمبی چوڑی تقریر سنتا رہا، اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

رادھا کو حیرت ہوئی۔ اس نے پھر پوچھا:۔

"راجکمار! آپ بولتے کیوں نہیں —— چپ چاپ کیوں ہیں؟"

گوبند پرشاد (سر کھجاتے ہوئے) "نہیں کوئی خاص بات نہیں، یونہی!"

رادھا:۔ "راجکماری کو کہاں چھوڑ آئے؟ —— کیا پیچھے رہ گئیں وہ ——؟"

گوبند پرشاد:۔ "وہ تو میرے ساتھ نہیں ہیں!"

رادھا۔ (گھبرا کر) "ہائے رام تو پھر کہاں ہیں وہ؟ کہاں گئیں؟ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

گوبند پرشاد:۔ "میں نہیں جانتا وہ کہاں ہیں!"

رادھا:۔ "لیکن آپ دونوں ساتھ ساتھ ہی تو تھے؟"

گوبند پرشاد:۔ "ہاں تھے تو، لیکن وہ اپنے ہرنوں کے تعاقب میں کچھ اس طرح سرگرداں ہوئیں، کہ آنکھوں سے اوجھل ہو گئیں۔ جب سے اب تک ڈھونڈ رہا ہوں، مگر کیا مجال جو کہیں سراغ لگا ہو، —— مجھے خود حیرت اور فکر ہے، اب کیا کیا جائے؟"

رادھا:۔ "یہ آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں؟ —— میں کیا بتا سکتی ہوں، آپ ہی سوچئے!"

گوبند پرشاد:۔ "تمہارے ساتھ کتنے سپاہی ہیں، یعنی مرد؟"

رادھا:۔ "سات آٹھ —— گن لیجئے آپ خود۔"

گوبند پرشاد:۔ "بالکل ناکافی —— بہت کم —— یہ کیا مقابلہ کر سکیں گے تیس چالیس آدمیوں کا ——؟"

رادھا:۔ "تیس چالیس آدمیوں کا؟ —— مقابلہ؟ —— یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ کیا مڈبھیڑ ہو گئی تھی کسی سے؟"

گوبند پرشاد:۔ "مڈبھیڑ کس سے ہوتی؟ میرا مطلب یہ تھا کہ اگر کہیں دشمن کے آدمی مل جائیں، تو

وہ تیس چالیس سے ہرگز کم نہ ہوں گے۔ تم لوگ ٹھہریں عورت ذات اسپاہی ہیں صرف سات آٹھ۔
یہ کیا مقابلہ کر سکیں گے؟ — لہٰذا میری رائے یہ ہے کہ دیول دیوی کی تلاش بے سُود ہے۔"

رادھا: "یہ آپ کیسے کہہ رہے ہیں؛ —— ان کے بغیر ہم راج محل کا رُخ کس طرح کر سکتے ہیں؛ اور اگر کر بھی لیں، تو کیا ہم سب کی شامت نہ آجائے گی؟ آپ تو ٹھہرے راجکمار، بچ جائیں گے۔ ہماری جان کی خیر نہیں —— چلئے ڈھونڈیئے، —— !"

گوبند پرشاد: "تم بیوقوف ہو بالکل، —— راجکماری کب کی پہنچ چکی ہوں گی راج محل!"

رادھا: "یہ آپ نے کیسے جانا؟"

گوبند پرشاد: "بھگوان (خدا) کو دیکھا نہیں تو کیا عقل سے بھی نہیں پہچانا؟ اگر راج محل نہیں گئیں تو کہاں ہیں پھر؟ — کیا کوئی اغوا کر لے گیا انہیں؟"

رادھا: "ہے ہے راجکمار! ایسی بُری بات اس طرح بھر مُنہ نہ کہئے! —— اگر ایسا ہوا، تو وہ رو رو کر مر جائیں گی۔ آپ نہیں جانتے، میں تو اُن کی رازدار اور ہمدرد سہیلی ہوں، وہ آپ سے پریم کرتی ہیں، چاہتی ہیں آپ کو گھنٹوں اور پہروں آپ ہی کا ذکر کیا کرتی ہیں، آپ ہی کی باتیں کیا کرتی ہیں، آپ ہی کی کہانی کہا کرتی ہیں، آپ کی بہادری کے قصے، آپ کی دلیری کے افسانے، ان کی نظر میں آپ سے بڑھ کر جیالا کوئی مرد ہی نہیں، آپ کی بہادری پر انہیں اتنا بھروسہ ہے کہ کہہ رہی تھیں، —— بتاؤں راجکمار؟"

گوبند پرشاد: (چونک کر) ہوں —— ہاں بتاؤ!"

رادھا: "وہ کہہ رہی تھیں۔ میں پتا جی سے کہہ کر اپنا سوئمبر رچاؤں گی جس میں وہ تمام راجکمار بلائے جائیں گے جنہیں میری چاہت کا دعویٰ ہے۔ انہی راجکماروں میں ملیالم کا راجکمار بھی ہوگا جسے اپنی قوت اور طاقت پر بڑا ناز ہے، بڑا دعویٰ ہے اسے پریم کا، لیکن دیکھ لینا گوبند پرشاد اس سے

مجھے چھین لیں گے۔ وہ ہار جائے گا، اور راجکمار گوبند پرشاد میرے تمام چاہنے والوں کو نیچا دکھا کر مجھے چھین لے جائیں گے، میرا سر فخر سے اونچا ہو جائے گا! ——— بات یہ ہے راجکمار کہ ہماری راجکماری خود بھی بڑی ہمت والی اور بہادر ہیں۔ ان کا پتی (شوہر) بھی بہادر ہونا چاہئے، بالکل آپ کی طرح! ——— راجکمار آپ چپ چاپ کیوں ہیں؟ بھگوان کے لئے کچھ تو بولئے، کیا بات ہے، میرا دل ہول رہا ہے، چلئے راجکماری کو ڈھونڈ لائیں چل کر ——— !"

گوبند پرشاد:" بے وقوفی کی باتیں نہ کرو، دیول دیوی راج محل پہنچ چکیں یہاں نہیں ہیں!"

رادھا:" اور اگر وہاں نہ ملیں تو؟ ——— یہ بھی سوچ لیجئے اچھی طرح!"

گوبند پرشاد:" خوب اچھی طرح سوچ لیا ——— مجھے یقین ہے راجکماری یہاں نہیں ہیں!"

رادھا:" نہیں، وہ یہیں ہوں گی راجکمار ——— !"

اتنے میں پھر گھوڑوں کے ہنہنانے اور سرپٹ دوڑنے کی آوازیں آنے لگیں، رادھا سہم گئی۔ وہ گھوڑے سے اتر کر گوبند پرشاد کے پہلو میں آکر کھڑی ہو گئی اور کانپتی ہوئی آواز میں آہستہ سے اس نے کہا:۔

" یہ کون لوگ ہیں؟ دوست یا دشمن؟ ——— اگر دشمن ہوئے تو؟"

گوبند پرشاد نے کوئی جواب نہیں دیا، لیکن رادھا بڑی آسانی سے اس کے دل کی دھڑکن سن رہی تھی، اس جواب کے بعد کسی دوسرے جواب کی توقع بھی بیکار تھی!

اتنے میں وہ سوار بالکل قریب آگئے۔ راجکمار گوبند پرشاد نے ذرا سختی سے رادھا کو پرے دھکیلتے ہوئے کہا:۔

" چڑھی کیوں آتی ہو، دور ہٹ کر کھڑی ہو، ——— نہ جانے یہ کون لوگ ہیں اور کیا سمجھیں؟"

رادھا۔ (اور زیادہ قریب ہو کر) "نہیں راجکمار! مجھے ڈر لگ رہا ہے، مجھے اپنے پاس کھڑا رہنے دو! وہ لوگ کوئی بھی ہوں، مجھے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ میں عورت ہوں اور عورت خطرہ کے وقت مرد ہی کی پناہ لیتی ہے، ——— !"

اتنے میں وہ سوار جو بالکل نہیں پہچانے جا رہے تھے، اپنے اپنے گھوڑے سے اُتر پڑے، ان میں سے ایک سوار نے کہا:۔

"غالباً میں راجکمار گوبند پرشاد سے گفتگو کر رہا ہوں، !"

گوبند پرشاد کو آواز کی پہچان میں دیر نہیں لگی۔ یہ وہی سوار تھا جو دلول دیوی کو اغوا کر لے گیا تھا۔ اس کی آواز سُن کر راجکمار تھر تھر کانپنے لگا۔ اس نے لرزتی ہوئی آواز میں جواب دیا:۔

"ہاں میں راجکمار گوبند پرشاد ہوں!"

سوار:۔ "ہمیں افسوس ہے کہ ہم پھر آپ کو تکلیف دے رہے ہیں، ——— راجکماری دلول دیوی نے آپ کو بلایا ہے، ——— !"

گوبند پرشاد:۔ "مجھے بلایا ہے؟ ——— آخر کیوں؟ ——— کس لئے؟"

سوار:۔ "اُنہوں نے راجکمار پلمالم سے عہد لے لیا ہے کہ وہ راجکماری کو نظر بھر کر دیکھیں گے بھی نہیں، جب تک آپ سے لڑ کر فیصلہ نہ کر لیں!"

گوبند پرشاد:۔ "لیکن میں نہیں لڑنا چاہتا، ——— کیوں لڑوں آخر؟"

سوار:۔ "آپ راجکماری سے شادی کرنا نہیں چاہتے؟"

گوبند پرشاد:۔ "جو لڑکی غیر مردوں کے قبضہ میں ہو، اس کو میں اتنا پوتر (مقدس) نہیں سمجھتا کہ اس کے لئے دوسروں سے جان کی بازی لگا دوں، ——— !"

سوار:۔ "لیکن وہ تو جاتے وقت آپ کا دامن پکڑ کر کھینچ رہی تھیں، آپ ہی نے تو جھٹک دیا تھا"

اور ہمارے حوالے کر دیا تھا!"

گوبند پرشاد: "اچھا یہی سہی ——— میرا راستہ چھوڑیئے۔ مجھے جانے دیجئے۔ میں نہ راجکماری سے محبت کرتا ہوں، نہ ان سے شادی کرنا چاہتا ہوں، نہ ان کا منگیتر ہوں۔ میرا ان کا کوئی رشتہ نہیں ہے —!"

سوار: "تو ہم یہی جاکر کہہ دیتے ہیں ——؟"

گوبند پرشاد: "شوق سے، ——— ضرور کہہ دیجئے! کہئے تو لکھ دوں؟"

اتنے میں سوار نے حکم دیا۔ "مشعلیں جلاؤ!"

آن کی آن میں مشعلیں جل گئیں، اور ان سواروں کے بیچ سے مسکراتی ہوئی دیول دیوی نکلی۔ وہ گوبند پرشاد کے سامنے آئی۔ جھک کر آداب کیا اور کہا:۔

"مجھے آپ نے پہچانا؟ —— میں ہوں دیول دیوی۔ آزمائش میں آپ اس بُری طرح ہاریں گے، اس کا مجھے وہم و گمان بھی نہ تھا! —— اچھا ہوا آپ کی قلعی کھل گئی۔ ہم لوگ راج محل جاتے ہیں۔ میرے سواروں میں سے دو سوار آپ کی حفاظت کریں گے اور آپ کی راجدھانی تک پہنچا دیں گے آپ کو! —— دیکھئے وہ راستہ ہے آپ کا ——!"

یہ کہہ کر وہ گھوڑے پر بیٹھی۔ رادھا نے ایک قہقہہ لگایا اور گھوڑے پر بیٹھتے بیٹھتے کہا:۔

"دھن ہو راجکمار آپ کی، ——— واقعی بڑے بہادر ہیں آپ؟"

دیول دیوی نے رادھا کو ڈانٹا: "خبردار! —— خاموش!!"

وہ خاموش ہو گئی اور دیول دیوی نے گھوڑے کو ایڑ لگائی، اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ راج محل کی طرف روانہ ہو گئی۔ دو سوار رہ گئے، یہ راجکمار گوبند پرشاد کو اپنی حفاظت میں لے کر اس کی راجدھانی کی طرف بڑھ رہے تھے، اور راجکمار بالکل خاموش تھا، جیسے اسے سانپ سونگھ گیا ہو! ———— !

توبہ!

خوارزم شاہی حکومت کا خاتمہ کرنے کے بعد تاتاری (مغل) اب صحرائے گوبی کے ناتراشیدہ اور غیر مہذب لیکن جاں باز سپاہی نہیں رہ گئے تھے۔ ان کے حدودِ سلطنت میں غیر معمولی توسیع ہو گئی تھی۔ وہ اب ماوراء النہر سے لے کر خراسان و افغانستان تک فرماں روائی کر رہے تھے۔ ان کی نصیب شمشیر سے ایک زمانہ کانپتا تھا۔ اُنہوں نے تلوار میان سے نکالی اور ملک پر ملک فتح کرتے چلے گئے۔ جو اُن کے سامنے آیا، ادھ موا ہوا۔ جس نے مقابلہ کیا، شکست کھائی۔ جس نے مدافعت و مزاحمت کا ارادہ کیا اسے جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ خوارزم شاہ نے بڑی بیداری اور حوصلہ سے اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن ہمت و استقامت کے باوجود حالات ایسے تھے کہ وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کی ناکامی نے تاتاریوں (مغول) کے لئے راستہ کھول دیا۔ اور وہ طوفان گرد و باد کی طرح تیزی سے آگے بڑھتے رہے۔ حد یہ ہے کہ اُنہوں نے بغداد تک کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ لیکن کوئی ان کا بال بیکا نہ کر سکا۔ کسی میں یہ جرأت نہ پیدا ہوئی کہ میدان میں آتا اور للکارتا۔ اِن کامیابیوں نے تاتاریوں کے حوصلے بڑھا دیئے اور وہ جہانگیری کے خواب دیکھنے لگے۔ صرف ایک ہندوستان ان کی ترکتازیوں سے بچا ہوا تھا۔ لیکن یہ بادل اب بھات

پر بھی منڈلانے لگا۔

حالات کے ساتھ ساتھ تاتاریوں میں بھی انقلاب آگیا۔ اب یہ وہ تاتاری نہ تھے، جو اسلام کے دشمن تھے، مسلمانوں کے خون کے پیاسے تھے، جوع الارض کے مرض میں مبتلا تھے، تہذیب و تمدن سے ناآشنا تھے۔ ثقافت و حضارت کو منہ چڑاتے تھے، اب یہ کافی بدل چکے تھے، مسلمانوں کو قتل کرتے کرتے جب تھک گئے تو اسلام سے مانوس ہونے لگے۔ ان کی بڑی تعداد نے اسلام قبول کر لیا۔ اب یہ تہذیب و تمدن کے دشمن بھی نہیں تھے۔ یہ خود ایک نئی تہذیب پیدا کر رہے تھے اور وقت کی تہذیب و ثقافت سے خود کو آشنا کر رہے تھے۔ لیکن بایں ہمہ ان کی تنک مزاجی میں، تند خوئی میں، خون آشامی میں، ہوسِ ملک گیری میں، جذبۂ جوع الارض میں کسی قسم کی کمی نہیں آئی تھی۔ یہ مسلمان ہونے کے بعد بھی اتنے ہی سنگدل اور سفاک تھے جتنے کہ پہلے تھے۔ یہ تہذیب آشنا ہونے کے باوجود اتنے ہی خونخوار، وحشی اور درندہ صفت تھے جتنے پہلے تھے۔ میدانِ جنگ کی خونریزیاں انہیں ایوان و قصور کے رقص و نغمہ سے زیادہ عزیز تھیں۔ انہیں بزمِ طرب اور محفلِ عیش و نشاط میں وہ لطف نہیں آتا تھا، جو تلوار کی جھنکار، نیزے کی چمک، اور توپ کی گرج میں آتا تھا۔ حسین اور خوش گلو، سحر طراز اور مخمور چشم نازنینوں کے جمگھٹ سے یہ لطف لیتے تھے لیکن صرف اس وقت تک جب تک جنگ کے میدان سے بلاوا نہ آجائے۔ یہ بلاوا ملتے ہی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر دیوانوں کی طرح لڑائی کے میدان میں پہنچتے تھے اور وہاں پہنچنے کے بعد پوری یکسوئی اور کامل استغراق و انہماک کے ساتھ قتل کرتے تھے، قتل ہوتے تھے، زخم پہنچاتے تھے، زخم کھاتے تھے۔ گردنیں کاٹتے تھے گردنیں کٹواتے تھے۔ جنگ کے میدان سے واپس آنے کے بعد مال و منال، ساز و سامان، سونے اور چاندی کا ڈھیر دیکھ کر یہ اتنے خوش نہیں ہوتے تھے، جتنی مسرت انہیں کٹی ہوئی گردنوں کا تودہ نہیں ٹیلہ بلکہ مینار دیکھ کر ہوتی تھی۔ فتح یابی اور کامرانی کا معیار یہ نہیں تھا کہ مال کتنا ملا؟ بیرا اور صرف یہ تھا

کہ کٹی ہوئی گردنوں کا مینار کتنا اونچا تھا؟ ——— یہ جذبہ کیوں نہ ہوتا۔ آخر چنگیز اور ہلاکو انہی کے تو اجداد تھے! ——— اور انہیں اپنے اسلاف و اجداد پر فخر تھا۔ یہ چاہتے تھے جو کچھ چنگیز کر گزرا ہے، اس سے زیادہ کارنامے ان کی شمشیرِ خارا شگاف و بے نیام سے ظہور میں آئیں۔ رحم، مروت، یہ سارے الفاظ اُن کے لئے بے معنی تھے، یہ صرف ایک ہی اصول کے قائل تھے، ——— جنگ اور اس وقت تک جنگ، جب تک دشمن کا ایک ایک فرد ہلاک نہ ہو جائے، جب تک لاشوں کا ڈھیر بلندی میں آسمان سے باتیں نہ کرنے لگے۔ جب تک تراشی ہوئی گردنوں کا مینار اپنی رفعت میں ثریا تک نہ پہنچ جائے!

تاتاریوں کی ان بے اماں کارروائیوں اور وحشت انگیزیوں نے ان کا رعب ساری دُنیا پر بٹھا رکھا تھا، وہ جس ملک کو فتح کرنے کا ارادہ کرتے تھے، وہ بغیر کسی بڑی جنگ کے ہتھیار ڈال دیتا تھا۔ عافیت اسی میں سمجھتا تھا کہ شکست قبول کر لے، اور اگر کسی قیمت پر جان بچا سکتا ہے تو بچا لے۔ ان کے حدودِ مملکت اب بہت وسیع ہو چکے تھے۔ لیکن اس توسیع پر وہ قانع نہیں تھے۔ وہ اس طویل و عریض خطۂ ارض کا کوئی گوشہ ایسا نہیں دیکھنا چاہتے تھے، جہاں اُن کی حکومت نہ ہو، جہاں اُن کا پرچم نہ لہرا رہا ہو، جہاں کے باشندے اُن کا نام سن کر خوف و دہشت سے کانپنے نہ لگیں!

ہندوستان آج سے نہیں ہمیشہ سے سونے کی چڑیا ہے، یہی وجہ ہے کہ سکندرِ اعظم کے وقت سے لے کر سکندرِ ثانی[1] کے وقت تک غیر اور اجنبی ممالک کے فاتح اور کشور کشا بڑی بڑی فوجیں لے کر اس ملک پر حملہ آور ہوئے، اور بے اندازہ مال و دولت لے کر یہاں سے واپس چلے گئے۔

---

[1] شروع میں علاءالدین خلجی اپنے پیہم اور مسلسل فتوحات کے باعث اپنے آپ کو فرستادۂ خدا سمجھنے لگا۔ پہلے تو اس نے علیم بالغیب سمجھ کر ایک نئے مذہب کی داغ بیل ڈالنا چاہی لیکن جب بعض وفادار اور دور اندیش لوگوں کے سمجھانے سے اس ارادہ سے باز آیا، تو اپنے آپ کو سکندرِ ثانی کہلانے لگا، اور ساری دُنیا کو فتح کر لینے کی اسکیمیں بنانے لگا، اور کوئی شبہ نہیں، وہ اپنی خداداد صلاحیتوں، ہمت، بہادری، شجاعت، تدبر، دور اندیشی اور اولوالعزمی کے اعتبار سے سکندرِ اعظم سے بڑھا ہوا تھا۔ اس کے کارنامے سکندر سے کہیں زیادہ شاندار تھے۔

ہندوستان کی اہمیت، اس کی عظمت، اس کی بے اندازہ دولت، اس کی وسعت اور اس کی کشش تاتاریوں کو بار بار اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ وہ کئی مرتبہ ہندوستان کی سرحد تک پہنچے، اور لوٹ مار کر کے بے اندازہ دولت لے کر واپس چلے گئے۔ اندرونِ ہند میں قدم رکھنے اور سارے ہندوستان کو فتح کر لینے کی ہمت نہ پڑی، یا حالات ایسے پیش آتے کہ اس ارادہ کو کسی دوسرے موقع کے لئے ملتوی کر کے واپس ہو گئے!

اب ہندوستان پر سلطان علاء الدین خلجی کا پرچم لہرا رہا تھا۔ یہ اپنی اولوالعزمی، بہادری اور فراست کے لحاظ سے عجیب و غریب بادشاہ تھا۔ ایسا منچلا، بات کا دھنی اور دُھن کا پکا بادشاہ اب تک اس سرزمین کو میسّر نہیں آیا تھا۔ علاء الدین خلجی سے بہت پہلے مسلمانوں کے قدم یہاں پہنچ چکے تھے لیکن شمالی ہند سے آگے کسی کو قدم بڑھانے کا یارا نہ ہوا تھا۔ یہ صرف علاء الدین خلجی تھا جو دکن کے دُور دست علاقے تک بادل کی طرح گرجتا اور بجلی کی طرح چمکتا، اور سیلِ رواں کی طرح رواں دواں پہنچا۔ وہاں کے ہندو راجاؤں کو شکست دی، وہاں تک سلسلۂ مواصلات قائم کیا، اور دلّی میں بیٹھ کر نہ صرف دکن[1] بلکہ مالابار اور بنگال تک پہنچ گیا۔ اس نے راجپوتانہ اور دلّی کے آس پاس کے ان قلعوں کو سر کر لیا جن کے بارے میں یہ خیال عقیدہ بن چکا تھا کہ یہ ناقابلِ تسخیر ہیں۔ انہیں کوئی انسان سر نہیں کر سکتا۔ اس کی شہرت اور عظمت کا ڈنکا دُور دُور تک بج رہا تھا، اور سب اس کی فراست اور شجاعت کے قائل تھے وہ اگرچہ تقریباً ناخواندہ، ناتربیت یافتہ اور ناتراشیدہ تھا، لیکن تختِ حکومت پر بیٹھنے کے بعد اس نے ثابت کر دیا کہ وہ وقت کا بہت بڑا فاتح اور کشور کشا ہے۔ حکمرانی اور فرمانروائی کی خداداد صلاحیت اسے حاصل ہے، اور اس کے بل پر وہ اس شان سے حکومت کر سکتا ہے کہ کوئی اس کا حریف اور دشمن سامنے ٹھہرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

---

[1] تاریخ فرشتہ نے تفصیل سے بتایا ہے کہ علائی فوجیں نہ صرف مالابار بلکہ مالدیپ تک کے جزیروں پر قابض ہو گئی تھیں۔

پیہم فتوحات اور کامیابیوں نے اسے ایک حد تک عیش و عشرت کی طرف مائل کر دیا تھا۔ وہ بے فکری اور سرمستی کے عالم میں زندگی بسر کرنے لگا تھا۔ اسے یقین ہو چکا تھا کہ اب کوئی حریف میدان میں آنے اور اسے للکارنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اسے اپنے دست و بازو پر اعتماد تھا وہ جانتا تھا، اگر کسی غنیم نے سر اُٹھایا، تو جب چاہوں شراب کا پیالہ پھینک کر تلوار اُٹھا لوں اور غنیم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں۔ شراب مرغوب ترین مشروب تھا۔ وہ پانی کی طرح شراب پیتا تھا، اور ہر وقت نشہ میں چوُر رہتا تھا۔ پھر بھی اس کی دہشت اس طرح قائم ہو چکی تھی کہ تخریب پسند عناصر کو سر اُٹھانے اور اپنی زندگی کا ثبوت دینے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ گنہگار اس کے نام سے کانپتے تھے، اور وہ اطمینان و یک سُوئی سے تختِ حکومت پر متمکن تھا۔

لیکن حالات کو پلٹا کھاتے دیر نہیں لگتی، ——— !

ہاں یہ سچ تھا کہ اس نے سارے بھارت پر اپنے جلال کی دہشت قائم کر دی تھی۔ یہ بھی سچ تھا کہ اب کوئی غنیم اتنی ہمت نہیں رکھتا تھا کہ سرِ میدان اسے ٹوکنے کی جرأت کرتا۔ سب کے دم خم وہ ختم کر چکا تھا۔ سب سے پنجہ ملا چکا تھا، اور سب کی کلائی مروڑ چکا تھا۔ یہ تو ہو سکتا تھا، کہ غلط فہمی میں مبتلا ہو کر اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے کوئی راجہ یا مہاراجہ باغی ہو جائے، یعنی خراج دینے سے انکار کر دے، یا اطاعت کا جُوا گردن سے اُتار پھینکے۔ لیکن یہ ناممکن تھا کہ اس کی بادشاہت اور سطوت کو ختم کر سکے۔ اس کے مقابلہ میں آ ئے، اور جنگ کی دعوت دے سکے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ غمِ امروز اور فکرِ فردا سے بے نیاز ہو چکا تھا! ——— لیکن تاتاری تاک میں تھے۔ وہ اِس دیس کو فتح کر لینے کا منصوبہ عرصہ سے باندھ رہے تھے، اور اب فیصلہ کن اقدام کرنے کے لئے وہ نہ صرف ہندوستان میں وارد ہو چکے تھے، بلکہ گزشتہ دو ماہ سے دلّی کا محاصرہ کئے ہوئے تھے۔ یہ حملہ اُنہوں

نے اتنا اچانک کیا تھا کہ علاء الدین کو اس وقت پتہ چلا جب دلّی محاصرہ کی زد میں آگئی۔ اگر پہلے سے اس فتنہ کا اندیشہ ہوتا تو بہت ممکن تھا وہ مزاحمت کا ایسا انتظام کر لیتا کہ تاتاریوں کو کلّہ بہ کلّہ جواب دے سکتا۔ لیکن اس اچانک محاصرہ نے اسے پریشان اور حواس باختہ کر دیا۔ تاتاریوں کے محاصرہ کی شدّت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ انہوں نے نہ صرف دلّی کو اپنے محاصرہ میں لے لیا تھا بلکہ ہمّت یہاں تک بڑھ گئی تھی کہ شہر میں در آتے تھے، اور انبار خانہ سے غلّہ تک، جتنا چاہتے لے جاتے تھے ——!

علاء الدین بڑا باہمّت اور دلیر آدمی تھا۔ لیکن اس فوری محاصرہ نے اسے سراسیمہ اور متفکر کر دیا تھا۔ اسے ذرا بھی مہلت ملتی تو وہ مقابلہ کر سکتا تھا۔ لیکن اس طرح محصور ہو کر مقابلہ کرنا، اور اتنی بڑی فوج کو شکست دینا بظاہر ناممکن نظر آ رہا تھا۔

وہ اپنے دیوان خانہ میں بیٹھا تھا، —— ملول و متفکر، پریشان و مضطرب! حکّام وافسرانِ فوج بھی موجود تھے۔ مولانا مغیث الدین بھی تشریف رکھتے تھے۔ علاء الدین نے ان سب کو مخاطب کر کے کہا:-

"سمجھ میں نہیں آتا! اس طوفان کا کس طرح مقابلہ کیا جائے جس کی لہریں ہمارے قلعہ کی دیواروں سے ٹکرا رہی ہیں، ——؟"

یہ کہہ کر سلطان نے اپنے معتمد اور بہادر سپہ سالار ہزبر الدین ظفر خاں کی طرف دیکھا۔

ظفر خان نے سلطان کا منشا سمجھ لیا، اور کہا۔

"سلطان عالم پناہ! تاتاریوں کا لشکر اس سے بھی زیادہ ہو تو ہم اس کا مقابلہ کریں گے اور انہیں بتا دیں گے کہ ہم کیا ہیں؟ اور ہماری تلوار کی کاٹ کیسی ہے؟"

عین الملک، ایک دوسرے معتمد اور کوتوالِ شہر نے دست بستہ عرض کیا:-

"مشکل یہ ہے کہ شہر کے لوگ ہمت چھوڑ چکے ہیں، ان کی مایوسی دُور کرنا سب سے پہلا فرض ہے!"

علاء الدین خلجی نے تیوری پر بل ڈال کر پوچھا:۔

"کیوں، شہر والے کیوں مایوس اور پریشان ہیں؟ جب تک ہم زندہ ہیں، تم زندہ ہو۔ ظفر خاں اور الماس بیگ زندہ ہیں، اس وقت تک کیا شہر والوں پر کسی طرح کی آنچ آسکتی ہے؟ تم کیوں نہیں یقین دلا دیتے، انہیں کہ وہ ہر طرح محفوظ ہیں ——— ؟"

عین الملک: "جہاں پناہ! میں برابر اُن کا حوصلہ بلند رکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ لیکن وہ اپنی آنکھیں تو بند نہیں کر سکتے!"

علاء الدین خلجی: "ہم بھی یہ نہیں چاہتے کہ وہ اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن تم کیا کہنا چاہتے ہو، یہ ہم نہیں سمجھ سکے۔ وضاحت کرو اپنے قول کی!"

عین الملک: "پیر و مرشد! غلام کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ مغل (تاتاری) شہر میں گھس آتے ہیں، انبار خانے پر قبضہ کر لیتے ہیں۔ جتنا غلہ چاہتے ہیں لے جاتے ہیں ——— جب بغیر لڑے ہوئے ان کی دراز دستی اور خود اعتمادی کا یہ عالم ہے تو پھر جنگ کے بعد یا دورانِ جنگ میں وہ جو کچھ نہ کریں کم ہے؟ ——— اور ہماری حالت یہ ہے کہ بوتل کے پانی کی طرح بند ہیں۔ کیا مجال جو ایک قطرہ باہر ٹپک سکے!"

علاء الدین: (کچھ سوچتے ہوئے) "سُن رہے ہو ظفر خاں، عین الملک کیا کہتا ہے؟ ——— اور ہمارا خیال ہے وہ غلط تو نہیں کہتا کچھ؟"

ظفر خاں: "پیر و مرشد! وہ سچ کہتا ہے، اور اگر یہ محاصرہ چند روز اور جاری رہا، تو یہ معاملہ اتنا خوفناک اور بھیانک ہو جائے گا، جس کا اس وقت ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ لہٰذا ضرورت اور مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ جلد سے جلد ہم دشمن پر حملہ کر دیں۔ ہماری طرف سے حملے میں جتنی تاخیر ہو گی۔ دشمن

اتنا ہی مضبوط ہوتا جائے گا ــــــ!"

علاء الدین خلجی ۔" اتنا تو میں بھی جانتا ہوں، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہم حملہ کر سکتے ہیں؟ کیا ہماری تیاریاں اتنی مکمل ہیں کہ ہم دشمن کو سرِ میدان شکست دے سکیں؟"

ظفر خاں نے کچھ تامل کرتے ہوئے آہستہ آہستہ کہا۔

"سچ تو یہ ہے کہ نہیں۔ ایسا دشمن ہمارے سامنے ہے جس کے بارے میں ہم نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ اس طرح اچانک وہ نمودار ہوا ہے کہ ہم حفاظتِ خود اختیاری تک کا انتظام نہیں کر سکے، فوج اتنی زیادہ لایا ہے، اور محاصرہ اس سختی سے کیا ہے کہ ہمارے لئے ہاتھ پاؤں ہلانا ناممکن ہو رہا ہے، ــــــ یہ سب باتیں اپنی جگہ پر صحیح ہیں، لیکن ــــــ!"

علاء الدین خلجی ۔" ہاں کہو، رک کیوں گئے، کیا کہنا چاہتے ہو؟ ہم غور اور توجہ سے تمہاری باتیں سُن رہے ہیں، لیکن ــــــ!"

ظفر خاں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا:۔

"لیکن اگر ہم کفن سر سے لپیٹ کر میدان میں نہ اُترے۔ تو بلی اور چوہے کی طرح مار دیئے جائیں گے، اور اگر میدان میں کود پڑیں تو کم از کم بہادروں کی طرح لڑتے لڑتے تو مریں گے!"

علاء الدین خلجی ۔ (ایک لمبی سانس لیتے ہوئے)" تو یہ مطلب ہے تمہارا؟ ــــــ لیکن میرے بھائی میں اسے قطعاً پسند نہیں کرتا کہ گاجر اور مولی کی طرح اپنے وفا شعار، نڈر اور بہادر ساتھیوں اور سپاہیوں کو کٹا دوں، کیا تم یہ چاہتے ہو کہ ان سب کا خونِ ناحق میری گردن پر ہو؟"

ظفر خاں ۔" تو عالی جاہ، غلام کی سمجھ میں تو اس کے سوا کوئی صورت نہیں نظر آتی۔ آئندہ جو آپ فرمائیں۔ ہم جاں نثار ہیں۔ جو حکم ہوگا، بے چون وچرا اس کی تعمیل کریں گے!"

علاء الدین خلجی ۔" تمہاری اور تم جیسے لوگوں کی وفاداری اور جاں نثاری پر ہمیں پورا بھروسہ

ہے ۔لیکن جوش اور جذبہ میں آکر میں کوئی ایسا قدم نہیں اُٹھانا چاہتا جس کا نتیجہ ہلاکت اور بربادی ہو۔ (مولانا مغیث الدین سے مخاطب ہوکر) کیوں مولانا! آپ کا خیال مبارک کیا ہے؟"

مولانا مغیث الدین ۔" بجا ارشاد ہوا، خدائے بزرگ و برتر فرماتا ہے: لَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ یعنی اپنے آپ کو خواہ مخواہ ہلاکت میں نہ ڈالو۔"

علاء الدین خلجی ۔" تو پھر ہماری راہنمائی کیجئے —— بتائیے کیا کیا جائے؟ آخر کیا کریں ہم؟ آپ بھی ماشاء اللہ دانا و بینا ہیں، صاحبِ علم و فضل ہیں، کچھ تو کہئے، ——!"

مولانا مغیث الدین ۔" میں کیا کہہ سکتا ہوں ۔ "رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند"! میں تو گدائے گوشہ نشین ہوں، بھلا میں کیا اور میری رائے کیا؟"

علاء الدین خلجی ۔" نہیں، ایسا نہ کہئے، ہمارے دل میں آپ کی عزت اور وقعت ہے۔ آپ کے زہد و تقویٰ، نیکی اور پارسائی، حق گوئی اور راست بازی کی ہم قدر کرتے ہیں۔ یہ بھی جانتے ہیں آپ جو کچھ کہیں گے، خلوصِ نیت سے کہیں گے!"

مولانا مغیث الدین ۔" کیا فائدہ؟ —— اگر میں نے کچھ کہا تو بہت ممکن ہے۔ آپ کو ناگوار ہو، بادشاہوں کی خفگی، اور خوشی ایسی ہی ہوتی ہے۔ اس کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ عافیت محتاط ہی رہنے میں ہے۔ ان کا عمل "گاہے بہ سجدے برنجند، گاہے بہ دشنامے خلعت دہند!" پر رہتا ہے، اور میں اپنے آپ کو خواہ مخواہ ابتلا میں نہیں ڈالنا چاہتا۔"

علاء الدین ۔" نہیں مولانا! آپ بے تامل فرمائیے، کیا کہنا چاہتے ہیں۔ اِس وقت تو ہم بیٹھے ہی اس لئے ہیں کہ آپس میں تبادلۂ خیال کریں، اور اس فتنہ کو دفع کرنے کی تدبیر سوچیں! کچھ خیال نہ کیجئے، بے تکلف فرمائیے۔ میں گوشِ ہوش سے سن رہا ہوں! —— جی ارشاد؟"

مولانا مغیث الدین ۔" کل رات میں حضرت سلطان الاولیا، شیخ المشائخ حضرت خواجہ نظام الدینؒ

اولیاء کی خدمت مبارک میں حاضر تھا، وہاں بھی یہی سوال زیر بحث تھا۔ متوسلین بارگاہ میں کئی اصحاب تھے، جو اضطراب اور پریشانی کے عالم میں حضرت سے استدعا کر رہے تھے، کہ وہ بارگاہِ الٰہی میں دعا فرمائیں کہ یہ بلا ٹل جائے ——— !"

علاءالدین خلجی (بے تاب ہو کر) "بے شک، بے شک! ——— میرا دل گواہی دیتا ہے حضرت کی دعا سے یہ بلا ٹل جائے گی، ——— پھر کیا کہا حضرت نے؟ کیا فرمایا؟ کیا دعا کی؟"

مولانا مغیث الدین (عزم و استقلال کے ساتھ) "نہیں، ——— انہوں نے دُعا کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ برہم تھے، اور اُن کی برہمی دیکھ کر ہم سب کانپ گئے، لرزنے لگے!"

علاءالدین خلجی (کانپ کر) "کیا کہا آپ نے مولانا؟ ——— حضرت برہم تھے؟ خفا تھے؟ لیکن کس پر؟ کیوں؟ کس بات پر؟"

مولانا مغیث الدین "آپ پر، ——— حضرت اتنے خفا تھے کہ اگر وہ الفاظ میں دوہراؤں تو شاید آپ ابھی میری گردن مارنے کا حکم صادر فرما دیں۔ وہ آپ کا نام لے کر برہمی کا اظہار فرما رہے تھے!"

علاءالدین خلجی (بہت زیادہ پریشان اور مضطرب ہو کر) "مولانا! خدا کے لئے بتائیے حضرت کیوں برہم تھے؟ وہ کون سی خطا مجھ سے سرزد ہوئی ہے جس نے انہیں مجھ سے بیزار کر دیا ہے، مجھے بتائیے، میں ابھی آپ کے ساتھ حضرت کی خدمت میں چلوں گا، اور دست بستہ اُن سے معافی مانگوں گا۔ اُن کی زبانِ مبارک سے معافی کا لفظ جب تک میں نہ سُن لوں گا——— جب تک مجھے یقین نہ ہو جائے گا کہ اس بارگاہِ قدس میں میری فریاد سُن لی گئی، اس وقت تک سر نہ اُٹھاؤں گا!"

مولانا مغیث الدین: "لیکن آپ کو وہاں جانے کی اجازت نہیں ہے۔ حضرت نے صاف الفاظ میں فرما دیا ہے کہ نہ وہ خود یہاں تشریف لا سکتے ہیں، نہ اسے پسند فرما سکتے ہیں کہ آپ وہاں جائیں آپ اگر گئے تو وہ حجرہ کا دروازہ بند کر لیں گے۔ وہ آپ کی صورت دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے!"

علاءالدین خلجی: "آہ! ——— مولانا خدا کے لئے بتا دیجئے۔ حضرت مجھ سے اتنے برہم کیوں ہیں؟ میں خطاکار ہوں، گنہگار ہوں، عصیاں شعار ہوں، میری زندگی فسق و فجور میں ڈوبی ہوئی ہے۔ لیکن بہرحال مسلمان ہوں، صاحبِ ایمان ہوں، گنا ہوں پرپشیمان ہو سکتا ہوں، تائب ہو سکتا ہوں۔ لیکن میری خطا مجھے معلوم تو ہو، میرے گناہ کا حال مجھے بتایا تو جائے: ؎

حد چاہئے سزا میں عقوبت کے واسطے!
آخر گناہ گار ہوں، کافر نہیں ہوں میں!

مولانا میرے صبر کا زیادہ امتحان نہ لیجئے، بتا دیجئے حضرت اس ناچیز سے کیوں برہم ہیں؟"

مولانا مغیث الدین: "حضرت نے فرمایا، جو بادشاہ ظالم ہو، شرابی ہو، حدودِ شرعی کا احترام نہ کرتا ہو، اپنے منہ سے نکلے ہوئے ہر قول کو حرفِ آخر سمجھتا ہو، جس کے تعدّی سے مسلمان بھی محفوظ نہ ہوں، وہ اسی قابل ہے کہ قدرت کی طرف سے اسے تنبیہ کی جائے! ——— تادیب و سرزنش کی جائے اس کی!"

علاءالدین خلجی: (بیتاب ہوکر) "ہاں آپ سچ کہتے ہیں مولانا! بے شک میرے اندر یہ خامیاں اور کوتاہیاں ہیں۔ حضرت کی خفگی بجا ہے ———!"

مولانا مغیث الدین: "حضرت نے فرمایا، ایسا بادشاہ اسی کا مستحق ہے کہ اس کے سرِ پُرغرور پر دشمنوں کی ٹھوکریں لگیں۔ خدا کا انتقام اسی طرح ظاہر ہوتا ہے جس طرح ظاہر ہو رہا ہے، تم لوگ چاہتے ہو کہ میں دعا کروں یہ بلا ٹل جائے، یہ کیوں نہیں کہتے کہ میں دعا کروں علاءالدین

مولانا مغیث الدین ۔ (بہت مسرور ہوکر) "ہاں میں گواہ ہوں اور قیامت کے دن بھی گواہی دوں گا۔"

علاءالدین خلجی ۔ "میں آپ کا شکرگزار ہوں کہ آپ قیامت کے دن بھی میرے حق میں گواہی دیں گے لیکن بہت زیادہ شکرگزار ہوں گا، اگر آپ ابھی اور اسی وقت حضرت کی خدمت میں تشریف لے جائیں، اور یہ گواہی وہاں پیش کر دیں، اور اگر حضرت مجھے معاف کردیں تو مجھے ابھی آکر اطلاع دیں تاکہ سجدۂ شکر ادا کروں، کیوں مولانا، کیا آپ میرے لئے یہ زحمت گوارا فرمائیں گے؟ — جب تک آپ تشریف نہیں لے آتے۔ مجھے ایک لمحہ کے لئے بھی قرار نہیں آئے گا، میرا سکون صرف اس پر منحصر ہے کہ حضرت مجھے معاف فرما دیں۔ میرے لئے اپنی زبان حق ترجمان سے کلمۂ خیر ارشاد فرمائیں اور اس بلائے عظیم کے ٹل جانے کی دعا فرمائیں!؟

مولانا مغیث الدین ۔ "میں ابھی جاتا ہوں، یہ ساری کیفیت حضرت کی خدمت میں عرض کر دوں گا، مجھے یقین ہے، حضرت ضرور آپ کے لئے دعا کریں گے!"

علاءالدین خلجی ۔ "بس تو پھر تشریف لے جائیے، اب انتظار نہیں ہو سکتا۔ ایک ایک لمحہ ایک برس سے زیادہ ناقابلِ برداشت ہو رہا ہے، !؟"

کرامت!

علاءالدین خلجی بیتابی اور اضطراب کے عالم میں ٹہل رہا تھا۔ اس وقت ایک عجیب کیفیت اس پر طاری تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا واقعی وہ اپنے گناہوں پر پشیمان ہے اپنی خطاؤں پر نادم ہے ـــــ وہ جس کی ہیبت اور طنطنہ سے بڑے بڑے راجہ اور مہاراجہ، بادشاہ اور شہنشاہ کانپتے تھے، خود اس وقت ایک بزرگ شخصیت کے جلال اور دبدبے سے بید لرزاں کی طرح کانپ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اس کے بدن پر لرزہ طاری تھا۔ ظفر خاں تہور اور شجاعت میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا۔ الماس بیگ بھی بڑے کلے ٹھلے کا آدمی تھا۔ عین الملک جتنا جسیم تھا اتنا ہی باوقار۔ یہ سب ویسے بھی خلجی کے جاں نثار اور فداکار تھے۔ لیکن اس وقت اپنے آقا کی یہ کیفیت دیکھ کر ان پر بھی تأثر کی ایک ناقابلِ بیان کیفیت طاری تھی۔ ان پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، یہ لوگ جو ادب اور خاکساری کی تصویر بنے بیٹھے ہیں مر چکے ہیں۔ ان کے جسم روح سے خالی ہو چکے ہیں ایک علاءالدین کی چہل قدمی تھی، جو اس سناٹے میں مخل ہو رہی تھی۔ لیکن زبان اس کی بھی خاموش تھی۔

کافی دیر تک اس طرح ٹہلنے کے بعد دفعتہً ٹہلتے ٹہلتے علاءالدین رک گیا۔ اس نے عین الملک

سے کہا ــــــ "اب تک مولانا مغیث الدین تشریف نہیں لائے؛ کہیں حضرت کی درگاہ تک جانے کے بجائے اپنے گھر تو نہیں چلے گئے۔ ایک سراپا فسق و فجور شخص کی ترجمانی کرتے ہوئے وہ بھی جھجکے ہوں گے ــــــ آہ کون ساتھ دیتا ہے گنہگاروں کا' ــــــ کوئی نہیں، کوئی نہیں! تو میں مایوس ہو جاؤں؛ عین الملک میں یقین کر لوں، مولانا حضرت کے آستانہ پر تشریف نہیں لے گئے؛ یا گئے مگر حضرت نے توجہ نہیں فرمائی؛ ــــــ تم خاموش کیوں ہو؛ حیرت سے میرا مُنہ کیوں دیکھ رہے ہو؛ کیوں جواب نہیں دیتے؛"

عین الملک نے لرزتے ہوئے عرض کیا:۔

"میرے آقا! آپ کے اس اضطراب پر حیرت ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں، جس کے جبروت سے سارا عالم کانپتا ہے، وہ خود ایک ایسے شخص کی برہمی کے تصور سے لرزاں اور ترساں نظر آرہا ہے جس کے پاس کوئی طاقت نہیں، کوئی فوج نہیں، ساز و سامانِ جنگ نہیں، دولت و حشمت نہیں، مال و منال نہیں، اقتدار اور اختیار نہیں۔"

علاء الدین خلجی۔ "ہاں عین الملک! ایسا ہی ہوتا ہے، جو خدا کا ہو رہتا ہے اس سے سب ڈرتے ہیں۔ جو خدا سے نہیں ڈرتا، وہ سب سے ڈرتا ہے۔ حضرت کی جلالت اور جبروت سے ہر شخص متاثر ہے۔ ہم جیسے سگانِ دُنیا، خدا کو بھول بیٹھے ہیں۔ ہم طاقت سے ڈرنے پر مجبور ہیں لیکن عین الملک تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ بتاؤ اب تک مولانا مغیث الدین کیوں نہیں آئے؟"

عین الملک۔ "وہ ضرور آئیں گے عالی جاہ! یہ ممکن نہیں کہ وہ جھوٹ بولیں۔ وہ وعدہ کر گئے ہیں کہ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوں گے، اور آپ کے معروضات ان کی خدمت میں پیش کریں گے!"

علاء الدین خلجی۔ "ہاں انہوں نے وعدہ کیا تھا' ــــــ تو میں سمجھ لوں میری گزارش حضرت کی خدمت میں پہنچ گئی؛ حضرت نے بارگاہِ الٰہی میں میرے لئے دعا فرما دی؛ ــــــ

عین الملک تم نہیں جانتے خدا کے مقرب بندوں کی دعا میں کیا تاثیر ہوتی ہے ؟"

عین الملک: "خوب جانتا ہوں ظلِ اللہ! اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ مولینا مغیث الدین صرف ایک عالم ہیں، کوئی صاحبِ طریقت بزرگ نہیں لیکن حضرت سلطان المشائخ کے صحبت یافتہ ہیں۔ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے ہیں، ان کے فیوض و برکات سے تمتع حاصل کرتے رہتے ہیں، صرف اس ہم نشینی سے ان کا کیا عالم ہو گیا ہے، بارگاہِ ہمایونی میں اس وقت تین آدمی سب سے زیادہ مقرب ہیں: ایک حضور کا یہ خادم، دوسرا افتکار ظفر خاں تیسرا جاں نثار الماس بیگ۔ ہم تینوں اگرچہ اتنا رسوخ رکھتے ہیں بارگاہِ شاہی میں، اور ہر طرح سے سلطان کے اعتماد اور اعتبار کے حامل ہیں، لیکن ہم میں سے بھی کوئی یہ جرأت نہیں رکھتا، کہ خلافِ مزاج والا کوئی کلمہ مُنہ سے نکال سکے، لیکن اس دن مولانا مغیث الدین نے سلطانِ والاشان کے سامنے کتنی بے باکی اور دلیری سے ہر ہر سوال کا جواب دیا ہے، ہر ہر اعتراض کو رد کیا ہے، اور سلطان والاجاہ کے خیالات و مرغوبات کی صاف اور واضح الفاظ میں تردید کی ہے۔"

علاء الدین خلجی: "ہاں ہمیں یاد ہے، ابھی اس واقعہ کو کچھ بہت زیادہ دن تو نہیں ہوئے، اور ہم مولانا کی اس جرأت و بیباکی سے بہت متاثر ہوئے تھے، خوش ہوئے تھے کہ ہماری مملکت میں ایسے لوگ بھی ہیں جو خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔ نہ تلوار سے اور نہ شاہِ ذی جاہ اور والاقدرت سے!"

عین الملک: "جہاں پناہ نے بالکل بجا ارشاد فرمایا۔ سچی بات یہ ہے کہ یہ غلام اگرچہ مولانا کی زندگی سے مایوس ہو چکا تھا اُس دن۔ لیکن دل پر جو کیفیت طاری تھی اُسے الفاظ کے ذریعہ بیان نہیں کر سکتا۔"

علاء الدین خلجی: "لیکن مولانا اب تک کیوں نہیں آئے، جواب دو عین الملک، میرے دل میں اندیشہ ہائے دُور دراز پیدا ہو رہے ہیں۔ طرح طرح کے وسوسے اور خیالات پریشان کر رہے

ہیں مجھے!"

عین الملک: "وہ ضرور آئیں گے عالی جاہ! آتے ہی ہوں گے، تھوڑا سا انتظار اور کر لیجئے۔ اگر پھر بھی نہ آئے تو یہ غلام ان کی تلاش میں جائے گا! اور حضرت سلطان المشائخ کے آستانہ پر پہنچ کر انھیں اپنے ساتھ لائے گا!"

علاء الدین خلجی: "تم میں اتنی جرأت ہے کہ حضرت کے آستانے تک جا سکو، میں اس جرأت سے محروم ہوں۔ میری یہ ہمت نہیں کہ حضرت سے آنکھیں چار کر سکوں۔ حضرت سے دو بدو گفتگو کر سکوں!"

عین الملک: "غلام کئی مرتبہ حضرت کے آستانہ پر گیا ہے، اور جب گیا ہے روحانی دولت کے خزانے لوٹ کر واپس ہوا ہے!"

علاء الدین خلجی: "بے شک! بے شک! تم بڑے خوش نصیب ہو، مجھے تمہاری خوش بختی پر رشک آ رہا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ تمہارا دل مجھ سے زیادہ صاف ہے!"

عین الملک: "نہیں عالی جاہ، یہ بات نہیں، آپ پیر و مرشد ہیں، روشن ضمیر ہیں ظل اللہ ہیں۔ ہم جیسے لوگ آپ کی خاکِ پا کی برابری بھی نہیں کر سکتے۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ دہشت صرف اس وقت تک ہے جب تک حضرت کی خدمت میں حاضری کا موقع نہیں ملتا!"

علاء الدین خلجی: "اس کے بعد یہ دہشت جاتی رہے گی؟ ——— کس طرح مان لوں؟ میں تو اس تصور سے لرز اٹھتا ہوں کہ حضرت کا سامنا کروں!"

عین الملک: "عالی جاہ! غلام کی بھی بالکل یہی کیفیت تھی۔ لیکن جب حضرت کی خدمت میں ایک مرتبہ جرأت کر کے حاضر ہوا، حضرت کی باتیں سنیں، حضرت کے نکات و لطائف سے مشرف ہوا، تو آنکھیں کھل گئیں، دل بیدار ہو گیا، ایسی کشش اور جاذبیت ہے حضرت کے کلام میں! کچھ عرض

نہیں کرسکتا۔ جی چاہتا ہے حضرت فرماتے رہیں اور ہم سنتے رہیں۔ دن اسی طرح ختم ہوجائے، رات اسی طرح گزر جائے۔ ماہ و سال کی گردشیں اسی طرح گزرتی رہیں۔ لیکن ہم اسی طرح ان کلمات طیبات سے مستفید اور مستفیض ہوتے رہیں، یہاں تک کہ عمر تمام ہوجائے، زندگی ختم ہوجائے!"

علاءالدین خلجی: "سچ کہتے ہو عین الملک، بے شک یہی کیفیت ہوتی ہوگی۔ خاصان خدا کی یہ خاص شان ہے کہ ان کی خدمت میں حاضر ہوکر دہشت نہیں محسوس ہوتی، جاذبیت اور کشش محسوس ہوتی ہے!"

عین الملک: "عالی جاہ مولانا مغیث الدین تشریف لا رہے ہیں۔ ان کے ہونٹوں پر تبسم کھیل رہا ہے، بہت خوش نظر آرہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کامیاب اور کامگار ہوکر آرہے ہیں!"

علاءالدین خلجی نے نظر اُٹھا کر مولانا مغیث الدین کو آتے دیکھا۔ وہ ضبط نہ کرسکا۔ بڑی بیتابی کے ساتھ مولانا کی طرف بڑھا اور ان کے پاس پہنچ کر اس نے اثر انگیز آواز میں کہا:۔

علاءالدین خلجی: "آگئے مولانا! حضرت سے ملاقات ہوئی؟ خدارا انتظار نہ کرائیے۔ بتائیے، بتائیے، آپ نے میرے معروضات گوش گزار کردیئے! ——— بتائیے حضرت نے کیا فرمایا؟ آپ نہیں جانتے یہ وقت میں نے کتنی بے کلی اور اضطراب میں گزارا ہے؟"

مولانا مغیث الدین: "میں نے حضرت سے تمام ماجرا بیان کردیا ——— معاصی سے توبہ کا، ترکِ شراب کے عہد کا، شراب کے مٹکوں کے توڑے جانے کا، ظروف کے ٹکسال میں بھیجے جانے کا ——— سارا ماجرا گوش گزار کردیا!"

علاءالدین خلجی: "پھر حضرت نے کیا فرمایا؟ ——— یہ تو آپ بتلاتے نہیں!"

مولانا مغیث الدین: "حضرت نے یہ باتیں سُن کر تبسم فرمایا، پھر فرمایا، خدا جسے چاہے، گمراہ کردے، جسے چاہے راہ یاب کردے، وہ خوش قسمت ہے جو اپنی غلطیوں کو محسوس کرے اپنے

گناہوں سے توبہ کرے اور خلقِ خدا کی خدمت کرنے کا عہد کر لے!"

علاءالدین خلجی: "یہ فرمایا حضرت نے؛ اور دُعا؟ ——— کیا اس گناہگار کے لئے دعا بھی فرمائی؟"

مولانا مغیث الدین: "حضرت نے دونوں ہاتھ اٹھا کر خدا سے میرے سامنے دعا فرمائی اور کہا بارِ الٰہی! اپنے اس بندہ کی توبہ قبول فرمالے۔ اسے اپنے بندوں کی خدمت کی توفیق دے! اسے موقع دے کہ اپنے گناہوں کی تلافی کرے۔ میان سے تلوار اس لئے نہ نکالے کہ اس کی مملکت کے حدود وسیع ہو جائیں، اس لئے نکالے کہ تیرا کلمہ بلند ہو، اسے ہمت دے، قوت دے اور عملِ صالح کی دولت سے مالامال کر دے!"

علاءالدین: (فرطِ جذبات سے بےخود ہو کر) "واقعی میں کتنا خوش قسمت ہوں، اب میرا دل مضبوط ہے، میرا حوصلہ بلند ہے۔ میرا عزم مستحکم ہے۔ ظفر خاں تیاری کرو، ہم تاتاریوں سے بےسروسامانی کے باوجود مقابلہ کریں گے! ——— خون کے آخری قطرے ——— اور زندگی کی آخری سانس تک ——— عین الملک! شہر میں منادی کر دو، یہ جنگ نہیں جہاد ہے۔ جس کا جی چاہے آئے اور اس میں حصّہ لے!"

مولانا مغیث الدین: "ایک بات حضرت نے اور فرمائی تھی، ——— آپ نے تو پوری گفتگو کا موقع بھی نہیں دیا مجھے!"

علاءالدین خلجی: "ارشاد! میں گوشِ دل سے سُن رہا ہوں، کیا فرمایا حضرت نے؟"

مولانا مغیث الدین: "حضرت نے فرمایا، تاتاری کیا چیز ہیں؟ علاءالدین ان سے کیوں ڈرتا ہے؟ ان میں اتنی ہمت نہیں کہ علاءالدین سے مقابلہ کر سکیں۔ یہ مقابلہ کریں گے تو بھی ہار جائیں گے مقابلہ نہ کریں گے تو بھی ٹھہر نہ سکیں گے۔ تاتاریوں نے مسلمانوں پر بہت حملے کئے ہیں ———

علاء الدین اگر چاہے، تو خدا کی لاٹھی بن کر ان کے سر پر برس سکتا ہے۔ ان تمام مظالم کا بدلہ لے سکتا ہے جو انہوں نے مسلمانوں پر کئے ہیں!"

علاء الدین خلجی:- (بہت زیادہ مسرور ہو کر) "حضرت نے یہ فرمایا ؛ ——— مولانا! آپ نے اتنی بڑی خوش خبری مجھ سے چھپا رکھی تھی۔ میرے لئے اس سے بڑھ کر فخر کیا ہو سکتا ہے کہ اس قوم کی سرکوبی کا شرف حاصل ہو جس نے کسی ایک جگہ نہیں، اقطاع عالم میں مسلمانوں کو غارت کرنے کا بیڑہ اٹھایا تھا جس نے نہ جانے کتنے آباد اور پُررونق شہروں کو ویران کر دیا، کھیتیاں جلا دیں ——— مردوں کو قتل کر دیا، غلام بنا لیا، عورتوں کو باندی بننے پر مجبور کر دیا، بچوں کو ہلاک کر دیا۔ اگر حضرت کی دعا ہے تو بے شک میں ان تاتاریوں کا قلع قمع کر کے رہوں گا۔"

مولانا مغیث الدین:- "میرا دل گواہی دیتا ہے کہ خدا یہ کام ضرور آپ سے لے گا!"

علاء الدین خلجی:- "اور میں تن مَن دھن سے اس کام کو انجام دوں گا۔ اس کام کے انجام دینے میں اگر میری جان بھی کام آ جائے تو میں اسے اپنے لئے باعثِ فخر سمجھوں گا۔ نعرہ لگاؤں گا، ع

شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم!

مولانا! آپ نے مجھے ایک نئی زندگی عطا فرمائی، بہت شکر گزار ہوں آپ کا! ——— حضرت نے کچھ اور کیا فرمایا ؟"

مولانا مغیث الدین:- "حضرت نے یہ بھی فرمایا کہ علاء الدین کو ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ اسے چاہئے کہ اپنے دشمنوں کی سرگرمیوں سے باخبر رہے۔ وہ انہیں مغلوب کر کے یہ سمجھ لیتا ہے کہ اب کوئی خطرہ نہیں رہا، وہ نہیں جانتا کہ مسلح دشمن سے مغلوب دشمن زیادہ خطرناک ہوتا ہے وہ سازشیں کر سکتا ہے، دراندازیاں کر سکتا ہے، دوسرے طاقتور دشمنوں کو اکسا سکتا ہے سب

کچھ کرسکتا ہے!"

علاءالدین خلجی :"بے شک حضرت نے صحیح فرمایا ——— مجھے تو خود یہ شبہ ہوتا ہے کہ کہیں تاتاریوں کی یہ یورشیں کسی چھپے ہوئے دشمن کی شرارت اور سازش کا نتیجہ تو نہیں ہیں؟"

مولانا مغیث الدین :" بالکل یہی بات حضرت کے ارشادات سننے کے بعد میرے دل میں بھی آرہی ہے، ضرور تاتاریوں کی اس یورش کا سلسلہ کہیں اور سے ملتا ہے!"

علاءالدین خلجی :"اگر یہ بات ہے تو پھر اس دشمن کی خیر نہیں۔ تاتاریوں سے زیادہ عبرت انگیز سزائیں اُسے دوں گا۔"

مولانا مغیث الدین :"لیکن پہلے پتہ تو چلا لیجئے، کہ یہ کس کی حرکت ہے ؛ ویسے تو آپ کا نظامِ جاسوسی اتنا مکمل ہے کہ لوگ گھر میں بھی کچھ بات چیت کرتے ہیں، آپ کو اس کی اطلاع ہو جاتی ہے، اور آپ فوراً اس کے تدارک میں مصروف و منہمک ہو جاتے ہیں لیکن آپ کے خلاف اتنی بڑی سازشیں ہوں، اور آپ کے جاسوس اُن سے بے خبر ہیں ؛ حیرت کی بات ہے!"

علاءالدین خلجی :"مولانا آپ کے اس الزام کو شرم اور ندامت کے ساتھ میں قبول کرتا ہوں عین الملک! تمہیں دو ہفتہ کی مہلت دی جاتی ہے، اس عرصہ میں ثبوت کے ساتھ اس سازش کا پتہ لگ جانا چاہئے، ورنہ پھر تمہاری خیر نہیں، سُن لو کان کھول کے!"

عین الملک :" غلام اس سازش کا پتہ چلانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرے گا۔ انشاءاللہ جلد از جلد ملزم کی نشاندہی کروں گا، اور اسے حضورِ والا کے سامنے پیش کردوں گا!"

علاءالدین خلجی :" ظفر خان، کل صبح ہم دشمن پر بھرپور وار کرنا چاہتے ہیں، دو مہینے سے تاتاری دِلّی کا محاصرہ کئے ہوئے ہیں۔ اب انہیں زیادہ موقع نہیں دیا جاسکتا ——— ہمارے حملہ کا آغاز کل صبح ہو جانا چاہئے!"

ظفر خان:۔ انشاءاللہ ایسا ہی ہوگا آقائے ولی نعمت! ــــــــ غلام نے یہ بات گرہ میں باندھ لی۔ اور جتنی فوج بھی موجود ہے، جو کچھ سامانِ جنگ بھی دستیاب ہوسکتا ہے، اس سے جنگ کا آغاز کردے گا!"

علاءالدین خلجی:۔ ہاں اب ہمارا حوصلہ بلند ہے اور ہمیں خدا کے فضل وکرم سے اُمید ہے کہ فتح ہماری ہوگی، دشمن ناکام ونامراد واپس ہوگا!"

مولانا مغیث الدین:۔ انشاءاللہ! انشاءاللہ!! مجھے یقین ہے ایسا ہی ہوگا!"

دن کا بقیہ حصہ اور ساری رات جنگی تیاریوں میں بسر ہوگئی۔ ظفر خان، عین الملک، دوسرے حکام، عمّال، سردارانِ فوج، اہالیانِ شہر، اور خود علاءالدین خلجی سوا اس فکر کے ہر طرف سے غافل ہوچکے تھے۔ سب کو بس ایک ہی رٹ تھی۔ صبح ہو اور دشمن پر بھرپور حملہ کردیا جائے۔ نمازِ فجر کے بعد علاءالدین اپنے محل سے باہر آیا۔ عین الملک، ظفر خان اور مولانا مغیث الدین موجود تھے۔ ان سب کے ہونٹوں پر تبسم کھیل رہا تھا۔ اس بے موقع تبسم پر علاءالدین خلجی ذرا جز بز ہُوا۔ اس نے تیوری چڑھا کر روکھے لہجہ میں کہا:۔

علاءالدین خلجی:۔ "آپ حضرات کے تبسم کا راز ہماری سمجھ میں نہیں آیا! ــــــ کیا تیاریاں مکمل ہوگئیں؛ فوج تیار ہے؛ ــــــ ہم خود حملہ کی کمان کرنا چاہتے ہیں!"

ظفر خان۔ (مسکراتے ہوئے) "لیکن جہاں پناہ کس سے جنگ کریں گے؛ وہ کون دشمن ہے جس کے سر پر صاعقۂ غضب بن کر ہماری فوج گرے گی!؟"

علاءالدین خلجی:۔ "کیا مطلب؛ کیا تاتاری ہمارے دشمن نہیں ہیں؛ کیا ہمیں ان سے لڑنا اور انہیں بھگانا نہیں ہے؛ کیا اُنہوں نے دو مہینے سے دلی کا محاصرہ نہیں کر رکھا ہے؛"

ظفر خان:۔ "لیکن آقائے ولی نعمت دشمن ہے کہاں؛ تاتاری تو کہیں نظر نہیں آتے۔ ہم تو صبح

سے ان کی تلاش میں ہیں، نہ جانے انہیں زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا!"

علاءالدین خلجی۔ "ظفر خاں! ہم تمہاری فراست، ذہانت، دُور اندیشی اور خوش تدبیری کے قائل تھے۔ مثال میں تمہارا نام پیش کیا کرتے تھے۔ لیکن آج معلوم ہوا تم پاگل بھی ہو، تاتاریوں کا اتنا بڑا لشکر زمین کھا گئی، آسمان نگل گیا یا غائب ہو گیا؟ ——— یہ کیوں نہیں کہتے تم آج پاگل بن گئے ہو تاکہ اتنے بڑے اور خون آشام دشمن سے تمہیں مقابلہ نہ کرنا پڑے۔ تمہاری ہمت جواب دے چکی ہے، تمہارا حوصلہ سرد پڑ چکا ہے، تم لڑنے سے جی چراتے ہو۔ لیکن ہم نے تو کل ہی کہہ دیا تھا، حملہ کی رہنمائی ہم کریں گے ——— جاؤ تم آرام سے گھر میں بیٹھو اور ہمیں کام کرنے دو، ——— عین الملک! تمہارے عزم اور ہمت کا کیا عالم ہے؟ کہیں تمہاری آنکھیں بھی تو ظفر خان کی طرح دشمن کو دیکھنے سے انکار نہیں کر رہی ہیں؟"

عین الملک۔ "غلام سلطان کے ایک اشارۂ چشم پر اپنی جان قربان کر سکتا ہے۔ مگر ———"

علاءالدین خلجی۔ "مگر تاتاریوں سے نہیں لڑ سکتا، مغلوں کے مقابلہ میں نہیں آ سکتا! کیوں یہی بات ہے نا ———؟"

مولانا مغیث الدین۔ "سلطان والاجاہ، ظفر خان اور عین الملک سچ کہہ رہے ہیں ———؟"

علاءالدین خلجی۔ "مولانا! آپ بھی ان ہی لوگوں کے ساتھ ہیں؟ دشمن کی ہیبت اتنی پھیل چکی ہے، اس کا مجھے اندازہ نہ تھا ——— لیکن میں اپنے عزم پر قائم ہوں، میرا فیصلہ نہیں بدل سکتا۔ میں ضرور حملہ کروں گا۔ میں ضرور دشمن سے مقابلہ کروں گا۔ میں لڑتے لڑتے جان دے دینا اچھا سمجھتا ہوں، لیکن اسے گوارا نہیں کر سکتا کہ حضرت مجھے بزدل سمجھیں، انہوں نے مجھ میں نئی اُمنگ پیدا کی ہے۔ میں مقابلہ کروں گا، میدانِ جنگ میں تاتاریوں کے دانت کھٹے کروں گا ———!"

مولانا مغیث الدین: "سلطانِ عالم تاتاری بھاگ چکے ہیں۔ ہم تلاش کرتے کرتے تھک گئے مگر ایک تاتاری بھی نظر نہیں آتا۔ یہ حضرت کی کرامت ہے!"

علاء الدین خلجی: "کرامت، —— ہاں یہ ہوسکتا ہے، —— یہ ممکن ہے —— کیا واقعی مغل بھاگ کھڑے ہوئے؟"

مولانا مغیث الدین: "ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے؟ چلیے، بچشم خود ملاحظہ فرمالیجئے۔ دیکھیئے محاصرہ اُٹھ چکا ہے۔ خلقت خوش اور مطمئن ہے۔ آمد و رفت جاری ہے، اور تاتاریوں کا وہ لشکرِ گراں بھاگ چکا ہے۔ گویا وہ آیا ہی نہیں تھا۔"

علاء الدین خلجی: "واقعی یہ حضرت کی کرامت ہے، اللہ والے لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ وہ سب کچھ کرسکتے ہیں!" اور یکایک وہ سجدۂ شکر میں گر پڑا۔[1]

[1] مغلوں کے حملوں سے دہلی کی مخلوق تنگ آگئی۔ بادشاہ علاء الدین خلجی نے حضرت سلطان نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ سے مدد طلب کی۔ مؤرخین لکھتے ہیں، اسی رات طرغی خان (مغل سپہ سالار) پر ایسا خوف طاری ہوا کہ باوجود اس کے کہ دو مہینے سے محاصرہ کئے ہوئے تھا، راتوں رات کوچ کرکے اپنے ملک واپس گیا۔ لوگوں نے اس ناگہانی آفت کے اس طرح دور ہونے کو حضرت سلطان جی کی کرامت تصور کیا۔ تاریخ ہند جلد اوّل ص ۳۶۲

دیدہ ہائے ہوش اب جا کر کھلے!

حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیا کی اس کرامت نے جہاں شہریوں کو ایک بہت بڑے خطرہ سے نجات دی، وہاں علاء الدین خلجی کی آنکھیں کھول دیں۔ اس کے

دیدہ ہائے ہوش اب جا کر کھلے!

اس ایک واقعہ نے اس کی کایا پلٹ دی۔ اُس کے نظامِ فکر میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا، اب تک وہ گمراہ تھا، اب راہ یاب ہو گیا، اب تک وہ غلط راستے پر چل رہا تھا، اب صراطِ مستقیم اس کے سامنے تھی؛ اب تک اس کی بہادری، شجاعت، اولوالعزمی اور کشور کشائی کسی اعلیٰ مقصد کے لئے نہ تھی، اس لئے تھی کہ حدودِ مملکت میں توسیع ہو، جتنے زیادہ سے زیادہ آدمیوں کو حلقۂ اطاعت گلے میں ڈالنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے، انہیں مطیع اور نیازمند بنا لیا جائے۔ لیکن اب؟

اب جنگ و پیکار، صلح و مفاہمت، دوستی اور دشمنی ہر معاملہ میں پیشِ نظر یہ اصول رہنے لگا کہ کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہونے پائے، جو اسلام کے اعلیٰ اصولوں کے خلاف ہو، جس سے مسلمانوں کے وقار پر حرف آئے، جس سے دشمنوں کو اسلام پر طعن کرنے کا موقع ملے اور مسلمان سرِ ندامت جھکا دینے پر مجبور ہو جائیں۔ یہ تبدیلی بہت بڑی تبدیلی تھی اور ساتھ ہی ساتھ خوش آئند بھی!

یوں بھی علاء الدین خلجی کا نظامِ حکومت بہت استوار اور مستحکم تھا، لیکن اب اس واقعہ کے بعد اس نے اپنے نظام کو فولادی بنا دیا تھا۔ اس کا نظامِ جاسوسی دُنیا میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ دُور و دراز گوشوں کے ایک ایک واقعہ اور حادثہ کی اسے فوراً خبر ہو جاتی تھی، حضرت سلطان المشائخؒ نے خاص طور پر جو نصیحت کی تھی، وہ رعایا کی خبرگیری کی تھی۔ مولانا مغیث الدین نے صاف اور واضح الفاظ میں حضرت کی طرف سے فرمایا تھا، اگر تم مسلمان ہو، اگر تمہاری سرگرمیوں کا مرکز اسلام اور صرف اسلام ہے، اگر تمہاری کشورکشائی اور جہاں بانی کا مقصد اسلام اور مسلمانوں کی خدمت ہے تو ضروری ہے کہ تم ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ اور علیؓ کے نقشِ قدم پر چلو، وہ راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر رعایا کی خبرگیری کرتے تھے۔ بیواؤں اور محتاجوں کی روزی کا انتظام کرتے تھے، آشفتہ روزگاروں اور تباہ حالوں کے درد کا مداوا کرتے تھے، خود بھوکے رہتے تھے لیکن اسے گوارا نہیں کرتے تھے کہ رعایا فقروفاقہ کی زندگی بسر کرے۔ خود مَیلے اور پھٹے ہوئے کپڑے پہنتے تھے۔ لیکن ایسا اُنہوں نے کبھی نہیں کیا کہ رعایا کو ناگوار حالات پیدا کر کے مجبور کر دیا ہو کہ وہ نیم برہنگی کی زندگی بسر کرے۔ ان کے سامنے سونے چاندی کے ڈھیر مالِ غنیمت کی صورت میں موجود رہتے تھے، اور وہ مسندِ خلافت سے اس وقت تک نہیں اُٹھتے تھے جب تک یہ سارا روپیہ محتاجوں اور ضرورت مندوں میں تقسیم نہ کر دیں۔ ان کے پاس بادشاہتوں اور مملکتوں کا بے اندازہ اور بے شمار خرج آتا تھا۔ لیکن اُنہوں نے کبھی ایسا نہیں کیا کہ اس رقم سے خود دُنیا میں جنت کے مزے لوُٹے ہوں، اور رعایا کو بے اندازہ مصائب میں بے یار و مددگار چھوڑ دیا ہو، اب وہ زمانہ نہیں ہے، وہ لوگ نہیں ہیں، وہ نیت اور حُسنِ عمل نہیں ہے۔ حالات بدل چکے ہیں، لوگ بدل چکے ہیں، ماحول بھی دوسرا ہے۔ ایک عظیم انقلاب آچکا ہے اور ہر فرماں روا اور جہاں کشا سے یہ توقع نہیں ہو سکتی کہ وہ اتنا صالح ہوگا جتنے خلفائے راشدین تھے۔ لیکن کم از کم یہ توقع تو کی جا سکتی ہے کہ وہ اچھا مسلمان ہو۔ بے شک وہ جاہ و جلال کے رکھ رکھاؤ پر خود خرچ کرے

اپنے ایوان کو سجائے اور ایسا آراستہ کرے کہ چشمِ فلک بھی حیرت سے دیکھنے لگے۔ عیش و عشرت اور نشاط کی زندگی بسر کرے۔ لیکن کم از کم خیال تو رکھے کہ رعایا فقر و فاقہ کی شکار نہ ہو۔ نفع کمانے والے اور زر اندوزی کرنے والے زیادہ سے زیادہ نفع کمانے اور فائدہ اُٹھانے کے لئے رعایا کی جیب پر اتنا بار نہ ڈال دیں کہ وہ اس کے لئے ناقابلِ برداشت ہو جائے اور وہ زبان سے یہ دعا دے کہ بادشاہ کی عمر دراز ہو، اس کا اقبال بڑھے، اس کے عروج و فروغ میں ترقی ہو، اور دل سے بددعا کرے کہ جس قدر جلد اس دُنیا سے اُٹھ سکتا ہے اُٹھ جائے، تاکہ کوئی دوسرا شخص نمودار ہو، ——— ممکن ہے وہ کوئی اچھا کام کرے۔ ممکن ہے وہ رعایا کے دُکھ سُکھ کا خیال رکھے۔ ممکن ہے وُہ بادشاہ ملک کی صلاح و عافیت کو دوسری چیزوں پر ترجیح دے۔ مَیں علاء الدین سے یہ توقع نہیں کرتا کہ وہ ایوانِ حکومت کو خانقاہ اور مسجد بنا دے۔ لیکن یہ اُمید ضرور رکھتا ہوں کہ وہ ایک اچھا انسان بن جائے، ایک اچھا مسلمان بن جائے اور رعایا کے دُکھ کو اپنے دُکھ سے کم نہ محسوس کرے۔ اگر وہ اتنا بھی نہیں کر سکتا تو پھر تائیدِ غیبی اور نصرتِ الٰہی کا سزاوار بھی نہیں بن سکتا!"

مولانا مغیث الدین روانی اور بے باکی کے ساتھ حضرت سلطان المشائخ کا پیام پہنچا رہے تھے، اور خلجی محویت اور استغراق کے ساتھ باچشمِ پُرنم سُن رہا تھا! ——— اس پر تاثر کی ایک عجیب کیفیت طاری تھی اس وقت!

بات یہ ہوئی کہ تاتاری فتنہ کے یوں یک بیک رفع ہو جانے سے خلجی نے بہت زیادہ اطمینان محسوس کیا۔ حضرت سے اس کی عقیدت بھی بڑھ گئی۔ اس نے مولانا مغیث الدین کو اپنے خلوتکدہ میں بلایا اور کرید کرید کر حضرت سلطان المشائخ کی باتیں دریافت کرنے لگا۔ مولانا کو جو جو باتیں یاد آتی گئیں، وہ بتاتے گئے اور خلجی انہیں گرہ میں باندھتا گیا

بڑی دیر تک یہ نشست قائم رہی اور خلجی حضرت نظام المشائخ کے ارشادات اور ملفوظات

سے مستفید ہوتا رہا۔ پھر اس نے ایک عزم کے ساتھ مولانا کو مخاطب کر کے کہا:۔

"میرا جی چاہتا ہے کہ حضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنا دل کھول کر رکھ دوں، اُن سے عرض کروں کہ اب میری زندگی اس دھرتے پر چلے گی جس طرف آپ نے رہنمائی کی ہے۔ مَیں زندگی کی آخری سانس تک اس جادۂ صحیح سے منحرف نہیں ہوں گا۔ لوگوں کے دُکھ درد کو اپنا دُکھ درد محسوس کروں گا۔ لوگوں کی صلاح و عافیت کو اپنا شعار بناؤں گا۔ انصاف اور مساوات کے اصُول پر تازندگی قائم رہوں گا آپ سے میری صرف ایک التجا ہے کہ میرے سر پر آپ کا مبارک ہاتھ رکھا رہے بس اس سے زیادہ مَیں اور کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ یہی میری آخری آرزو ہے!"

مولانا مغیث الدین نے مسکراتے ہوئے استمالت کے انداز میں فرمایا:۔

"پھر آپ کیوں نہیں حضرت کی خدمت مبارک میں تشریف لے چلتے؟ اگر آپ کی باتوں میں صداقت ہے، خلوص ہے، راستی ہے۔ تو مَیں یقین دلاتا ہوں کہ حضرت کی سرپرستی سے آپ کبھی محروم نہیں ہوں گے وہ ہمیشہ آپ کے لئے دعا کرتے رہیں گے۔ آپ کی دستگیری فرماتے رہیں گے!"

خلجی نے جواب دیا:۔

"مولانا آپ سچ کہتے ہیں، جو کچھ فرماتے ہیں اس کے ایک ایک حرف پر مَیں یقین رکھتا ہوں، لیکن حضرت کی خدمت میں اس وقت تک حاضری کی جرأت نہیں کرسکتا جب تک اس کی اہلیت اپنے اندر نہ پیدا کرلوں!"

مولانا نے حیرت سے خلجی کی طرف دیکھا اور فرمایا:۔

"مَیں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔ حضرت کے آستانے پر حاضری کے لئے وہ کون سی اہلیت ہے جو آپ اپنے اندر پیدا کرنا چاہتے ہیں ——— کم از کم مجھے تو ایسی کوئی شرط نہیں معلوم پہلی مرتبہ آپ کے مُنہ سے مَیں نے یہ الفاظ سنے ہیں، حالانکہ مجھے فخر ہے کہ مَیں حضرت کے حاضر باشوں میں ہوں

خلجی نے بغیر کسی تامل کے کہا:۔

"مَیں نے حضرت سے بہت وعدے کئے ہیں، رعایا کی فلاح و صلاح کے، اپنی اصلاح احوال کے، اپنے کردار اور سیرت میں اصلاحی رنگ پیدا کرنے کے، انصاف اور مساوات کے، لیکن یہ صرف وعدے ہیں، خالی خولی الفاظ۔ عمل کا توشہ خالی ہے، مجھے کچھ کر لینے دیجئے۔ یہ ثابت کر لینے دیجئے کہ مَیں جو کچھ کہتا ہوں، وہ کرتا بھی ہوں۔ میرے الفاظ میں اور میرے عمل میں ہم آہنگی ہے۔ جب یہ ثابت ہو جائے گا، جب یہ کر لوں گا، تب حضرت کی خدمت میں حاضر ہوں گا ـــــــ لیکن تنہا نہیں آپ کے ساتھ!"

مولانا مغیث الدین ہنسنے لگے۔ اُنہوں نے فرمایا:۔

"بڑا مبارک ارادہ ہے اور مَیں خدائے بزرگ و برتر سے دعا کرتا ہوں کہ وہ آپ کو عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ مَیں جانتا ہوں آپ کو خدا نے آہنی عزم عطا فرمایا ہے۔ جب آپ نے ایک فیصلہ کر لیا تو اس پر عمل کر کے رہیں گے۔ قرآن میں جہاں مومن کی بہت سی تعریفیں ہیں، اُن میں ایک یہ بھی ہے کہ واذا عزمت فتوکّل علی اللّٰہ انّ اللّٰہ یحبُّ المتوکّلین، یعنی جب کسی بات کا عزم کر لو، تو خدا پر بھروسہ کر کے اسے کر گزرو۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو اس پر بھروسہ رکھتے ہیں!"

اتنے میں چوبدار نے عرض کیا۔ عین الملک اور ظفر خاں دروازے پر کھڑے ہیں اور اذن باریابی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

علاء الدین نے سر کے اشارے سے حاضر ہونے کی اجازت دی، فوراً لوگ حاضر ہو گئے۔ ان لوگوں کے آنے کے بعد مولانا مغیث الدین اُٹھنے لگے لیکن خلجی نے اصرار کر کے انہیں روک لیا اور کہا:۔

"تشریف رکھیئے، مَیں چاہتا ہوں، ظفر خان اور عین الملک کو آپ وہ باتیں بتا دیں، جو ابھی آپ نے مجھ سے فرمائی ہیں۔ نظم مملکت کی سربراہ کاری براہ راست انہی لوگوں پر ہے۔ مَیں تو صرف نگران کار ہوں۔ یہ دونوں میرے ہاتھ پاؤں ہیں، جب تک یہ درست نہیں ہوں گے، مَیں بھی ٹھیک نہیں ہو سکتا۔

جب تک ان کی اصلاحِ فکر و عمل نہ ہو جائے۔ میں بھی ناکارہ رہوں گا، اور آپ کے سامنے میں اپنے ان دونوں معتمد ترین اور عزیز ترین رفیقوں سے کہتا ہوں۔ اگر اس سانچے میں آپ حضرات اپنے تئیں ڈھال سکتے ہیں، تو ہماری رفاقت اور زیادہ پاکیزہ اور مستحکم ہو جائے گی، ورنہ لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْن —
تمہارے لئے تمہارا راستہ اور میرے لئے میرا راستہ!

مولانا مغیث الدین نے حضرت سلطان المشائخ کے وہ تمام ارشادات پھر دوہرا دیئے جو ابھی انہوں نے علاء الدین خلجی کے گوش گزار کئے تھے۔ یوں تو ان باتوں سے عین الملک بھی بہت متاثر ہوا۔ لیکن صاف معلوم ہو رہا تھا۔ ظفر خاں کے تأثر کا رنگ اپنے رفیق سے کہیں زیادہ گہرا اور چوکھا ہے۔ وہ خلجی سے بھی زیادہ متأثر نظر آرہا تھا۔ یہ ساری باتیں سننے کے بعد اس نے کہا:-

"جب تک زندہ ہوں حضرت کے بتائے ہوئے راستے سے قدم نہیں ہٹاؤں گا! —— یہ میرا عہد ہے —————!"

اِنکار ——— !

راجہ کرن سنگھ گجرات کا مہاراجہ، علاءالدین خلجی کی ترکتازیوں اور یورشوں سے تنگ آکر گجرات سے بھاگ کر بگلانہ میں مقیم تھا، اور درپردہ سازشوں اور شرارتوں میں مبتلا تھا۔ اس کی بیوی کنول دیوی اور لڑکی دیول دیوی امورِ سیاست سے بے خبر اپنے شبستانِ عیش میں بے فکری اور عافیت کی زندگی بسر کر رہی تھیں۔ دیول دیوی نے راجکمار گوبند پرشاد کی محبت کو قبول کر لیا تھا لیکن جب آزمایا گیا تو وہ بزدل ثابت ہُوا۔ دیول دیوی کو اس سے نفرت ہوگئی۔ وہ خود بھی بہادر تھی۔ تیر انداز بھی، شمشیر زن بھی، نیزہ باز بھی، بہت اچھی سوار تھی۔ خطرہ کے وقت اس کی ہمت اُور بلند ہوجاتی تھی۔ طوفانوں کے تھپیڑے اس میں زندہ رہنے کا عزم پیدا کر دیتے تھے۔ ناسازگار حالات اس کے سمندِ عزم پر تازیانہ کا کام کرتے تھے۔ وہ محل میں رہتی تھی۔ قدرت نے اُسے عورت بنایا تھا، ——— ایک نازک بدن عورت ——— لیکن اس کے سینہ میں جو دل دھڑک رہا تھا، وہ فولاد و آہن کا بنا ہُوا تھا، نہ لچک سکتا تھا، نہ رعب و دہشت قبول کر سکتا تھا۔ وہ چاہتی تھی رفیقِ زندگی بھی ایسا میسّر ہو جو بہمہ صفت موصوف ہو۔ نڈر ہو، دلیر ہو، جری ہو، بہادر ہو، ہزاروں کے مجمع میں تلوار لے کر کُود پڑے، اور دشمنوں کو کھیرے ککڑی کی طرح کاٹ کر ڈال دے، نہ شیر سے ڈرے

نہ ہاتھی سے، نہ فوج سے نہ تلوار سے۔ لیکن یہ راجکمار گوبند پرشاد اتنا بُزدِل اور نکما ثابت ہُوا کہ اس دن شکار میں نہ ہرن پکڑ سکا، نہ اپنی محبوبہ کو "دشمن" کے پنجہ سے بچا سکا، بلکہ محبت سے بھی انکار کر دِیا۔ اور شادی کے ارادہ سے بھی دستبردار ہو گیا، اور اپنی آنکھوں سے دیکھتا رہا کہ "دشمن" اس کی محبوبہ کو لے جا رہے ہیں۔ اس کی فریاد اور چیخ و پکار سے بھی اس کی رگِ محبت جوش میں نہ آئی۔ کیا ایسا شخص میرا پتی (شوہر) بن سکتا ہے۔ پتاجی (کرن سنگھ) میری گردن پر تلوار رکھ دیں تو بھی "ہاں" نہ کروں!

شکارگاہ سے واپس آنے کے بعد رادھا نے تسلی اور دلجوئی کی بہت کوشش کی لیکن افسردگی اور اضمحلال کی جو کیفیت اس دن طاری ہوئی تھی وہ آج کئی مہینے گزارنے کے بعد بھی جوں کی توں موجود تھی۔ دیول دیوی کو گوبند پرشاد ہی سے نہیں 'مردوں' سے نفرت ہوتی جا رہی تھی۔ یہ ہوس پرست لوگ، غرض کے غلام ہوتے ہیں، یہ عیش و طرب کے رسیا ہوتے ہیں۔ ان میں حوصلہ نہیں ہوتا، اُمنگ نہیں ہوتی، ولولہ نہیں ہوتا۔ ——— مَیں تو اس کو اپنی زندگی کا ساتھی بناؤں گی جو بہادر ہو، سُورما ہو، جو پرتھوی راج کی طرح نڈر ہو، جو راجکماری سنجوگتا کو بھرے دربار میں سے تن تنہا بغیر کسی فوج کی مدد کے لے گیا تھا اور درباری مُنہ دیکھتے رہ گئے تھے۔ اسی طرح جب تک کوئی نیا پرتھوی سنگھ نمودار نہ ہو اور مجھے بزور و قوّت حاصل نہ کرے، مَیں اس کی نہیں بن سکتی۔ مجھے بُزدل سے محبت نہیں ہو سکتی، میرے دل میں اس کی جگہ نہیں پیدا ہو سکتی۔ وہ مرد، عورت سے بدتر ہے جس میں کس بل نہ ہو، دم خم نہ ہو، زور و قوّت نہ ہو، جاہ و جلال نہ ہو، ہمّت اور حوصلہ نہ ہو! یہ باتیں وہ بیٹھی سوچ رہی تھی کہ رادھا آ گئی۔ اس نے اپنی راجکماری کو یوں ملول و افسردہ جو دیکھا بیقرار ہو گئی، چپ چاپ آ کر پاس بیٹھ گئی، اور پھر مُنہ سے کچھ کہا۔ اس کی طرف ٹکٹکی باندھ کے دیکھنے لگی۔ راجکماری نے عالمِ جال سے نظر اُٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور مُسکرا کر پُوچھا:۔

"اری تو میرا منہ کیا دیکھ رہی ہے ، کچھ بدل گئی ہوں میں کیا؟"

رادھا نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا : " ہاں راجکماری تم بدل گئی ہو اور ہم سے تمہاری یہ حالت نہیں دیکھی جاتی ."

راجکماری نے تیوریاں چڑھالیں اور ذرا خفگی کے لہجہ میں کہا ." تو پاگل ہو گئی ہے شاید آخر میں بدلوں گی کیوں ، کون سی ایسی بات ہوئی ہے ؛ خواہ مخواہ تجھے وہم ہو جاتا ہے ، اور پھر تو کسی کی کچھ سُنتی نہیں ، اپنی کہے جاتی ہے ، اور ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ جاتی ہے ——— جا اپنا کام کر !"

رادھا بھلا کہاں ماننے والی تھی ، وہ تو طے کر کے آئی تھی کہ راجکماری کو پھر ویسا ہی چنچل بنا کر واپس آئے گی جیسی وہ پہلے تھی ، اس نے بچّوں کی طرح مچلتے ہوئے کہا :۔

" نہیں راجکماری میں نہیں جاؤں گی ، ضرور تمہیں کچھ دُکھ ہے ، کوئی چنتا (فکر) ہے ۔ کیا مجھ سے نہ کہو گی ؛ میری طرف دیکھو ، میں ہوں رادھا تمہاری سہیلی ، تمہاری رازدار ، غم خوار ، جان نثار اب میں بھی غیر ہو گئی ، اب مجھ سے بھی اپنی باتیں چھپانے لگیں تم ؛ پھر میرے یہاں رہنے سے کیا حاصل ؛ اس محل میں رہنے سے کیا فائدہ ؛ صاف کہو ، چلی جاؤں یہاں سے ؟"

راجکماری دیول دیوی رادھا کی ان صاف ، سادہ اور خلوص سے بھری ہوئی باتوں سے بہت متاثر ہوئی ۔ اس نے اس کے گلے میں باہیں ڈال دیں ، اور بڑے محبّت بھرے لہجہ میں کہا :

" تو تو دیوانی ہے اچھی خاصی اری کچھ کوئی بات ہو بھی ——— ! ہاں ذرا سست بیشک رہنے لگی ہوں !"

رادھا کھسک کر اور قریب آگئی ۔ پھر اس نے کہا :۔

" وہی تو پوچھ رہی ہوں کیوں سست رہنے لگی ہو ؛ مجھے بتاؤ میں اس کا اپائے (تدارک) کروں گی بھلا ایسا ہو سکتا ہے کہ رادھا زندہ رہے ، اور راجکماری دیول دیوی سست رہیں ! یہ نہیں ہو سکے گا !

بتاؤ کیا چیتا ہے تمہیں ؟"

کچھ سوچتے ہوئے اور خلا کی طرف گھورتے ہوئے راجکماری دیول دیوی نے کہا :-

"اس دن مجھے اور راجکمار گوبند پرشاد کو دیکھ کر یاد ہے تُو نے کیا کہا تھا ؟"

رادھا کچھ یاد کرتے ہوئے بولی :-

"ہاں میں نے کہا تھا یہ جوڑی بڑی اچھی رہے گی، ——— مہارانی صاحبہ (کنول دیوی) نے بھی تو مسکرا کر میری تائید کی تھی، بلکہ تم سے بھی کہا تھا کہ راجکماری اچھی طرح مِلا کرو اس سے، باتیں کیا کرو، اسے خوش کیا کرو، یہ سب اس لئے کہ وہ تمہارے پتی بننے والے ہیں !"

بڑے فکر مندانہ انداز میں دیول دیوی نے جواب دیا :-

"ہاں اور میں نے ایک دفعہ پتا جی (کرن سنگھ) اور ماتا جی (کنول دیوی) کو اکیلے میں جب وہ مجھے سوتا سمجھ رہے تھے، ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہوئے بھی سُن لیا، وہ کہہ رہے تھے، دیول دیوی کے لئے گوبند پرشاد سے اچھا کوئی بر نہیں مِل سکتا، ہر اعتبار سے وہ موزوں ہے۔ ماتا جی نے کہا ابھی تو وہ کم سن ہے، ذرا اور سیانی ہو لے تب دیکھا جائے گا۔ ممکن ہے جب تک کوئی اور اچھا راجکمار مِل جائے۔ لیکن پتا جی خفا ہو گئے، کہنے لگے، تم عورت ہو، دیول دیوی اور گوبند پرشاد سے اچھا جوڑ نہیں ہو سکتا، دربار کے پنڈت جی بھی یہی کہتے ہیں۔ پنڈت جی کا نام سُن کر بے چاری ماتا جی چُپ ہو گئیں !"

رادھا یہ طویل تقریر سنتے سنتے تھک گئی۔ اس نے اوبھے ہوئے انداز سے کہا :-

"راجکماری! تم تو بڑی لمبی چوڑی بات کرنے لگیں۔ میں کہتی ہوں سُن لیا سب کچھ جان لیا کچھ بھی ہو مانو یا نہ مانو، تمہارا بیاہ ہو گا، ضرور ہو گا، اور کان کھول کے سُن لو راجکمار گوبند پرشاد ہی سے ہو گا۔ کل میرے پتا جی بھی ماتا جی سے یہی باتیں کر رہے تھے !"

فیصلہ کُن انداز میں راجکماری دیول دیوی نے رادھا کو جواب دیا :۔

"تو پھر تم بھی ایک بات کان کھول کر سُن لو، اگر دیول دیوی کا بیاہ راجکمار گوبند پرشاد سے ہوگا تو پھر اُس کی لاش سے شادی کریں گے وہ، زندہ نہیں مل سکتی مَیں اُنہیں ——— ہاں!"

یہ سُن کر رادھا کانپ گئی۔ اُس نے دانتوں تلے اُنگلی دبائی۔ آہستہ سے کہا :۔

"رام کے لئے ایسی باتیں نہ کرو، کوئی سُن لے گا تو غضب ہو جائے گا! ——— تمہیں پتہ نہیں بیاہ کی تیاریاں ہو رہی ہیں !"

دیول دیوی نے تیکھی نظروں سے رادھا کو دیکھا اور تن کر بولی :۔

"ہاں پتہ ہے، راج محل کی کون سی ایسی بات ہے جو مجھے نہ معلوم ہو ——— اس لئے تو مَیں نے تمہیں وقت سے پہلے بتا دیا! ایسا نہ ہو میرے زہر کھانے کے بعد تمہیں یہ صدمہ ہو کہ اگر مَیں پہلے بتا دیتی تو تم کچھ تدبیر کر لیتیں، میری جان بچا لیتیں، مجھے نہ مرنے دیتیں۔ اگر کچھ کر سکتی ہو تو کر لو، ورنہ وقت ہاتھ سے نکل جائے گا!"

رادھا نے آمادگی اور مستعدی کے ساتھ جواب دیا :۔

"تم جو کچھ کہو مَیں کرنے کو تیار ہوں۔ زہر پہلے مَیں کھاؤں گی پھر تم کھانا۔ لیکن یہ تو بتا دو! آخر تم کیوں انکار کر رہی ہو۔ بھگوان کی کرپا سے آپ جوان ہو رہی ہیں۔ جوان ہونے کے بعد لڑکی کو شادی کرنا ہی پڑتی ہے۔ کہیں ایسا بھی ہو سکتا ہے یُونہی بیٹھی رہے ؟"

دیول دیوی نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

"ہاں، ایسا نہیں ہوتا! اور مَیں بھی یہ نہیں چاہتی۔ لیکن راجکمار گوبند پرشاد سے تو مَیں بیاہ نہیں کر سکتی، چاہے ادھر کی دُنیا اُدھر ہو جائے! ——— وہ بُزدل ہے، کیا اُس دن کا وہ واقعہ بھول گئیں جب راجکمار نے مجھے دشمن کے حوالے کر دیا تھا؛ بھلا ایسے کائر، بُزدل آدمی سے

میں بیاہ رچاؤں گی ؛"

رادھا ہنسنے لگی۔اس کو سارے واقعات یاد آ گئے۔اس نے کہا :۔

"ہاں اس دن تو راجکمار نے بڑی بزدلی دکھائی تھی، لیکن وہ تو مذاق تھا!"

دیول دیوی نے جواب دیا :۔

"ہاں مذاق تھا، لیکن ہمارا آپس میں۔ تُو جانتی تھی، مَیں جانتی تھی اور سہیلیاں جانتی تھیں، یہ مذاق ہے۔ لیکن راجکمار کو تو آج تک نہ معلوم ہو سکا کہ یہ مذاق تھا۔ وہ تو سچ مچ ڈر گئے تھے۔ وہ تو سچ مچ مجھ سے دستبردار ہو گئے تھے۔ لیکن یہ سوانگ اور مذاق اگر کبھی واقعہ بن جائے تو کیا راجکمار گوبند پرشاد مہاراج اپنی لاڈلی بیوی اور جان سے پیاری محبوبہ کو "دشمن" کے ہاتھ میں چھوڑ کر راہِ فرار اختیار نہ کر لیں گے! ——— بتاؤ رادھا کیا ایسا نہیں ہو سکتا ؛ مَیں دنیا میں کسی سے نفرت نہیں کرتی، سوا بزدل کے ———!"

یہ باتیں سُن کر بیچاری رادھا سوچ میں پڑ گئی۔ ان باتوں میں وزن تھا، انہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس نے صورتِ سوال بن کر راجکماری سے پُوچھا :۔

"پھر اب کیا کیا جائے ؛ ——— مہاراجہ کرن سنگھ بات کے دھنی اور قول کے پکے ہیں۔ وہ زبان دے چکے ہیں۔ اب اس سے تو نہیں پھر سکتے!"

فیصلہ کن انداز میں دیول دیوی نے جواب دیا :۔

"اور مَیں بھی راجہ کرن سنگھ کی بیٹی ہوں، میرا فیصلہ بھی اٹل ہوتا ہے، اسے بھی کوئی نہیں بدل سکتا۔ یہاں تک کہ خود راجہ کرن سنگھ بھی نہیں، چاہے کچھ ہو جائے مگر گوبند پرشاد میرے شریر (جسم) کو ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ وہ مرد ہے ؛ ——— وہ تو عورتوں سے زیادہ کم ہمت اور تھڑدلا ہے۔ اس کا نام میرے سامنے نہ لو، اور پتا جی کو بتا دو، یہ بات نہیں ہو سکتی۔ اپنے قول اور اپنی زبان کے

اپنی اکلوتی بیٹی کو بھینٹ نہ چڑھائیں، ورنہ زندگی بھر روئیں گے، اور پھر کچھ کیتے نہ بن پڑے گا! — کہیں عورت اور عورت کی بھی شادی ہوئی ہے؟ ——— یہ اندھیر؟"

رادھا بولی:۔

"راجکماری کچھ بھی ہو، میں مہاراج سے تو یہ بات نہیں کہہ سکتی۔ ہاں رانی صاحبہ سے کہہ دوں گی، وہ مہاراجہ کو سمجھا لیں گی، ——— کیوں؟"

راجکماری دیول دیوی نے جواب دیا:

"ماتا جی سے کہنا بے کار ہے۔ وہ پتا جی کی رائے نہیں بدل سکتیں۔ وہ اتنی صفائی سے بات چیت نہیں کر سکتیں۔ ہاں تُو کر سکتی ہے!"

رادھا۔ (بڑی بے بسی کے ساتھ) "کیوں مجھ غریب کی گردن کٹوانے پر تُلی ہو، راجکماری؛ رحم کرو مجھ پر، مجھ پر نہیں کرتیں تو میری جوانی پر رحم کرو۔ ابھی میری عمر ہی کیا ہے صرف اٹھارہ برس! ابھی میں نے دُنیا میں دیکھا کیا ہے؟"

راجکماری رادھا کی یہ باتیں سُن کر مسکرانے لگی۔ اس نے کہا:۔

"میں تم سے بھی دو تین برس چھوٹی ہوں، جب میں مرنے کو تیار ہوں، پھر تم کیوں ہچکچاتی ہو؟ جاں نثاری کا دعویٰ تو بہت تھا!"

رادھا۔" وہ تو اب بھی ہے، اور اگر وقت آیا تو کر کے بھی دکھا دوں گی، لیکن اگر ٹل جائے تو اچھا ہے ——— اچھا میری ایک بات مان لو!"

دیول دیوی۔" نہیں میں نہیں مانوں گی، بے وقوفوں کی بات کوئی نہیں مانتا!"

رادھا۔" کبھی کبھی بے وقوف بھی پتے کی بات کہہ جاتے ہیں، سُن تو لو، ——— میں راجکمار گوبند پرشاد کو اس کی راجدھانی سے بلواتی ہوں، اور کہتی ہوں کہ راجکماری تمہاری بزدلی سے

خفا ہے۔ کوئی کارنامہ دکھاؤ تو وہ شادی کرے گی تم سے ورنہ نہیں ——— اگر وہ کوئی کارنامہ دکھلائے تو کرلینا ورنہ دھتکار دینا۔ بات بھی رہ جائے گی، تم پر کوئی الزام بھی نہیں آئے گا!"

دیول دیوی۔ "نہیں، اس ڈھونگ کی کوئی ضرورت نہیں، اس دن بڑی آزمائش ہو چکی ہے اب کسی آزمائش کی ضرورت نہیں ———!"

رادھا۔ "تم تو یہ باتیں کرکے مزے سے الگ ہو گئیں، لیکن میں کیا کروں؟ مشکل تو میرے لئے ہے۔ بلی کے گلے میں گھنٹی کس طرح باندھوں؟ مہاراج کے سامنے کیسے جاؤں؟ ان سے یہ باتیں کیسے کروں؟ ذرا میری بے بسی پر بھی تو دھیان کرو!"

دیول دیوی۔ "ہم نہیں جانتے ——— جی چاہے تو نہ جاؤ۔ ہم کو تو جو کچھ کہنا تھا کہہ دیا، آگے تم جانو اور تمہارا کام، پھر ہم سے کچھ نہ کہنا ———!"

رادھا۔ "عجیب مصیبت میں ڈال دیا ہے تم نے تو ——— ارے چپ، وہ دیکھو مہاراج کرن سنگھ اس طرف آرہے ہیں، اچھا موقعہ ہے تم خود کہہ دو اُن سے سب کچھ!"

دیول دیوی۔ (آہستہ سے) "نہیں نہیں نہیں کہوں گی میں پتا جی سے ذرا دیر باتیں کرکے اُٹھ جاؤں گی، پھر تم کہہ دینا۔ کہو تو ماتا جی کو بھی بھیج دوں جا کر؟ ——— بھلا لڑکی بھی باپ سے اس طرح کی باتیں کرسکتی ہے پگلی؟"

رادھا ابھی کوئی جواب نہ دینے پائی تھی کہ مہاراج بالکل قریب آگئے، انہیں دیکھ کر دیول دیوی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ مہاراج نے اس کی پیشانی کو بوسہ دیا، مسند پر بیٹھ گئے اور راجکماری کو اپنے پاس محبت و شفقت سے بٹھاتے ہوئے کہا:۔

"بیٹی میں تیرے ہی پاس آیا ہوں اس وقت!"

دیول دیوی کا دل سہم گیا!

یہ میرے ہی پاس آئے ہیں اس وقت، لیکن کیوں؟ کیا راجکمار گوبند پرشاد کی سفارش کرنے؟ نہ جانے دیول دیوی کے دل میں کس طرح حوصلہ پیدا ہو گیا۔ اور اُس نے فیصلہ کر لیا کہ اگر پتاجی نے گوبند پرشاد کے بارے میں کچھ کہا، تو مَیں ضرور اپنے عندیہ کا اظہار کروں گی۔

کرن سنگھ نے کہا:۔

"بیٹی! کئی دن سے میں تجھے پریشان اور افسردہ دیکھ رہا ہوں، کیا بات ہے آخر؟ اگر میری زندگی میں بھی تُو روتی رہی، تو پھر سُکھ کب پائے گی؟ بیٹا کیا بات ہے؟"

دیول دیوی:۔ "کوئی خاص بات نہیں پتاجی! آپ کی پریشانی دیکھ کر مَیں پریشان ہو جاتی ہوں — کمینے علاؤالدین خلجی کا کیا ہُوا؟ وہ قتل ہُوا کہ نہیں؟ بتائیے اس کا کیا ہُوا جہاں آپ نے سفیر بھیجا تھا اپنا؟ وہی تاتاریوں کا سردار؟"

کرن سنگھ:۔ "نہیں بیٹی وہ قتل نہیں ہُوا، وہ زندہ ہے اور ہماری چھاتی پر کود رہا ہے، اور ہم میں سے کسی میں ہمّت نہیں کہ اس کی گردن ناپ سکے!"

دیول دیوی:۔ "اور وہ تاتاریوں (مغلوں) کا سردار قتلغ خواجہ؟ وہ کہاں بیٹھ رہا؟ کیوں نہیں آیا؟ کیا اُس نے بھی ہار مان لی خلجی سے؟ وہ بھی ڈر گیا؟ آپ تو بڑی تعریف کیا کرتے تھے؟ دلّی پر آخر وہ کب چڑھائی کرے گا؟"

کرن سنگھ:۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) "کیا بتاؤں بیٹی، زمانہ ہی کچھ خراب ہے ———— مَیں نے کم بخت کو اتنا اُکسایا، لیکن وہ نہیں گیا، اب تک سوچ رہا ہے!"

دیول دیوی:۔ "ڈر گیا شاید خلجی کے دبدبہ سے؟"

کرن سنگھ:۔ "ہاں یہی سمجھنا چاہئے، حالانکہ وہ تو کچھ اَور کہتا ہے!"

دیول دیوی:۔ "بات بنا رہا ہوگا، کیسے گا کیا؟ معلوم ہو گیا وہ بھی بزدل ہے! ——— کیوں پتاجی؟"

کرن سنگھ :" ہاں مَیں تو یہی سمجھ رہا ہوں، خود تو نہیں گیا، ایک اور مغل سردار طرغی خان کو ایک لاکھ بیس ہزار فوج کا لشکر دے کر بھیج دیا ہے"

دیول دیوی :" اچھا کیا۔ پھر طرغی خان نے کیا کیا؟ دلّی کو فتح کر لیا؟ مسلمانوں کو مار ڈالا؟ خلجی کا ستیاناس کر دیا؟ وہ بھی تو بڑا اجیالا اور دلیر ہوگا؟"

کرن سنگھ :" ہاں بیٹی، تھا! —— کم بخت اتنا بڑا لشکر لے کر گیا۔ کم بخت نے دلّی کا محاصرہ بھی کر لیا، اور دو مہینے تک جاری بھی رکھا۔ دلّی کے لوگ گھبرا گئے۔ خود خلجی کے چھکے چھوٹ گئے۔ لیکن بجائے اس کے کہ حملہ کرتا، دلّی فتح کرتا، دشمن بادشاہ کو شکست دے کر قتل کرتا مسلمانوں کو لوٹتا مارتا اور اپنی حکومت قائم کر لیتا، خود بھاگ کھڑا ہوا، سر پر پاؤں رکھ کے، بے تحاشہ!"

دیول دیوی :" طرغی خاں بغیر لڑے ہوئے بھاگ کھڑا ہوا؟ بڑا کایر معلوم ہوتا ہے —— کیوں آخر؟"

کرن سنگھ :" اب مَیں کیا بتاؤں بیٹی؛ ہماری قسمت! ہم نے سوچا کچھ تھا، ہوا کچھ، ساری تدبیر پلٹ گئی، سارا کھیل بگڑ گیا، بساط ہی اُلٹ گئی اپنی!"

دیول دیوی :" لیکن آخر وہ بھاگا کیوں؟ یہ تو عجب ماجرا ہے، بھلا اتنی بڑی فوج بغیر لڑے ہوئے بھی بھاگ سکتی ہے کہیں؟"

کرن سنگھ :" اور اتنی بڑی فوج کسی اَور کی بھی نہیں تاتاریوں کی، یہ وہی تاتاری تو ہیں جو آج تک کبھی میدان سے نہیں بھاگے۔ لیکن مسلمانوں کا اقبال دیکھ لو، بغیر لڑے ان کے سامنے سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ نہ جانے بھگوان نے کیا سوچا ہے۔ ہمیں تو اپنی تباہی ہی تباہی نظر آ رہی ہے ——!"

دیول دیوی :" اَور کیا پتا جی، —— آخر قتلغ خواجہ خود کیوں نہیں گیا، طرغی خاں کو

کیوں پھنسا دیا؟"

کرن سنگھ:- "بھی میرے سفیر سے اس نے یہی کہا تھا۔ کہنے لگا، جو کام طرغی کر سکتا ہے، وہ میں کیوں کروں۔ کبھی کوئی جوکھم کا کام پڑا تو چلا جاؤں گا۔ وہ بھی میرا خاص آدمی ہے۔ ہوشیار، تجربہ کار ——!"

دیول دیوی:- "واہ بڑا اچھا جواب دیا، —— اب تو طرغی خاں بھاگ آیا۔ اس سے بڑھ کر جوکھم کا وقت کیا ہوگا؟ پھر کہئے قتلغ خواجہ سے اب چڑھ دوڑے دلی پر! طرغی خاں کے بھاگ جانے سے خلجی اور زیادہ مطمئن ہو گیا ہوگا، یوں یک بیک اگر قتلغ خواجہ کوئی بڑی فوج لے کر پہنچ گیا تو بھاگتے نہیں بن پڑے گا خلجی سے!"

کرن سنگھ ہنسنے لگا۔ اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا:-

"ارے میری بیٹی! تُو راج کے معاملات کو بھی خوب سمجھتی ہے۔ بڑے پتہ کی بات کہی تُونے اس وقت —— میں نے قتلغ خواجہ کو ابھی پیام بھیجا ہے، بالکل یہی!"

دیول دیوی:- "پھر اس نے کیا جواب دیا؟ کرے گا حملہ دلی پر یا نہیں؟"

کرن سنگھ:- "وعدہ تو کیا ہے، بلکہ میرا آدمی دیکھ کر آیا ہے کہ طرغی خاں سے بھی کئی گنا لشکر تیار ہو رہا ہے اور بہت جلد قتلغ خواجہ یہ لشکرِ گراں لے کر دلی کی طرف کوچ کرے گا!"

دیول دیوی۔ (خوش اور مسرور ہو کر گردن ہلاتے ہوئے) "ہاں اب مزا آئے گا، —— کیوں پتا جی! اب خلجی کو بھاگتے راستہ نہیں ملے گا! ساری شرارتوں کا بدلہ سارا کا سارا ایک ہی دفعہ میں مل جائے گا!"

کرن سنگھ:- "ہاں بیٹی! —— اگر قتلغ خواجہ بھی طرغی کی طرح بھاگ نہ کھڑا ہوا ——!"

دیول دیوی:- "تو کیا وہ بھی کائر ہے؟ تاتاری ایسے ہی نکمے ہوتے ہیں پتا جی؟"

کرن سنگھ:۔ "نہیں بیٹی ــــــ کائر کون ہے؟ ــــــ مَیں کائر ہوں؟ لیکن اسے کیا کہا جائے کہ مسلمان کے سامنے جا کر سب ہی کائر (بزدل) بن جاتے ہیں، بڑے بڑے سُورما کانپنے لگتے ہیں، ورنہ قتلغ خواجہ وہ شخص ہے کہ اگر چاہے تو ساری دُنیا کو فتح کر لے۔ اس کا ایک ایک سپاہی دس دس آدمیوں پر بھاری ہے!"

دیول دیوی:۔ "بس تو پتاجی، اب چنتا نہ کیجئے۔ میرا دل کہہ رہا ہے کہ قتلغ خواجہ ضرور مسلمانوں کو ایسی شکست دے گا جسے وہ زندگی بھر یاد رکھیں گے!"

کرن سنگھ:۔ "بھگوان تیرا کہا پُورا کریں۔ مَیں تو اس دن لڈّو تقسیم کروں گا، لیکن بیٹی تُو نے مجھے دُوسری باتوں میں اُلجھا دیا، مَیں اس وقت کسی اَور کام سے آیا تھا تیرے پاس!"

دیول دیوی:۔ "تو کہئے پتاجی، وہ کون سا کام ہے جو آپ کو میرے پاس لایا ہے؟ مَیں تو آپ کی داسی (لونڈی) ہوں۔ آپ کی سیوا (خدمت) ہی میری زندگی کا مقصد ہے! جی چاہتا ہے قربان ہو جاؤں آپ پر سے!"

شفقت سے بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھ کر محبت بھرے لہجہ میں کرن سنگھ نے کہا:۔

"مَیں جانتا ہوں بیٹی تُو مجھے کتنا چاہتی ہے۔ لیکن میں بھی تو دُنیا میں سب سے زیادہ تجھی سے پریم کرتا ہوں!"

رادھا کو اب موقع مل گیا۔ وہ تڑسے بولی:۔

"یہ تو مہاراج سے اتنا زیادہ پریم کرتی ہیں کہ بیاہ تک پر تیار نہیں۔ کہتی ہیں مَیں اپنے پتا کو چھوڑ کر کہیں نہیں جانے کی ــــــ!"

کرن سنگھ (غصہ میں) "چپ ــــــ بے وقوف کہیں کی؟ تُو کیوں ہمارے بیچ میں

بول پڑی ! ________ (دیول دیوی سے مخاطب ہوکر) ہاں بیٹی، تو مَیں اس لئے آیا تھا کہ تجھے یہ خبر سُنا دوں، ہم نے تیرے لئے ایک بڑا اچھا بر ڈھونڈ لیا ہے۔ ایسا بر قسمت ہی سے مل سکتا ہے کسی لڑکی کو !"

رادھا۔ (بظاہر بہت خوش ہوکر)" اچھا کیا مہاراج ! مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے۔ اب ہماری راجکماری دُلہن بنے گی، شادی ہوگی۔ دھوم سے بارات آئے گی، ایسی ٹھاٹھ دار شادی ہوا یسی ٹھاٹھ دار کہ دُنیا میں اس کی مثال نہ مل سکے۔ کیوں مہاراج ________ ؟"

کرن سنگھ۔ (مونچھوں کو تاؤ دے کر)" اور کیا، دل کے سارے حوصلے اسی شادی میں تو نکالوں گا! یہی میری لڑکی ہے، یہی میرا لڑکا، اس کے سوا اور میرا ہے کون اس دُنیا میں ؟"

رادھا۔" وہ تو میں جانتی ہوں، بھلا راجکماری سے بڑھ کر اور کون ہوسکتا ہے، جس کے لئے اتنا اہتمام کیا جائے۔ تو کب ہوگی شادی مہاراج ________ ؟ "

کرن سنگھ۔" بس بہت جلد۔ مہینہ ڈیڑھ مہینہ میں ________ راجکمار کی طرف سے تو بڑی جلدی ہورہی ہے۔ لیکن مَیں نے بڑی مشکل سے اتنی مہلت لی ہے۔ اتنی مدت میں سارے انتظامات مکمل ہوجائیں گے !"

رادھا۔ (بچّوں کی طرح ٹھنک کر)" وہ تو ہوجائیں گے۔ لیکن مہاراج آپ نے بہت زیادہ مہلت لے لی۔ بھلا یہ اتنے سارے دن کس طرح کٹیں گے ہم سے ؟ ________ میں تو آج ہی سے ایک ایک دن گنوں گی۔ بھگوان وہ دن جلدی لائیں جب ہماری راجکماری دولہن بنے گی!"

کرن سنگھ۔ (مسکرا کر)" واقعی تُو بڑی بے وقوف ہے۔ مہینہ ڈیڑھ مہینہ کی مدت کی کوئی حیثیت ہوتی ہے ؟ (چٹکی بجا کر) یوں گزر جائے گی پلک جھپکاتے میں ! ________ تجھے بھی راجکماری کے ساتھ جانا پڑے گا !!"

رادھا ۔" سر کے بل جاؤں گی مہاراج، بھلا میں کہیں اپنی راجکماری سے بدل سکتی ہوں ۔ جہاں وہ وہاں مَیں! ——— جیسے گوشت اور ناخن!"

کرن سنگھ ۔ (مسکرا کر) " بڑی باتونی ہے تو رادھا! (دیول دیوی سے مخاطب ہو کر) کیوں بیٹی! ٹھیک ہے نا؟"

دیول دیوی ۔" جی یہ بڑی شریر ہے، بڑی چنچل! مَیں تو عاجز ہوں اس سے!"

کرن سنگھ ۔" بیٹی مَیں رادھا کے بارے میں نہیں پُوچھتا، تیرے بیاہ کے بارے میں پُوچھ رہا ہوں ۔ تجھے منظور ہے نا یہ شادی؟"

دیول دیوی ۔ (جی کڑا کر کے، آنکھوں میں آنسو بھر کے) "نہیں پتاجی!" ——— اور کہہ کر وہ پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگی ۔

کرن سنگھ گھبرا گیا ۔ اس نے دیول دیوی کو سنبھالا اور بڑے پیار بھرے لہجہ میں کہا ۔" بیٹی! گوبند پرشاد تو بڑا اچھا آدمی ہے ۔ کیا تُو اُسے ناپسند کرتی ہے؟"

دیول دیوی نے روتے ہوئے کہا ۔" ہاں پتاجی، وہ کاڑ ہے، اور مَیں کاڑ سے نفرت کرتی ہوں!"

کرن سنگھ حیرت سے بیٹی کا مُنہ دیکھنے لگا ۔ رادھا نے اُس دن کی ساری داستان سنا ڈالی ۔ وہ بھی خوب نمک مرچ لگا کر ۔ کرن سنگھ سنتا رہا ۔ پھر تیوری چڑھا کر کہنے لگا ۔

"واقعی بڑا کاڑ معلوم ہوتا ہے، ہرگز اپنی بیٹی کی اس سے شادی نہ کروں گا!"

کرن سنگھ نے بڑی شان سے یہ فیصلہ سنایا، اور مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا چلا گیا ۔ رادھا اور دیول دیوی مسکرانے لگیں ۔ راجکماری نے رادھا سے کہا :۔

"کیوں دیکھا؟!"

بادشاہ اور رانی !

فلکِ کج رفتار کسی کو خوش و خرّم نہیں دیکھ سکتا۔ اسے لوگوں کو جلانے اور کڑھانے ہی میں لطف آتا ہے۔ مہاراج کرن سنگھ نے جب گوبند پرشاد کو کاذِر قرار دے کر مردود قرار دیا، تو رادھا اور اچلما دیول دیوی کو بہت خوشی ہوئی تھی۔ لیکن اس خوشی کی عمر بہت کم تھی۔ چند ہی روز کے بعد یہ خوشی ایسے غم سے بدل گئی جو روح فرسا بھی تھا اور جان لیوا بھی!

طرغی خاں جب اپنا لاؤ لشکر لے کر واپس چلا گیا تو علاءالدین خلجی نے اپنے نظامِ مملکت کو از سرِ نو مرتب اور منضبط کیا۔ جہاں اس نے اور بہت سی اصلاحیں کیں، اور حفظ و دفاع اور حملہ و ہجوم کی تیاریاں عمل میں لایا۔ وہاں اس نے جاسوسی نظام کو وسیع کیا اور سب سے پہلے اس طرف توجہ کی کہ آخر تاتاریوں کی یہ یورش کیوں اور کیسے ہوئی تھی؟ —— اس کے محرکات کیا تھے اسباب و عوامل کیا تھے؟ —— بہت جلد معلوم ہو گیا یہ گجرات کے مہاراجہ کرن سنگھ کی سازش کا نتیجہ تھا جو اب بگلانہ میں بیٹھا سازشوں اور شرارتوں پر کمربستہ ہے!

علاءالدین خلجی جب شہزادہ تھا تب بھی یہ بات اس کے لئے ناقابلِ برداشت تھی کہ کوئی سرکشی کرے اور وہ اسے نظرانداز یا معاف کر دے، اور اب تو وہ شہنشاہِ دوراں تھا۔ ہندوستان کے طول و

عرض میں اس کی سطوت و جلالت کا کوئی حریف نہ تھا۔ وہ یہ کیونکر گوارا کر سکتا تھا کہ ایک ماتحت دشمن دور دراز مقام پر بیٹھ کر ایک غیر ملک کے سفاک ترین فرمانروا سے اس کے خلاف ساز باز کرے۔ جب اسے معلوم ہُوا کہ طرغی خاں، قتلغ خواجہ کی اجازت سے اور کرن سنگھ کی شہ پا کر آیا تھا، اس کا خون کھول گیا۔ اس نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ کرن سنگھ کی سرکوبی کی جائے گی۔ اور یہ فیصلہ کرنے کے بعد اس نے ایک لمحہ بھی توقف نہیں کیا۔ ایک فوجِ گراں لے کر طوفانِ گرد و باد کی طرح دِلّی سے اُٹھا اور بنگالہ کا محاصرہ کر لیا۔ کرن سنگھ بڑا اجیالا اور منچلا راجہ تھا۔ لیکن علاءالدین کی اس جارحانہ پیش قدمی کے اس رنگ اور اس انداز کو دیکھ کر سہم گیا۔ وہ دل میں سوچنے لگا، جو بادشاہ اتنی بڑی فوج لے کر اتنی تیزی سے راستہ کی دشواریوں اور صعوبتوں کو جھیلتا ہُوا آ سکتا ہے، اس کے غضب سے پناہ پانی واقعی مشکل ہے۔ پہلے تو اس نے کوشش کی کہ صلح کر لے، اور شاید خلجی تھوڑی سی تادیب کے بعد اس پر راضی ہو جاتا، پھر اسے اپنے وسیع اور بے پناہ ذرائع اور وسائل کا خیال آیا۔ اپنی ٹڈی دل فوج کو دیکھ کر حوصلہ بڑھا۔ یہ یاد آیا کہ قتلغ خواجہ دلّی کی طرف کوچ کر رہا ہے، اور اس مرتبہ ضرور دلّی مغلوں کے قبضہ میں آ جائے گی، اور خلجی کا سر سڑکوں پر ٹھوکریں کھاتا پھرے گا۔ اس خیال نے اس کے حوصلہ میں ایک استحکام پیدا کر دیا، اور وہ لڑنے مرنے پر تیار ہو گیا۔ اس نے ایک طرف تو یہ کیا، کہ احتیاطاً ایک قاصد بھی قتلغ خواجہ کی طرف بھیج دیا۔ اس نے تاکید کی کہ علاءالدین خلجی مجھ سے لڑنے کے لئے دلّی چھوڑ کر بنگالہ میں آ گیا ہے۔ مَیں اگرچہ اتنی طاقت نہیں رکھتا ہوں کہ اس سے سر بر ہو سکوں، لیکن اتنا حوصلہ ضرور رکھتا ہوں کہ اسے اُلجھائے رکھوں۔ مَیں اسے یہاں روکے ہوئے ہوں۔ آپ اس موقع سے فائدہ اُٹھایئے اور اپنی فوجِ گراں لے کر دلّی کی طرف بڑھیئے۔ وہاں اب کسی میں اتنا دم نہیں ہے کہ مغلوں کی یورش کا مقابلہ کر سکے۔ بادشاہ کی غیر حاضری کی وجہ سے بہت جلد عوام و خواص کے حوصلے چھوٹ جائیں گے، وہ امان طلب کریں گے اور حلقۂ اطاعت گلے میں ڈال لیں گے!

عین اس وقت جب علاء الدین خلجی راجہ کرن سنگھ کے ایلچی سے عذر و معذرت کی باتوں پر غور کر رہا تھا اور معافی نامہ کا اعلان کرنے والا تھا کہ ملک کافور، خلجی کا وفادار، جاں نثار اور کارگزار غلام کرن سنگھ کے ایلچی کو مع خط کے گرفتار کرکے لے آیا، جو قتلغ خواجہ کے پاس جا رہا تھا۔ ملک کافور نے وہ خط اپنے آقا کو سنایا، اور ایلچی کو پیش کرتے ہوئے دست بستہ عرض کیا :۔

" کیا اتنے کمینے اور روباہ صفت دشمن سے بھی آپ صلح و سلام کی گفتگو جاری رکھیں گے، جو ایک طرف آپ کے پاس اپنا ایلچی بھیج کر صلح کی باتیں کرتا ہے، اور دوسری طرف قتلغ خواجہ کے پاس اپنا ایلچی بھیج کر اسے اکساتا ہے کہ وہ پوری درندگی، بہیمیت اور سفاکی کے ساتھ اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر دلّی پر ٹوٹ پڑے ؟ "

خلجی نے ملک کافور کی یہ باتیں سُن کر عالمِ جلال میں ارشاد کیا :۔

" اِن دونوں ایلچیوں کو گرفتار کر لو، اور کرن سنگھ کو مطلع کر دو کہ اب ہماری تمہاری گفتگو میدانِ جنگ میں ہوگی ! "

کرن سنگھ کو بھی پتہ چل گیا تھا کہ چوری پکڑی گئی۔ لہٰذا اب وہ بھی زور شور سے جنگی تیاریاں کرنے لگا۔ ممکن تھا، خلجی یہاں زیادہ ٹھہرتا اور زیادہ اطمینان و یک سُوئی کے ساتھ کرن سنگھ پر حملہ کرتا، لیکن گرفتار شدہ خط سے معلوم ہو گیا تھا کہ قتلغ خواجہ کو دلّی پر حملہ کرنے کی ترغیب دی جا چکی ہے۔ وہ تیاریوں میں منہمک ہے اور ہر آن اس کا اندیشہ ہے کہ وہ اپنی فوجِ گراں لے کر پہنچ جائے۔ اگرچہ حفظ و دفاع کے انتظامات بڑی حد تک خلجی نے کر لئے تھے، لیکن یہ بات کسی اعتبار سے بھی جائز نہ تھی کہ ایسے موقع پر دارالسلطنت سے دُور رہے۔ چنانچہ وہ جلد از جلد اس جنگ کو سر کر کے دلّی جانا چاہتا تھا۔ دُوسرے ہی دن اس نے کرن سنگھ کی فوج پر بھرپور حملہ کیا، یہ فوج ایک عرصہ سے جنگ کی تیاریاں کر رہی تھی اس کے پاس نہ آدمیوں کی کمی تھی، نہ مال و زر کی، نہ ساز و سامانِ جنگ کی۔ ہاں اس حوصلہ اور

اس جذبہ کا فقدان ضرور تھا جو صرف علاء الدین خلجی، ہزبرالدین، ظفر خاں، الماس بیگ، ملک کافور، الغ خاں اور دوسرے سرداروں کے سینہ میں موجزن تھا۔ بلکہ خلجی فوج کا ہر ہر سپاہی اسی جذبہ سے سرشار تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اگرچہ کرن سنگھ بہادری سے لڑا۔ اس کی فوج نے بھی شروع میں تہوّر اور شجاعت کا مظاہرہ کیا۔ لیکن جب خلجی خود فوج کی کمان کرتا ہوا میدان میں اُترا، اور اس نے مُولی گاجر کی طرح کرن سنگھ کے سورماؤں کو کاٹنا شروع کر دیا، تو سب کے حوصلے ختم ہو گئے، اور وہی لوگ جو یہ عہد کر کے میدانِ جنگ میں اُترے تھے کہ خون کے آخری قطرہ اور زندگی کی آخری سانس تک دشمن سے جنگ جاری رکھیں گے، زندگی بچا کر بھاگنے لگے۔ پاؤں اس طرح اُکھڑے کہ لاکھ لاکھ کرن سنگھ نے غیرت دلائی، انعام و اکرام کے وعدے کئے۔ اپنے غضب سے ڈرایا، مگر کسی پر کچھ اثر نہ ہوا۔ سب کی پیٹھ میدانِ جنگ کی طرف تھی اور منہ کسی کا مشرق کی طرف، کسی کا مغرب کی طرف، اور کسی کا جنوب کی طرف۔ سب حواس باختہ تھے، اور بے تحاشہ بھاگ رہے تھے۔ ایک کی دوسرے کو خبر نہ تھی۔ کوئی کسی کا پُرسانِ حال نہ تھا، قومی غیرت اور ملّی حمیّت اور جذبۂ حرب و پیکار، کسی چیز کا وجود باقی نہیں رہ گیا تھا۔ جب کرن سنگھ بالکل مایوس ہو گیا اور اسے یقین ہو گیا، اب ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر اگر وہ رو بہ فرار نہ آیا، تو پھر گرفتار ہونے یا قتل ہونے سے نہ بچ سکے گا، تو وہ بھی ہر چیز سے بے پروا ہو کر بھاگ کھڑا ہوا۔ یہاں تک کہ رانی کنول دیوی تک کو اپنے ساتھ نہ لے جا سکا۔ مالِ غنیمت کے علاوہ اس کا خیمہ بھی آیا۔ خلجی سپاہیوں کا خیال تھا کہ دوسرے شاہی خیموں کی طرح یہ خیمہ بھی خالی ہو گا، اور اس کے مکین بھاگ کر کہیں سے کہیں پہنچ چکے ہوں گے۔ لیکن یہ دیکھ کر وہ حیران رہ گئے کہ رانی کنول دیوی اپنے زاہد فریب حسن و جمال اور قابلِ رحم بے بسی کے ساتھ یہاں موجود تھی۔ صرف چند کنیزیں تھیں اور کوئی ساتھی نہ تھا۔ کنیزیں بھی رو رہی تھیں، اور رانی کنول دیوی کی آنکھوں سے بھی ساون بھادوں کی جھڑی لگی تھی۔ فوراً خلجی کو خبر کی گئی۔ اس نے حکم صادر کیا کہ رانی کنول دیوی

کو شاہی اعزاز و احترام کے ساتھ شاہی خیمہ میں پہنچا دیا جائے!

یہ دن تو زخم خوردہ سپاہیوں کی مرہم پٹی اور شہداء کی تدفین میں بسر ہُوا۔ دوسرے دن خلجی اپنی فوج کو لے کر شاداں و فرحاں دلّی واپس ہوگیا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ کرن سنگھ کا تعاقب کرے، اور اسے قرار واقعی سزا دے کر واپس ہو۔ لیکن پھر اس نے سوچا، کرن سنگھ کو ہر وقت سزا دی جا سکتی ہے۔ لیکن اگر کہیں اس وقت مغل لشکر دلّی پہنچ گیا۔ اور اس نے محاصرہ کر لیا یا جنگ چھیڑ دی، تو پھر معاملات اتنے نازک ہو جائیں گے کہ ان کی اصلاح کسی طرح نہ ہو سکے گی۔ یہی سوچ کر اس نے کرن سنگھ کو تو نکل جانے دیا، اور خود مالِ غنیمت سے لدا پھندا، دلّی کی طرف مُڑ گیا رانی کنول دیوی اس کے ساتھ تھی!

اگرچہ رانی کے ساتھ اس کے شایانِ شان سلوک کیا جا رہا تھا۔ بہت سی کنیزیں اس کی خدمت پر مامور کر دی گئی تھیں، اس کے رہنے سہنے اور اُٹھنے بیٹھنے کا بھی ویسا ہی انتظام کر دیا گیا تھا جیسا خود اس کے راج محل میں تھا۔ لیکن بہرحال اب وہ رانی نہیں تھی۔ کنیز تھی، اور اس وقت مروّجہ قانون کے مطابق صرف اس لئے زندہ تھی کہ کسی سردارِ فوج، یا کسی کو بطور عطیہ دے دی جائے یا فروخت کر دی جائے۔ اسے سب سے بڑا غم دیول دیوی کا تھا، جو باپ کے ساتھ بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ وہ اپنی بیٹی کو بہت زیادہ چاہتی تھی، یہ محبت کی انتہا تھی کہ وہ اس پر خوش نہیں تھی کہ وہ بچ گئی۔ اس پر رنجیدہ تھی کہ یہاں کیوں نہیں ہے؟ آنکھ کے سامنے کیوں نہیں ہے؟ وہ اس کی آنکھوں سے اوجھل تھی، اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس دُنیا کی رونق چہل پہل گہما گہمی، ہر چیز ختم ہو گئی ہے!

دلّی پہنچنے کے بعد علاء الدین خلجی نے اسے اپنے حضور میں طلب کیا۔ بہت سی کنیزوں کے

جلو میں وہ بادشاہ جمجاہ کے سامنے لرزتی اور کانپتی ہوئی پہنچی۔ اس کی رائے نہ مسلمانوں کے بارے میں اچھی تھی، نہ خلجی کے بارے میں۔ لیکن بنگالہ سے یہاں تک اس کے ساتھ جو سلوک ہوا تھا، اس نے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ یہ لوگ چاہے جیسے ہوں، لیکن اچھے انسان ضرور ہیں!

علاءالدین خلجی کی سلطنت، اس کے محل کی وسعت، غلاموں اور لونڈیوں کی کثرت، شاہی جاہ و جلال، آن اور شان دیکھ کر وہ مرعوب بھی ہو گئی تھی۔ بگلانہ سے جب تک باہر اس نے قدم نہیں نکالا تھا، اس نے کرن سنگھ کے علاوہ کسی کے بارے میں یہ خیال نہیں کیا تھا کہ وہ جاہ و جلال اور خدم و حشم کا مالک ہو سکتا ہے، لیکن اب اس کے سامنے جو شخص تھا، یہ شان و شکوہ میں کرن سنگھ سے کہیں زیادہ تھا۔ کرن سنگھ کو وہ دُنیا کا سب سے بڑا تاجدار اور کشورکشا سمجھتی تھی۔ لیکن اب علاءالدین خلجی کی مملکت میں پہنچ کر اس نے محسوس کیا، نہیں کرن سنگھ تو صرف ایک راجہ تھا، ایک چھوٹے سے خطہ کا بادشاہ۔ شہنشاہ تو علاءالدین خلجی ہے، جو کسی ایک ریاست کا نہیں، پورے ملک کا بادشاہ ہے ——— !"

کنول دیوی خلجی کے سامنے کھڑی تھی، اور یہی باتیں اس کے دماغ کے پردے ٹکرا رہی تھیں۔ اتنے میں اس کے کانوں میں ایک باوقار آواز گونجی:-

"رانی تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں پہنچی؟ ——— ہم نے خاص طور پر ہدایت کر دی تھی کہ تمہاری راحت و آسائش کا خیال رکھا جائے، تمہاری ہر خواہش پوری کی جائے!"

رانی کنول دیوی نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا:-

"نہیں شہنشاہ، کنیز کو کوئی تکلیف نہیں پہنچی۔ اس کے مرتبہ سے زیادہ اس کی راحت و آسائش کا خیال رکھا گیا!"

علاءالدین خلجی:- "ہمیں مسرت ہے! ——— ہمیں خوشی ہے کہ تم آرام سے یہاں تک پہنچیں!

بتاؤ اب تم کیا چاہتی ہو؟"

رانی کنول دیوی :- "کنیز اس سوال کا مطلب نہیں سمجھی!"

علاء الدین خلجی :- "ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ اپنے مستقبل کے بارہ میں تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟"

رانی کنول دیوی :- "کیا ایک لونڈی بھی اپنے مستقبل کے بارہ میں کوئی فیصلہ کر سکتی ہے؟ میں جنگ کے میدان میں گرفتار ہوئی ہوں۔ میری حیثیت اب صرف ایک کنیز کی ہے۔ رائج الوقت قاعدے کے مطابق یا فروخت کر دی جاؤں گی یا کسی کو بطور انعام کے مرحمت کر دی جاؤں گی۔ ہمیشہ سے یہی ہوتا آیا ہے، اب بھی یہی ہوگا۔ میرے لئے ملک کا قانون تو بدل نہیں سکتا!؟"

یہ کہہ کر رانی کنول دیوی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ علاء الدین خلجی اس کے گریۂ بے اختیار سے بہت متأثر ہوا۔ اس نے کہا:-

"نہیں رانی، تم نے ہمیں غلط سمجھا۔ تم نے مسلمانوں کو غلط سمجھا۔ ہمیں اس کا افسوس ہے یہ سچ ہے کہ میدانِ جنگ میں جو چیز بھی حاصل ہو وہ فاتح کی ملکیت بن جاتی ہے اور یہ بھی درست ہے، جو قیدی گرفتار ہوتے ہیں، وہ غلام بنا لئے جاتے ہیں۔ لیکن ہم عام قاعدے پر نہیں چلتے، صرف اسلام کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے ہیں۔ اور اسلام کا یہ حکم ہے کہ اگر قیدی کو غلام بناؤ تو صرف اس وقت جب وہ فدیہ نہ ادا کر سکے۔ اگر تم فدیہ ادا کر سکتی ہو تو ابھی رہا کر دی جاؤ گی۔"

یہ سن کر رانی کنول دیوی کا افسردہ اور مضمحل چہرہ چمک اٹھا۔ اس نے بڑی مسرت اور بے تابی کے ساتھ دریافت کیا:-

"جہاں پناہ! کیا مجھے رہائی مل سکتی ہے؟ ——— لیکن فدیہ کیا ہے؟ میں نہیں جانتی!"

علاء الدین نے تبسم کرتے ہوئے جواب دیا:-

"ہاں تمہیں رہائی مل سکتی ہے بشرطیکہ فدیہ ادا کرو ——— فدیہ وہ معاوضۂ رہائی ہے جو

قیدی ادا کرتا ہے۔ فدیہ کی رقم کتنی ہو اس کا فیصلہ صرف بادشاہ یا اس کی عدم موجودگی میں سپہ سالار ہی کر سکتا ہے!"

علاءالدین خلجی یہ باتیں کر رہا تھا، اور رانی کنول دیوی کچھ سوچ رہی تھی۔ لیکن وہ کوئی ایسی بات تھی جس نے اس کی بشاشت اور مسرت کو کافور کر دیا تھا۔ افسردگی اور پریشانی کی کیفیت اس کے چہرہ سے عیاں تھی۔ یہ فوری تغیر دیکھ کر خلجی کو حیرت ہوئی۔ لیکن اس نے کچھ کہا نہیں، صرف غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ جب رانی نے کوئی جواب نہیں دیا تو خلجی نے پوچھا:۔

"بتاؤ کیا تم فدیہ دینے پر رضامند ہو؟"

رانی نے ہونٹوں کو دباتے ہوئے بڑے کرب اور تکلیف سے کہا:۔

"نہیں جہاں پناہ، میں فدیہ نہیں دے سکتی!"

علاءالدین خلجی۔ "تعجب ہے، ———— اچھا تم ہماری مہمان ہو۔ ہم کرن سنگھ کو لکھتے ہیں کہ وہ تمہیں فدیہ بھیج کر واپس منگا لے، ———— یہ تو منظور ہے؟"

رانی نے پھر صاف انکار کر دیا۔ کہنے لگی:۔

"نہیں جہاں پناہ، میں یہ نہیں چاہتی کہ میرے فدیہ کے لئے انہیں تکلیف دی جائے!"

علاءالدین:۔ "عجیب بات ہے نہ خود فدیہ دینے پر رضامند ہو، نہ اسے گوارا کرتی ہو کہ کرن سنگھ سے منگایا جائے، پھر آخر تم کیا چاہتی ہو؟ ———— ہم واقعی اپنا قانون نہیں بدل سکتے، تمہیں کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔ دونوں میں سے کوئی ایک صورت اختیار کرنا پڑے گی!"

رانی نے تمکنت کے ساتھ کہا:۔

"جہاں پناہ، یہ کچھ نہیں ہو سکتا۔ میں فدیہ اس لئے نہیں دے سکتی کہ میرے پاس کچھ ہے نہیں، اور مہاراج سے میں دلوانا نہیں چاہتی۔ یہ بھی نہیں چاہتی کہ میرے لئے آپ اپنا قانون بدلیں۔ مجھے لونڈی کی حیثیت سے کسی کے حوالے کر دیجئے، وہیں ساری عمر چاکری کر کے گزار دوں گی!"

علاء الدین خلجی ۔ (متاثر ہوکر) "واہ کہیں ایسا ہو سکتا ہے ـــــــ کرن سنگھ سے ہماری لڑائی ہے۔ لیکن کسی حالت میں بھی اس کی غداری اور نمک حرامی کا انتقام ہم ایک خاتون سے نہیں لے سکتے۔ ـــــــ اچھا تو تمہارے فدیہ کی رقم ہم اپنی جیب سے ادا کر دیں گے، اور اعزاز و احترام کے ساتھ تمہیں کرن سنگھ کے پاس بھیج دیں گے۔ ـــــــ اس پر تو کوئی اعتراض نہیں ہے تمہیں ؟"

رانی کنول دیوی ۔ "اَن داتا ! مجھے یہ صورت بھی منظور نہیں !"

عجیب قسم کی عورت سے خلجی کو پالا پڑا تھا۔ اسے غصہ آگیا، اور اُٹھ کر ٹہلنے لگا۔ اس نے کہا :-

"معلوم ہوتا ہے گرفتاری کے صدمہ نے تمہارا دماغ مختل کر دیا ہے ـــ !"

رانی کنول دیوی ۔ "نہیں جہاں پناہ ! یہ بات بھی نہیں، ـــــــ سچی بات یہ ہے کہ میں اب مہاراج کے پاس واپس ہی جانا نہیں چاہتی !"

یہ سُن کر خلجی پر سکتہ کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ کچھ دیر تک تو وہ بالکل خاموش رہا۔ پھر اس نے کہا :

"رانی ! تم اپنے گھر جانا نہیں چاہتیں ؟ اپنے شوہر کے پاس جانا نہیں چاہتیں ؟ اپنے راج محل جانا نہیں چاہتیں ؟ اور ان کو چھوڑ کر کسی کی داسی بننا چاہتی ہو ؟ ـــــــ کیا ہو گیا ہے تمہیں ؟ نہیں تمہیں جانا پڑے گا !"

یہ سُنتے ہی رانی کنول دیوی نے خلجی کے پاؤں پکڑ لئے۔ اس نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا :

"مجھ پر کرپا کیجئے، دیا کیجئے ـ وہاں بھیج کر مجھے ایسی مصیبت میں مبتلا نہ کیجئے، جس سے جیون بھر چھٹکارا نہ مل سکے !"

علاء الدین خلجی ۔ "جو تم کہتی ہو، ہم مان لیں گے۔ نہیں بھیجیں گے تمہیں وہاں لیکن یہ تو بتاؤ ایسا کیوں چاہتی ہو ؟ یہ ہماری زندگی کا پہلا واقعہ ہے کہ اس طرح کی درخواست کسی قیدی نے

ہم سے کی ہو!؟

رانی کنول دیوی: "آپ نے یہ دیس فتح کرلیا ہے۔ لیکن ابھی آپ ہم سے، ہمارے سماج سے، ہمارے رہن سہن سے واقف نہیں ہوئے ہیں، —— یہاں میں غیروں میں رہوں گی۔ داسی (لونڈی) بن کر رہوں گی۔ میرے دل میں کبھی یہ تمنا نہیں مچل سکتی کہ میری عزت کی جائے، میرا مان کیا جائے، میری توقیر کی جائے۔ ذلت سہوں گی، اور یہ سوچ کر سہوں گی کہ داسی اسی لئے ہوتی ہے۔ لیکن وہاں جا کر میں ذلیل کی جاؤں گی۔ میرے ساتھ اچھوتوں کا سا برتاؤ کیا جائے گا، شوہر ٹھکرا دے گا، دیس والے منہ چڑائیں گی، میں اب ناپاک ہو چکی، نظر سے گر چکی، اب میرا گھر جہنم سے بدتر ہے میرے لئے، مجھے وہاں نہ بھیجئے، آپ کو ایشور کا واسطہ دیتی ہوں، یہ ارادہ ترک کر دیجئے!؟"

ملکجی بڑے غور سے رانی کنول دیوی کی باتیں سُن رہا تھا۔ پھر اس نے کہا:-

"تم اس قدر پریشان کیوں ہو؟ —— آخر تمہارے ساتھ ذلت اور حقارت کا برتاؤ کیوں ہوگا؟ —— تم نے کوئی پاپ نہیں کیا ہے، کوئی گناہ نہیں کیا ہے، تم اتنی پاک اب بھی ہو جتنی یہاں آتے وقت تھیں۔ تمہارے بدن میں کسی نے ہاتھ نہیں لگایا، تمہیں کسی نے بُری نظر سے نہیں دیکھا، اگر کسی گستاخ نے ایسا کیا ہو تو تم نشان دہی کرو، ابھی اس کی گردن تمہارے قدموں میں لوٹتی نظر آئے گی!"

رانی کنول دیوی: "ان داتا! یہ سب کچھ سچ ہے جو آپ نے کہا، لیکن جب سیتا جیسی عورت راون کی قید میں رہنے کے بعد رام جیسے اوتار کا شک نہ دُور کر سکی، تو میں تو بہرحال ایک معمولی عورت ہوں، سیتا جی کا مقابلہ نہیں کر سکتی، وہاں اب میری کوئی عزت نہ ہوگی، اور یہ میں گوارا نہیں کر سکتی کہ جہاں پہلے میں نے راج کیا، وہاں اب داسیوں سے زیادہ ذلت کی زندگی بسر کروں، جب ذلت کی زندگی ہی بسر کرنی ہے تو پھر اپنوں میں کیوں؟ غیروں میں کیوں نہیں؟"

علاءالدین خلجی:۔ "رانی ہمیں بڑا دُکھ ہو رہا ہے یہ باتیں سُن کر، اگر ہمیں پہلے سے یہ معلوم ہوتا تو ہم اسی وقت تمہیں رہا کر دیتے جب تم گرفتار ہوئی تھیں۔ یہ ہماری غلطی ہے۔ اس کی سزا اگر ملنی چاہئے تو ہمیں۔ تم بالکل بے خطا ہو، تم یہ سزا کیوں بھگتو؟"

رانی کنول دیوی:۔ "جہاں پناہ! یہ قسمت کا معاملہ ہے، نہ آپ کچھ کر سکتے ہیں، نہ میں کچھ کر سکتی ہوں۔ جو کچھ ہونا تھا ہو گیا۔ قسمت کا پانسہ پلٹا اور دم کے دم میں کچھ سے کچھ ہو گیا۔ دُنیا کی یہی ریت ہے، اور اس ریت کو کوئی نہیں بدل سکتا، ——— بھگوان بھی نہیں۔ باقی آپ نے میرے ساتھ جو مہربانی کا سلوک کیا ہے، اسے میں زندگی بھر نہیں بھُولوں گی۔ میں نے آپ کی بڑی بُرائیاں سُنی تھیں۔ مسلمانوں کے بارے میں جو شبد (الفاظ) میرے کانوں میں پڑے تھے، وہ اچھے نہیں تھے، لیکن بنگلانہ سے یہاں تک میں نے مسلمانوں کا جو برتاؤ اپنے ساتھ دیکھا وہ بہت شریفانہ تھا، کسی نے میری بے حُرمتی نہیں کی۔ سب نے میرے اعزاز کا پورا پورا خیال رکھا، اور پھر یہاں آکر آپ کی مہربانی نے تو میرا دل موہ لیا!"

رانی کنول دیوی کی آنکھوں میں پھر آنسو جھلملانے لگے۔ خلجی نے ہمدردی کے لہجے میں کہا:۔

"رانی! اس قدر ہراساں ہونے کی ضرورت نہیں۔ تمہاری عزت اور سربلندی کوئی نہیں چھین سکتا!"

مایوسی اور غم سے نڈھال ہوتے ہوئے رانی کنول دیوی بولی:۔

"وُہ تو چھِن چکی مہاراج! ——— وہ اب نہیں مل سکتی، جس طرح گزرا ہُوا زمانہ واپس نہیں آتا، اسی طرح چھِنی ہوئی عزت و حشمت بھی واپس نہیں مل سکتی، ———!"

علاءالدین خلجی:۔ "ہم تمہارے سامنے ایک دوسری تجویز رکھتے ہیں۔ اگر تمہیں اعتراض نہ ہو، تو اس پر عمل ہو سکتا ہے!"

رانی نے کوئی جواب نہیں دیا، البتہ منتظر نگاہوں سے بادشاہ کی طرف دیکھنے لگی۔
علاء الدین خلجی نے اس سے کہا:-

"تم نے اپنے سماج کا جو حال بتایا، وہ اگر سچ ہے تو تم اس میں پھر رہتی کیوں ہو ۔۔۔ ؟"

رانی کنول دیوی :"کہاں رہتی ہوں مہاراج، آپ وہاں بھیج رہے ہیں، اور میں جانے سے انکار کر رہی ہوں۔ اگر جانا ہوتا تو چلی نہ جاتی ؟ ۔۔۔۔ میں نے اس سماج سے ناطہ توڑ لیا اب میرا اس سے کوئی رشتہ نہیں !"

علاء الدین خلجی :- "نہیں تم ہمارا مطلب نہیں سمجھیں، ۔۔۔۔ ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جب تمہاری سماج اتنی ظالم ہے، تمہارا دھرم اتنا نازک ہے، تمہارا شوہر اتنا کٹھور ہے تو پھر ایسے دھرم، ایسے سماج اور ایسے شوہر کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ کیوں نہیں دیتیں، ۔۔۔۔ ؟"

رانی کنول دیوی :- "چھوڑ چکی مہاراج ! اب میرا اس دھرم، اس سماج اور اس پتی سے کوئی ناطہ نہیں، ۔۔۔۔ بالکل نہیں ۔۔۔۔ آپ کہیں تو میں مسلمان ہونے کو تیار ہوں، میں نے مسلمانوں کو بہت اچھا پایا۔ جب وہ اتنے اچھے ہیں، تو ان کا دھرم بھی ضرور اچھا ہوگا۔ جس طرح درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے، اسی طرح انسان اپنے دھرم سے پہچانا جاتا ہے۔ کئی دن سے یہی سوچ رہی تھی کہ مسلمان کر لیجئے مجھے، یہ آپ سے کہوں ۔۔۔۔ !"

علاء الدین خلجی :"پھر کہا کیوں نہیں ؛ رُک کیوں گئیں ؛ ایسا اچھا خیال آیا اور تم چپ رہیں ؛"

رانی کنول دیوی :- "اس لئے رُک گئی تھی کہ کہیں آپ یہ نہ سمجھیں، میں رہائی حاصل کرنے کے لئے اور غلامی سے نجات پانے کے لئے یہ کہہ رہی ہوں۔ آج آپ سے کھُل کر باتیں ہو گئیں، اب آپ کے دل میں یہ خیال نہیں آسکتا، اب میں سچے دل سے کہہ رہی ہوں، سب سے زیادہ جو چیز مسلمانوں کی مجھے پسند آئی، وہ اُن کی نگاہ اور عمل کی شرافت ہے، ۔۔۔۔ !"

علاء الدین خلجی ۔ "شوق سے مسلمان ہو جاؤ ۔ اسلام نے عورت کو پوری آزادی دے دی ہے ۔ وہ اپنی زندگی کا خود راستہ متعین کر سکتی ہے ۔ اور ماں باپ تک اسے مجبور نہیں کر سکتے ۔ اب تمہیں حق ہے کہ جس سے چاہو نکاح کر لو ۔ اور اگر تم ناپسند نہ کرو تو میں اپنا نام پیش کرتا ہوں !"

یہ سن کر رانی کنول دیوی پر سرخوشی کی ایسی کیفیت طاری ہوئی ، جسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا ۔ اس نے شرما کر سر جھکا لیا ، اور کچھ نہ کہہ سکی ——— لیکن چہرے بُشرے سے معلوم ہو رہا تھا ، خوش ہے ، اور اپنی خوش بختی پر نازاں ، "!

—— • ✣ • ——

پناہ گاہ!

کرن سنگھ اتنا حواس باختہ ہو کر بھاگا کہ جب تک خلجی کی زد سے نہیں نکل گیا، اس نے پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ وہ سب کچھ پیچھے چھوڑ آیا تھا، حتیٰ کہ اپنا ناموس! ——— رانی کنول دیوی ——— بھی! اسے کنول دیوی سے محبت تھی، لیکن اپنے آپ سے زیادہ نہیں۔ اسے مال و دولت سے محبت تھی۔ لیکن اپنے آپ کو بچانے، زندہ رکھنے اور عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے کے لئے اگر ان چیزوں کو خطرہ ہو، تو پھر مال و دولت میں بھی کوئی کشش نہ تھی۔ اسے اپنے سورماؤں اور سپاہیوں سے بھی محبت تھی۔ لیکن جس طرح پورا جسم بچانے کے لئے کسی عضو کا کاٹنا گوارا کر لیا جاتا ہے، اسی طرح اپنے آپ کو بچانے کے لئے اس نے ان سب کا بھینٹ چڑھ جانا گوارا کر لیا۔ شاید وہ دیول دیوی کا ایثار بھی گوارا کر لیتا۔ لیکن خوش قسمتی سے وہ باپ سے زیادہ بہادر تھی، اور حفاظتِ خود اختیاری کے فن سے واقف تھی، اس نے جب کرن سنگھ کو بھاگنے کے لئے گھوڑے کی باگ موڑتے دیکھا، تو خود بھی اپنا گھوڑا باپ کے پیچھے ڈال دیا۔ وہ بہت اچھی سوار تھی، اور میدانِ جنگ میں باپ کے پہلو بہ پہلو کھڑی حالات کا مطالعہ کر رہی تھی۔ لہٰذا بھاگنے کے لئے اسے نہ کسی تیاری کی ضرورت پیش آئی نہ اہتمام کی۔ چپکے چپکے راجہ کرن سنگھ نے اپنے سپہ سالار مہادیو سے کہہ دیا تھا کہ رانی کنول دیوی اور دوسرے شاہی ساز و سامان

کو جس طرح بھی ہو سکے، وہ دشمن کے ہاتھ سے بچائے اور جلد از جلد باقی ماندہ سواروں اور سپاہیوں کو لے کر رام نگر پہنچ جائے!

دن بھر کرن سنگھ اور راجکماری دیول دیوی اور چند بچے کھچے سوار چابک مار مار کر گھوڑوں کو دوڑاتے رہے۔ اب گھوڑے بھی بیدم ہو چلے تھے، اور سواروں میں بھی سکت نہیں رہ گئی تھی۔ منزل اب تک ناپید تھی۔ پیاس کے مارے سب کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ بھوک بھی لگی تھی اور شدت کی لگی تھی۔ تکان کا اثر بھی غالب آرہا تھا، سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کریں اور کدھر جائیں؟ دیول دیوی نے پریشانی کے عالم میں باپ سے پوچھا :-

"پتا جی! ہم لوگ کدھر جا رہے ہیں؟ کہیں رام نگر کی بجائے راستہ بھٹک کر کسی اور جگہ نہ پہنچ جائیں، اور وہ جگہ نہ جانے دوست کی ہو یا دشمن کی پھر کیا ہوگا؟"

کرن سنگھ بھی سخت پریشان ہو چکا تھا۔ اس نے ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا :

"راستہ تو ہم ضرور بھٹک گئے تھے۔ لیکن اب ہم ٹھیک راستہ پر جا رہے ہیں۔ یہ سامنے جو تالاب دکھائی دے رہا ہے، رام نگر کی سرحد یہیں سے شروع ہو جاتی ہے! ——— تھوڑی دیر میں ہم شہر کے اندر ہوں گے!"

یہ سُن کر دیول دیوی کی جان میں جان آئی۔ اس نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا :

"بھگوان کا شکر ہے، ہم صحیح سلامت پہنچ گئے، اب بس مہادیو کا انتظار ہے، ماتا جی وغیرہ کو لے کر وہ بھی اب پہنچا ہی چاہتا ہوگا!"

کرن سنگھ نے گھوڑے کو ایڑ لگاتے ہوئے کہا :-

"ہاں آشا (امید) تو یہی ہے (پریشان ہو کر) یہ سامنے گرد اُڑتی تُو نے دیکھی بیٹی؟ میرا خیال ہے یہ ضرور سوار ہیں، لیکن کون؟ ——— کہیں دشمن ہمارا تعاقب کرتا ہوا یہاں

تک تو نہیں آگیا؟"

دیول دیوی بھی پریشان ہوگئی، لیکن اس نے اپنا دل مضبوط کرکے کہا:۔

"نہیں پتا جی! دشمن اس راستہ سے کیسے آسکتا ہے؟ یہ اگر سوار ہیں تو ضرور راجپوت ہونگے!"

اتنے میں گرد کا بادل پھٹا، اور سواروں کا ایک دستہ اسی طرف آتا ہوا نظر آیا۔ دفعتہً راجہ کرن سنگھ کے ہونٹوں پر تبسم کھیلنے لگا۔ اُنھوں نے کہا:۔

"ارے بیٹی! یہ تو راجکمار گوبند پرشاد ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہیں سیر و شکار کو جا رہا ہے یا پھر شاید ہماری بپتا سُن کر مدد کے لئے آنکلا ہو!"

راجکماری بھی مسکرائی۔ اُس نے کہا:۔

"پتا جی! بھلا مُٹھی بھر سپاہیوں کے ساتھ کوئی کسی کی مدد کو نکلتا ہے، اور یہ گوبند پرشاد تو اتنا بڑا کائر ہے کہ لاکھ سپاہی بھی ساتھ ہوں تو دشمن کا نام سُن کر بھاگ کھڑا ہو!"

کرن سنگھ کو بیٹی کی یہ صاف گوئی بُری لگی۔ لیکن یہ موقع تادیب و سرزنش یا اصلاح و تلقین کا نہیں تھا، خاموش ہو رہا۔ اتنے میں گوبند پرشاد سامنے آگیا، کرن سنگھ اور دیول دیوی کو اس حالِ زار میں دیکھ کر اسے بڑی حیرت ہوئی۔ اس نے کہا:۔

"ارے مہاراج آپ؟ اور راجکماری بھی؟ اور صرف مٹھی بھر سپاہیوں کے ساتھ؟۔ بات کیا ہے؟ آپ دُکھی بھی بہت دکھائی پڑتے ہیں ———!"

یہ کہہ کر وہ گھوڑے سے اُتر پڑا۔ کرن سنگھ بھی نیچے اُتر آیا، دوسرے سواروں نے بھی یہی کیا البتہ دیول دیوی بدستور بیٹھی رہی۔ کرن سنگھ نے پہلے تو گوبند پرشاد کو گلے سے لگایا۔ پھر بھرائی ہوئی آواز میں کتھا ازاوّل تا آخر سُنا ڈالی۔ اور پھر بڑے حسرت انگیز لہجہ میں کہا:۔

"اب ہم پناہ لینے یہاں آئے ہیں!"۔

کو جس طرح بھی ہو سکے، وہ دشمن کے ہاتھ سے بچائے اور جلد از جلد باقی ماندہ سواروں اور سپاہیوں کو لے کر رام نگر پہنچ جائے!

دن بھر کرن سنگھ اور راجکماری دیول دیوی اور چند بچے کھچے سوار چابک مار مار کر گھوڑوں کو دوڑاتے رہے۔ اب گھوڑے بھی بیدم ہو چلے تھے، اور سواروں میں بھی سکت نہیں رہ گئی تھی۔ منزل اب تک ناپید تھی۔ پیاس کے مارے سب کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ بھوک بھی لگی تھی اور شدت کی لگی تھی۔ تکان کا اثر بھی غالب آ رہا تھا، سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کریں اور کدھر جائیں، دیول دیوی نے پریشانی کے عالم میں باپ سے پوچھا:

"پتا جی! ہم لوگ کدھر جا رہے ہیں؛ کہیں رام نگر کی بجائے راستہ بھٹک کر کسی اور جگہ نہ پہنچ جائیں، اور وہ جگہ نہ جانے دوست کی ہو یا دشمن کی پھر کیا ہوگا؛"

کرن سنگھ بھی سخت پریشان ہو چکا تھا۔ اس نے ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا:

"راستہ تو ہم ضرور بھٹک گئے تھے۔ لیکن اب ہم ٹھیک راستہ پر جا رہے ہیں۔ یہ سامنے جو تالاب دکھائی دے رہا ہے، رام نگر کی سرحد یہیں سے شروع ہو جاتی ہے! —— تھوڑی دیر میں ہم شہر کے اندر ہوں گے!"

یہ سن کر دیول دیوی کی جان میں جان آئی۔ اس نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا:

"بھگوان کا شکر ہے، ہم صحیح سلامت پہنچ گئے، اب بس مہادیو کا انتظار ہے، ماتا جی وغیرہ کو لے کر وہ بھی اب پہنچا ہی چاہتا ہوگا!"

کرن سنگھ نے گھوڑے کو ایڑ لگاتے ہوئے کہا:

"ہاں آشا (امید) تو یہی ہے (پریشان ہو کر) یہ سامنے گرد اڑتی تو نے دیکھی بیٹی؟ میرا خیال ہے یہ ضرور سوار ہیں، لیکن کون؟ —— کہیں دشمن ہمارا تعاقب کرتا ہوا یہاں

تک تو نہیں آگیا؟"

دیول دیوی بھی پریشان ہوگئی، لیکن اس نے اپنا دل مضبوط کر کے کہا:۔

"نہیں پتا جی! دشمن اس راستے سے کیسے آسکتا ہے؟ یہ اگر سوار ہیں تو ضرور رام نگر کے ہوں گے!"

اتنے میں گرد کا بادل پھٹا، اور سواروں کا ایک دستہ اسی طرف آتا ہوا نظر آیا۔ دفعتہً راجہ کرن سنگھ کے ہونٹوں پر تبسم کھیلنے لگا۔ اُنھوں نے کہا:۔

"ارے بیٹی! یہ تو راجکمار گوبند پرشاد ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہیں سیر و شکار کو جا رہا ہے یا پھر شاید ہماری بپتا سن کر مدد کے لئے آنکلا ہو!"

راجکماری بھی مسکرائی۔ اُس نے کہا:۔

"پتا جی! بھلا مٹھی بھر سپاہیوں کے ساتھ کوئی کسی کی مدد کو نکلتا ہے؛ اور یہ گوبند پرشاد تو اتنا بڑا کائر ہے کہ لاکھ سپاہی بھی ساتھ ہوں تو دشمن کا نام سن کر بھاگ کھڑا ہو!"

کرن سنگھ کو بیٹی کی یہ صاف گوئی بُری لگی۔ لیکن یہ موقع تادیب و سرزنش یا اصلاح و تلقین کا نہیں تھا، خاموش ہو رہا۔ اتنے میں گوبند پرشاد سامنے آگیا، کرن سنگھ اور دیول دیوی کو اس حالِ زار میں دیکھ کر اسے بڑی حیرت ہوئی۔ اس نے کہا:۔

"ارے مہاراج آپ؛ اور راجکماری بھی؟ اور صرف مٹھی بھر سپاہیوں کے ساتھ؟ — بات کیا ہے؛ آپ دُکھی بھی بہت دکھائی پڑتے ہیں ——— !"

یہ کہہ کر وہ گھوڑے سے اُتر پڑا۔ کرن سنگھ بھی نیچے اُتر آیا، دوسرے سواروں نے بھی یہی کیا؛ البتہ دیول دیوی بدستور بیٹھی رہی۔ کرن سنگھ نے پہلے تو گوبند پرشاد کو گلے سے لگایا۔ پھر بھرائی ہوئی آواز میں کتھا از اوّل تا آخر سُنا ڈالی۔ اور پھر بڑے حسرت انگیز لہجہ میں کہا:۔

"اب ہم پناہ لینے یہاں آئے ہیں،۔

کرن سنگھ: "تم ہی ہو آؤ بیٹے، زندہ رہا تو پھر چلیں گے! کسی اور موقع پر!"

گوبند پرشاد: "جیسی آپ کی اِچھیا (مرضی)! میں تو صبح روانہ ہو جاؤں گا!"

دیول دیوی بیٹھی یہ باتیں سُن رہی تھی اور پیچ و تاب کھا رہی تھی، اسے اپنے باپ کی پست گفتگو پر بھی غصہ آ رہا تھا، اور گوبند پرشاد کی سیاست سے بھری باتیں سن کر تو اس کا خون کھولنے لگا تھا لیکن کر کیا سکتی تھی، بے بس تھی، مہمان تھی اور وہ بھی ناخواندہ۔ خون کے گھونٹ پی رہی تھی: اور یہ واہی تباہی باتیں سُن رہی تھی!

بڑی دیر تک اسی طرح کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر گوبند پرشاد نے کرن سنگھ سے کہا:۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے راجکماری پر اس حادثہ کا بہت اثر ہے۔ جب سے آئی ہیں چپ ہیں بات ہی نہیں کرتیں۔ اگر یہی حالت رہی تو مجھے اندیشہ ہے کہیں بیمار نہ پڑ جائیں۔ مہاراج آپ بھی نہیں سمجھاتے انہیں، —— ؟"

کرن سنگھ: "کیا سمجھاؤں بیٹا! —— اس کا صدمہ بجا ہے، ماں سے بچھڑ گئی حکومت سے محروم ہو گئی، اب ایک دوسری جگہ مہمان کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ ہمیشہ کی نازک دماغ ہے، اس کا یہ حال دیکھ کر تو میرا جی اور کڑھتا ہے۔ لیکن کر کیا سکتا ہوں؟"

یہ کہتے کہتے کرن سنگھ کی آواز بھرّا گئی۔ اب تو دیول دیوی چپ تھی۔ اب اُس نے باپ سے کہا:۔

"نہیں پتا جی! آپ ذرا بھی چنتا (فکر) نہ کریں! مجھے یہاں کوئی دُکھ نہیں۔ بڑے آرام سے ہوں۔ ماتا جی کی فکر ضرور ہے۔ لیکن یہ ایسا حادثہ ہے جس میں سب بے بس تھے۔ اگر ہمارے بس میں ہوتا، تو کیا ہم کوئی کسر اُٹھا رکھتے۔ (گوبند پرشاد سے مخاطب ہو کر) آپ کیوں پتا جی سے ایسی باتیں کرتے ہیں، جن سے وُہ اَور دُکھی ہوں، واہ! یہ بھی اچھی ہمدردی ہے، —— خالی خولی الفاظ!"

گوبند پرشاد کا یہ کھری کھری باتیں سُن کر چہرہ اُتر گیا، اور وہ جھینپ سا گیا۔ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن

کہہ نہ سکا۔ اس لئے کہ دیول دیوی ناگواری کے عالم میں اُٹھی اور اس کمرہ میں چلی گئی جو اُس کے لئے سجایا گیا تھا، اور جہاں وہ جب سے آئی تھی رہ رہی تھی!

کرن سنگھ نے گوبند پرشاد کی دل جوئی کرتے ہوئے کہا:۔

"دیکھا، میں نہ کہتا تھا، بہت نازک دماغ ہے، اور اب تو کچھ چڑچڑی بھی ہو گئی ہے! —— بُرا نہ ماننا، اس کی بات کا، یہ مجھ سے بھی اسی طرح کی حرکتیں کرجاتی ہے اور میں کچھ نہیں کہتا!"

گوبند پرشاد نے ایک سعادت مند اور سراپا اطاعت عزیز قریب کی حیثیت سے کہا:۔

"نہیں مہاراج! بھلا راجکماری کی باتوں کا ایسے موقع پر بُرا مانا جا سکتا ہے۔ ہم جانتے ہیں ان کے دل کی کیا حالت ہے! اور پھر وہ تو ہمیشہ اس طرح کی باتیں ہر ایک سے کرتی چلی آئی ہیں، مجھے تو اتنی اچھی لگتی ہیں کہ ان کی کوئی بات بُری نہیں لگتی۔ ہر بات اچھی ہی لگتی ہے!"

کرن سنگھ۔ "تو بیٹا، بس اب تم صبح خیریت سے سدھار جاؤ، اور ہاں یہ تو بتاؤ کب تک واپس آجاؤ گے؟"

گوبند پرشاد۔ "زیادہ سے زیادہ پندرہ بیس دن میں۔ بس یوں سمجھئے کہ کھانا یہاں کھاؤں گا۔ پانی وہاں پیوں گا۔ ایک دن بھی بیکار ضائع نہیں ہوگا، اطمینان رکھئے، —— !"

کرن سنگھ۔ "اطمینان تو ہے بیٹا، لیکن خیال جو کچھ ہے وہ یہ کہ اگر کہیں دیر ہوگئی، تو پھر ہماری سفارت بے کار ہو جائے گی!"

گوبند پرشاد۔ "ذرا بھی دیر نہیں ہوگی مہاراج! میرا وشواش کیجئے۔ لیکن ایک بات تو میں بھی عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتا!"

کرن سنگھ۔ "کہو کہو، شوق سے کہو بیٹے۔ کیا کہنا چاہتے ہو؟ میں سُن رہا ہوں!"

گوبند پرشاد۔ "راجکماری دیول دیوی کو خوش رکھئے کسی طرح! یونہی چپ لگی رہی اور وہ غم پیتی رہیں

کرن سنگھ: "تم ہی ہو آؤ بیٹے، زندہ رہا تو پھر چلیں گے! کسی اور موقع پر!"

گوبند پرشاد: "جیسی آپ کی اِچھیا (مرضی)! میں تو صبح روانہ ہو جاؤں گا!"

دیول دیوی بیٹھی یہ باتیں سُن رہی تھی اور پیچ و تاب کھا رہی تھی، اسے اپنے باپ کی پست گفتگو پر بھی غصہ آ رہا تھا، اور گوبند پرشاد کی سیاست سے بھری باتیں سن کر تو اس کا خون کھولنے لگا تھا لیکن کر کیا سکتی تھی، بے بس تھی، مہمان تھی اور وہ بھی ناخواندہ۔ خون کے گھونٹ پی رہی تھی، اور یہ واہی تباہی باتیں سُن رہی تھی!

بڑی دیر تک اسی طرح کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر گوبند پرشاد نے کرن سنگھ سے کہا:۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے راجکماری پر اس حادثہ کا بہت اثر ہے۔ جب سے آئی ہیں چپ ہیں، بات ہی نہیں کرتیں۔ اگر یہی حالت رہی تو مجھے اندیشہ ہے کہیں بیمار نہ پڑ جائیں۔ مہاراج آپ بھی نہیں سمجھاتے انہیں، ——— ؟"

کرن سنگھ: "کیا سمجھاؤں بیٹا، ——— اس کا صدمہ بجا ہے، ماں سے بچھڑ گئی، حکومت سے محروم ہو گئی، اب ایک دوسری جگہ مہمان کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ ہمیشہ کی نازک دماغ ہے، اس کا یہ حال دیکھ کر تو میرا جی اَور کڑھتا ہے۔ لیکن کر کیا سکتا ہوں؟"

یہ کہتے کہتے کرن سنگھ کی آواز بھرّا گئی۔ اب تو دیول دیوی چپ تھی۔ اب اُس نے باپ سے کہا:۔

"نہیں پتا جی! آپ ذرا بھی چنتا (فکر) نہ کریں، مجھے یہاں کوئی دُکھ نہیں۔ بڑے آرام سے ہوں۔ ماتا جی کی فکر ضرور ہے۔ لیکن یہ ایسا حادثہ ہے جس میں سب بے بس تھے۔ اگر ہمارے بس میں ہوتا، تو کیا ہم کوئی کسر اُٹھا رکھتے۔ (گوبند پرشاد سے مخاطب ہو کر) آپ کیوں پتا جی سے ایسی باتیں کرتے ہیں، جن سے وُہ اَور دُکھی ہوں، واہ! یہ بھی اچھی ہمدردی ہے، ——— خالی خولی الفاظ!"

گوبند پرشاد کا یہ کھری کھری باتیں سُن کر چہرہ اُتر گیا، اور وہ جھینپ سا گیا۔ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن

کہہ نہ سکا۔ اس لئے کہ دیول دیوی ناگواری کے عالم میں اُٹھی اور اس کمرہ میں چلی گئی جو اُس کے لئے سجایا گیا تھا، اور جہاں وہ جب سے آئی تھی رہ رہی تھی!

کرن سنگھ نے گوبند پرشاد کی دِل جوئی کرتے ہوئے کہا:۔

"دیکھا، مَیں نہ کہتا تھا، بہت نازک دماغ ہے، اور اب تو کچھ چڑچڑی بھی ہوگئی ہے، ——— بُرا نہ ماننا، اس کی بات کا، یہ مجھ سے اسی طرح کی حرکتیں کرجاتی ہے اور مَیں کچھ نہیں کہتا، !"

گوبند پرشاد نے ایک سعادت مند اور سراپا اطاعت، عزیز قریب کی حیثیت سے کہا:۔

"نہیں مہاراج! بھلا راجکماری کی باتوں کا ایسے موقع پر بُرا مانا جاسکتا ہے۔ ہم جانتے ہیں ان کے دل کی کیا حالت ہے؛ اور پھر وہ تو ہمیشہ اس طرح کی باتیں ہر ایک سے کرتی چلی آئی ہیں، مجھے تو اتنی اچھی لگتی ہیں کہ ان کی کوئی بات بُری نہیں لگتی۔ ہر بات اچھی ہی لگتی ہے!"

کرن سنگھ۔ "تو بیٹا، بس اب تم صبح خیریت سے سدھار جاؤ، اور ہاں یہ تو بتاؤ کب تک واپس آجاؤ گے؟"

گوبند پرشاد۔ "زیادہ سے زیادہ پندرہ بیس دن میں۔ بس یوں سمجھئے کہ کھانا یہاں کھاؤں گا۔ پانی وہاں پیوں گا۔ ایک دن بھی بیکار ضائع نہیں ہوگا، اطمینان رکھئے، ———!"

کرن سنگھ۔ "اطمینان تو ہے بیٹا، لیکن خیال جو کچھ ہے وہ یہ کہ اگر کہیں دیر ہوگئی، تو پھر ہماری سفارت بے کار ہو جائے گی!"

گوبند پرشاد۔ "ذرا بھی دیر نہیں ہوگی مہاراج! میرا وشواش کیجئے۔ لیکن ایک بات تو مَیں بھی عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتا!"

کرن سنگھ۔ "کہو کہو، شوق سے کہو بیٹے۔ کیا کہنا چاہتے ہو؟ مَیں سُن رہا ہوں!"

گوبند پرشاد۔ "راجکماری دیول دیوی کو خوش رکھئے کسی طرح! یونہی چپ لگی رہی اور وہ غم پیتی رہیں

تو بیمار پڑ جائیں گی۔ پھر ان کا سنبھالنا مشکل ہو جائے گا ——— !"

کرن سنگھ:- "یہ میں بھی محسوس کرتا ہوں، لیکن کیا کروں۔ یہاں اس کی کوئی سکھی اور سہیلی بھی تو نہیں ہے۔ ایک بُرادھا غریب ہے۔ لیکن وہ جب سے گئی ہے، بھسما بھوت (بخار) میں مبتلا ہے، ورنہ اس سے ذرا جی بہل جاتا تھا لڑکی کا، وید جی کا علاج ہو رہا ہے۔ لیکن اب تک کوئی خاص فائدہ نہیں ہُوا۔ نہ جانے ہماری قسمت میں کیا لکھا ہے؟"

گوبند پرشاد:- "مہاراج! آپ ذرا بھی پریشان نہ ہوں۔ میں نے کل وید جی سے پوچھا تھا۔ اُنہوں نے اطمینان دلایا ہے۔ چند دن میں بالکل چنگی ہو جائے گی!"

کرن سنگھ:- "بھگوان ایسا ہی کریں۔ میں تو اس کی وجہ سے بہت دُکھی ہوں! ——— پالم پور یہاں سے کتنی دُور ہے بیٹے؟"

گوبند پرشاد:- "چار پانچ منزل ہے لیکن راستہ بہت دشوار گزار ہے، یوں تو اگر صرف میدانی علاقہ ہو تو دو دن میں آدمی پہنچ جائے۔ لیکن دشوار گزار راستہ کی وجہ سے آٹھ دس دن لگ جاتے ہیں، ——— پتا جی اس پر فخر کیا کرتے ہیں کہ پالم پور کا محل وقوع ایسا ہے کہ دشمن کسی طرح وہاں پہنچ ہی نہیں سکتا اسی لئے انہوں نے رام نگر کو راجدھانی نہیں بنایا، ورنہ آب و ہوا اور مناظر کے اعتبار سے جو بات رام نگر میں ہے وہ پالم پور میں نہیں ہے، ——— مجھے تو یہ جگہ اتنی پسند ہے کہ اکثر یہیں رہتا ہوں، جب بار بار پتا جی بُلاتے ہیں تو چلا جاتا ہوں"!"

کرن سنگھ:- "تو یہاں تم بہت دنوں سے مقیم ہو شاید؟"

گوبند پرشاد:- "بہت دنوں سے تو نہیں، کوئی ایک ہفتہ ہُوا ہو گا، البتہ رہنے کا ارادہ تھا ابھی، اب یوں یک بہ یک بے سان و گمان جو پالم پور پہنچوں گا، تو پتا جی حیران رہ جائیں گے مجھے دیکھ کر، اچھا مہاراج اب آپ آرام کریں۔ صبح آپ سے ملے بغیر میں چلا جاؤں گا ——— !"

یہ کہہ کر جواب کا انتظار کئے بغیر گوبند پرشاد کمرے سے نکل گیا، اور مہاراجہ کرن سنگھ بستر پر لیٹ کر اپنے ماضی، حال اور مستقبل پر غور کرنے لگا۔ بگلانہ اب دشمن یعنی مسلمانوں کے قبضے میں تھا، اور اسے دوبارہ فتح کر لینے کا کوئی سامان نہیں نظر آتا تھا، رام نگر یا پالم پور میں پناہ مل گئی، آرام بھی مل رہا ہے، لیکن یہاں ہمیشہ تو نہیں رہا جا سکتا؛ یہ بہرحال ایک غیر ملک ہے، ایک عزیز اور دوست کی ریاست سہی، لیکن بہرحال اپنی تو نہیں ہے . . !

پھر کرن سنگھ رانی کنول دیوی کے بارے میں سوچنے لگا، کنول دیوی کا خیال آتے ہی وہ بیتاب ہو گیا، دل میں طرح طرح کے سوالات آ رہے تھے ——— !

وہ اس وقت کہاں ہوگی؛

اس کے ساتھ خلجی نے کیا سلوک کیا ہوگا ———؛

کہیں کنیز کی حیثیت سے وہ فروخت تو نہیں کر دی گئی؛ کسی امیر کے حوالے تو نہیں کر دی گئی؛ آہ میری رانی اور کنیز؛ ——— لیکن اگر میں فتحیاب ہوتا؛ میں نے خلجی کو بھاگنے پر مجبور کر دیا ہوتا، اور خلجی کی کوئی بیگم میرے ہاتھ آتی تو میں کیا کرتا؛ کیا اسے رہا کر دیتا؛ کیا اسے خلجی کے پاس واپس بھیج دیتا؛ کیا اسے داسی بننے پر مجبور نہ کرتا؛ ضرور کرتا! پھر میں خلجی کی شکایت کس منہ سے کروں؛ کس بنیاد پر اس سے یہ امید کروں کہ وہ کنول دیوی کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے گا؛

پھر خیال آیا، ——— !

اچھا فرض کرو خلجی، کنول دیوی کو واپس کر دے، تو میرا برتاؤ اس کے ساتھ کیا ہوگا؟

کیا میں اسے رکھ لوں گا ———؛

کیا میں اسے پھر وہی حیثیت دے دوں گا، جو پہلے حاصل تھی؛

کیا وہ میری رانی، راج محل کی مالک اور دیول دیوی کی ماتا بن کر رہ سکے گی؛ میں اسے گوارا

بھی کرلوں، تو کیا میرے معاصر، میرے عزیز، میرے دوست گوارا کرلیں گے ؟ کیا میری سماج گوارا کرے گی ؟ کیا یہ سب لوگ اسے ناپاک اور ملیچھ نہیں قرار دیں گے ؟

جو عورت ـــــــ سوچنے کی بات ہے، ـــــــ دشمن کے پنجہ میں اسیر ہو چکی ہو، ہفتوں اور مہینوں اس کے پاس رہ چکی ہو، کیا وہ پاک دامن رہ سکتی ہے ؟ کیا اسے عصمت مآب قرار دیا جا سکتا ہے ؟ کیا اسے پھر وہی سابقہ عظمت حاصل ہو سکتی ہے ؟ ـــــــ نہیں یہ نہیں ہو سکتا، جب رام چندر جی مہاراج یہ نہ کر سکے تو کرن سنگھ کیسے کر سکتا ہے ؟ وہ تو ایک بہت معمولی آدمی ہے، ـــــــ رانی کنول دیوی اب میرے قابل نہیں رہی، اسے اب واپس نہیں آنا چاہئے، اسے اب وہیں رہنا چاہئے، جہاں وہ ہے، ـــــــ !

اگر وہ آ بھی گئی تو لوگ اسے نفرت کی نظر سے دیکھیں گے، اور میرا مذاق اڑائیں گے۔ دیول دیوی کا طعنوں سے کلیجہ چھلنی کر دیں گے، پھر کسی برابر کے خاندان میں اس کی شادی بھی ناممکن ہو جائے گی، میرے وقار اور دیول دیوی کے مستقبل کا تقاضا یہ ہے کہ اب ہم کنول دیوی کو مردہ سمجھ لیں، اس سے کوئی ناطہ نہ رکھیں، یہ سمجھ لیں وہ بنگلانہ سے نہیں دُنیا سے رخصت ہو گئی، صرف اسی طرح میرا وقار قائم رہ سکتا ہے، صرف اسی طرح دیول دیوی کی زندگی سُدھر سکتی ہے، نہیں اب کنول دیوی نہیں آئے گی، وہ نہیں آ سکتی، اسے نہیں آنا چاہئے ـــــــ !

اور ہاں دیول دیوی ؟ یہ کم بخت جو ماں کے لئے مری جا رہی ہے، اسے کیونکر سمجھایا جائے ؟ اسے کیونکر آمادہ کیا جائے کہ ماں کو بھول جائے ؟ اسے فراموش کر دے، اس کا نام بھی زبان پر نہ لائے۔ یقین کر لے کہ وہ اب نہ مل سکتی ہے، نہ اُس سے ملنے کی تمنا اور آرزو مناسب ہے ؟

ـــــــ کیا دیول دیوی مان جائے گی، ـــــــ ؟

نہیں، وہ نہیں مان سکتی، مَیں نے اس کی ہر ضد پر سر جھکایا ہے، اس کی ہر بات مانی ہے، اس

کی ہر خواہش پوری کی ہے، لیکن اس معاملہ میں بے بس ہوں، اس معاملہ میں دیول دیوی کو میرے حکم پر چلنا پڑے گا، میری بات ماننا پڑے گی، میری مرضی کا تابع بننا پڑے گا ــــــ!

اور پھر بھی اگر وہ راہِ راست پر نہ آئی، تو اور ہزاروں طریقے ہیں اسے اپنے ڈھنگ پر لانے کے، اس سے اپنی بات منوانے کے۔ کسی طرح کام نہ چلا تو گوبند پرشاد اور رہادیو کے تعاون سے یہ مشہور کر دوں گا کہ کنول دیوی مرگئی ــــ یہ لڑکی ــــ دیول دیوی ــــ کہاں سے تصدیق کرتی پھرے گی کہ یہ سچ ہے یا جھوٹ؛ ماننا ہی پڑے گا، اور پھر رو دھو کر چپ ہو جائے گی۔ کون ماں باپ کو ہمیشہ روتا رہتا ہے؛ ــــــ بس یہ ٹھیک ہے۔ گوبند پرشاد پالم پور سے واپس آیا، اور میں نے اس اسکیم پر عمل کیا ــــــ لیکن نیند کیوں نہیں آرہی ہے؛ طبیعت کیوں گھبرا رہی ہے؛ خیالات کیوں پریشان کر رہے ہیں؛ اوہام و شکوک نے کیوں قبضہ کر رکھا ہے میری جانِ حزیں پر؛ ــــــ اور آخر کار وہ سو گیا!

پھر آزمائش؟

اور عین اس وقت جب کرن سنگھ اپنے غم کدہ میں پریشانی کا شکار ہو کر کروٹیں بدل رہا تھا، راجکمار گوبند پرشاد دیول دیوی کے شبستان میں بیٹھے اس سے اپنے معاملات طے کرنے کی کوشش کر رہے تھے!

گوبند پرشاد نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ راجکماری کا دل مجھ سے صاف نہیں ہے لیکن اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس سے نفرت کرنے لگی ہے۔

دیول دیوی خاموش اور مضمحل صندل کی چوکی پر گاؤ تکیہ سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ کمرہ میں اس وقت کوئی نہیں تھا۔ داسیاں ادھر اُدھر اپنے کام میں لگی ہوئی تھیں۔ رادھا اس کمرے سے ملے ہوئے ایک کمرہ میں بسترِ علالت پر دراز تھی۔ دیول دیوی یکہ و تنہا خاموش اور مضطرب اپنی جگہ پر بیٹھی ہوئی تھی۔

وہ جب سے یہاں آئی تھی، ایک نئے خطرہ میں اپنے آپ کو گھرا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ کرن سنگھ جس نیاز مندی کے ساتھ گوبند پرشاد سے ملا تھا، اس نے یہ اندیشہ پیدا کر دیا تھا کہ آگے چل کر ربط عداوت میں نہ بدل جائے۔ بگلانہ میں جب گوبند پرشاد سے شادی کا سوال اٹھا تھا تو اُس نے صاف الفاظ میں انکار کر دیا تھا کہ ایسے کا بر سے وہ شادی نہیں کر سکتی، اور کرن سنگھ نے بھی اس انکار کو

کو قبول کر لیا تھا۔ لیکن کیا اب ان بدلے ہوئے حالات میں بھی کرن سنگھ اپنی بات پر قائم رہے گا! کیا اب بھی اس میں یہ ہمت اور سکت ہے کہ وہ گوبند پرشاد کے پیام کو ٹھکرا دے؛ اور جہاں تک گوبند پرشاد کا تعلق ہے، وہ کسی طرح بھی دست بردار نہیں ہو سکتا۔ جب سے آئی ہوں اس کی نگاہیں دیکھ رہی ہوں۔ ان نگاہوں میں لگاوٹ کی جھلک صاف نظر آ رہی ہے۔ میں نے اب تک اسے منہ نہیں لگایا، بات نہیں کی۔ لیکن وہ پھر پھر کر مجھ سے مخاطب ہونے کی، باتیں کرنے کی، مجھے گفتگو پر مجبور کرنے کی کوشش کرتا ہے!

اور پھر سوچنے لگتی، بنگالہ ہوتا تو میں اسے ڈانٹ دیتی، دھتکار دیتی، جھڑک دیتی، میرے پاس آنے کی جرأت کرتا تو نکال باہر کر دیتی۔ لیکن میں جو اپنے باپ کو دوش دے رہی ہوں، کیا میں بھی اب اس کے ساتھ وہی برتاؤ کر سکتی ہوں جو بنگالہ میں کر سکتی تھی؛ —— کیا اب بھی میں اسے جھڑک سکتی ہوں، دھتکار سکتی ہوں، یہاں آ جائے تو نکال باہر کر سکتی ہوں؛

نہیں میں یہ کچھ نہیں کر سکتی، وہاں میں راجکماری تھی، اپنے ارادہ اور خیال کی مالک، اور یہاں میری حیثیت کیا ہے؛ گوبند پرشاد کے رحم و کرم پر زندگی بسر کر رہی ہوں! یہ محل اس کا ہے یہ داسیاں اس کی ہیں، یہ کھانا جو میں کھاتی ہوں اس کا ہے، یہ کپڑے جو میں پہن رہی ہوں اس کے ہیں۔ یہ صندل کی چوکی جس پر میں بیٹھی ہوں اس کی ہے، یہ گاؤ تکیہ جس سے ٹیک لگائے ہوئے ہوں اس کا ہے، یہ سب اس کا ہے، یہ شہر اس کا ہے، یہاں ہر چیز اس کی ہے، دوسرے الفاظ میں یوں سمجھنا چاہئے کہ میرا وجود اس وقت تک قائم ہے جب تک وہ مہربان ہے۔ پھر کیا میں اسے خفا کر لوں؛ اور ایسی جرأت کر بھی بیٹھوں تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا: مجھے اپنی فکر نہیں، جہاں سینگ سمائیں گے چلی جاؤں گی، کوئی سہارا نہ ملا تو زہر کھا کر خودکشی کر لوں گی۔ لیکن پتاجی کیا کریں گے؛ کیا اپنے ساتھ انہیں بھی مجبور کروں کہ زہر کھا لیں؛ میں ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتی، کسی طرح کی خدمت نہیں کر

سکتی۔ لیکن کیا اتنا بھی نہیں کرسکتی کہ انہیں اس پناہ گاہ میں رہنے دوں؛ یہاں رہ کر وہ اپنا کھویا ہوا راج دوبارہ حاصل کرنے کی جدوجہد کر سکتے ہیں۔ وہ دلّی پر حملہ نہیں کرسکتے، خلجی کو شکست نہیں دے سکتے، مسلمانوں کو نیست ونابود نہیں کرسکتے، تو کم از کم اتنا تو کر سکتے ہیں کہ مہاراجہ پالم پور کی مدد سے، دوسرے راجاؤں کی رفاقت سے، راجکمار گوبند پرشاد کی اخلاقی اعانت سے، اپنا کھویا ہوا راج تو حاصل کرلیں۔ کیا میں اپنے باپ کے راستہ کا پتھر بن جاؤں گی؟ —— نہیں، مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے۔ یہ سچ ہے کہ میں کسی طرح بھی گوبند پرشاد کو اپنا جیون ساتھی نہیں بنا سکتی، لیکن کم از کم یہ تو کرسکتی ہوں کہ اس سے اخلاق سے ملوں، مدارات سے پیش آؤں؛ اس میں میرا کیا بگڑتا ہے، اور پتاجی کا کام بن جاتا ہے۔ دشمن سے بھی غرض کے وقت آدمیت کا سلوک کرتے ہیں، گوبند پرشاد تو میرا دشمن بھی نہیں، وہ صرف کاڑھے، بزدل ہے، زندگی کا رشتہ نہیں بندھ سکتا لیکن اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد بھی اس سے میل جول تو رکھا جاسکتا ہے؟ میری رکھائی اگر اس طرح قائم رہی تو اس کے اور پتاجی کے تعلقات ختم ہوجائیں گے، تلخ ہوجائیں گے، اور اس کا اثر مجھ سے زیادہ پتاجی کی زندگی پر، ان کے مستقبل پر، ان کے راج پاٹ پر پڑے گا —— نہیں مجھے اتنا خودغرض اور سخت مزاج بھی نہیں بننا چاہئے۔ گوبند پرشاد جب پالم پور سے آئے گا تو میں اس سے اچھی طرح ملوں گی، اخلاق اور شائستگی کا برتاؤ کروں گی، کوئی ایسی بات نہیں کروں گی، جو اسے ناگوار گزرے، جس سے اسے کوفت ہو، جس میں اس کی توہین کا پہلو نکلتا ہو!

وہ یہ سوچ رہی تھی کہ کسی کے پیروں کی چاپ سنائی دی۔ نگاہ اٹھا کر دیکھا تو راجکمار گوبند پرشاد دروازے پر کھڑے تھے۔ ہونٹوں پر تبسم کھیل رہا تھا!

گوبند پرشاد کو یوں اپنے کمرہ میں آتا دیکھ کر اگرچہ دیول دیوی کا دل دھڑکنے لگا لیکن اس نے اپنے تئیں سنبھالا۔ مسکراتی ہوئی پیشوائی کے لئے اٹھی اور بڑے شیریں اور دلکش لہجہ میں کہا۔

"آیئے وہاں دروازے پر کیوں کھڑے ہیں ؛ اندر کیوں نہیں آجاتے ؟"

گوبند پرشاد کو اس اخلاق و تپاک پر حیرت ہوئی ۔ اس نے وہیں دروازے پر کھڑے کھڑے کہا :

"آیا تو اس لئے تھا کہ تھوڑی دیر آپ کے پاس بیٹھوں، کچھ باتیں کروں لیکن ہمت نہیں پڑی، اس لئے ٹھٹک کر یہاں کھڑا ہو گیا ۔ آپ اجازت دیں تو آجاؤں ورنہ چلا جاؤں !"

دیول دیوی :۔ "اور کس طرح اجازت دوں ؛ کہہ تو رہی ہوں 'آیئے، تشریف لایئے' —— آخر آپ ٹھٹک کیوں گئے ؛ کیا آپ کو اندیشہ تھا کہ میں آنے سے منع کر دوں گی ؛ اتنا بد اخلاق اور بدتہذیب سمجھتے ہیں آپ مجھے —— ؟"

راجکمار قریب آکر بیٹھ گیا اور محبت بھرے لہجے میں گویا ہوا :۔

"مجھے اندیشہ ہے کہ آپ مجھ سے خفا ہیں کچھ ؛ —— کیا میں غلط کہہ رہا ہوں ؛"

راجکماری ہنس پڑی ۔ پھر بولی :۔

"میں آپ کو جھوٹا نہیں سمجھتی ۔ یہ بتایئے اس اندیشہ کی بنیاد کیا ہے ؛"

گوبند پرشاد :۔ "دل کہتا ہے —— واقعی اس دن بڑی خطا ہو گئی تھی مجھ سے !"

دیول دیوی :۔ "کون سی خطا ؛ —— کس دن کا واقعہ بیان کر رہے ہیں آپ ؛ مجھے تو کچھ یاد نہیں، صاف صاف کہیئے !"

گوبند پرشاد :۔ "وہی جس دن آپ کے ساتھ ہرن کے شکار کو نکلا تھا ؛ —— نہ ہرن پکڑ پایا، نہ اُن کم بخت بدمعاشوں سے مقابلہ کر سکا جنہوں نے آپ کو گرفتار کر لیا تھا ۔ اتنا تھک گیا تھا کہ کیا کہوں ؛ حواس غائب تھے، دل بیٹھا جا رہا تھا ۔ آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا رہا تھا ۔"

دیول دیوی :۔ "شام تو ہو چکی تھی، اندھیرا تو تھا ہی —— خیر جو کچھ ہوا اچھا ہوا !"

گوبند پرشاد :۔ "یہ تو بتایئے پھر ان کافروں کے چنگل سے آپ بچیں کس طرح ؛ کچھ کچھ ایسا یاد پڑ

رہا ہے جیسے یہ سب کچھ مذاق تھا!"

دیول دیوی:" چھوڑیئے بھی گئی گزری باتوں کو، مذاق تھا یا اصلیت تھی۔ ہر حالت میں وہ بات ختم ہو گئی، اور اب مجھے آپ اپنے سامنے دیکھ رہے ہیں!"

گوبند پرشاد:" اچھا راج کماری ایک بات تو بتایئے، ــــــ دیکھئے سچ سچ بتایئے گا، میں ایک بات پوچھ رہا ہوں، کبھی آپ کو میرا خیال بھی آیا؟ آپ نے مجھے یاد بھی کیا کبھی؟"

دیول دیوی:" اکثر آپ کا خیال آیا، اکثر آپ یاد آئے، ابھی ابھی جب آپ آئے میں بڑی دیر سے آپ ہی کے خیال سے باتیں کر رہی تھی میں، ــــــ آپ نے دیکھا ہوگا آپ کو دیکھ کر میں مسکرائی تھی ــــــ کیوں؟ اس لئے کہ ادھر میں نے آپ کے بارے میں سوچا، اُدھر آپ نمودار ہو گئے، ــــــ بڑا اچھا وقت تھا یہ، بھگوان سے جو کچھ مانگتی پالیتی!"

اِن باتوں سے گوبند پرشاد کا دل فخر اور مسرت سے اُچھلنے لگا۔ اُس نے بڑی بے تابی اور اشتیاق کے ساتھ کہا:۔

"کیونکر یقین کروں راجکماری؟ آپ مجھے بنا تو نہیں رہی ہیں۔ مَیں اپنے آپ کو اس قابل نہیں سمجھتا۔ لیکن یہی چاہتا ہوں، آپ غلط بات نہیں کہیں۔ شاید یہ میرا دل رکھنے کو، میرا حوصلہ اُونچا کرنے کو، میری آشا کا خیال کر کے آپ نے یہ باتیں کہہ دی ہوں۔ جو کچھ بھی ہو، مجھے آپ نے نئی زندگی دے دی، جی چاہتا ہے آپ کا شکریہ ادا کروں، لیکن وہ الفاظ کہاں سے لاؤں جو دل کی ترجمانی کر سکیں، وہی کہہ سکیں جو دل کہنا چاہتا ہے۔ نہیں راجکماری مجھے چُپ رہنے دیجئے۔ میرے لئے خاموش رہنا ہی اچھا ہے!"

دیول دیوی:" جب آپ اس طرح کی باتیں کرتے ہیں، تو میرا دل ہولنے لگتا ہے۔ نہ جانے کیوں؛ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آپ اچھے آدمی سے کچھ اور ہو گئے ہیں۔ وہی باتیں کیجئے جو دو آدمی کرتے

ہیں، ایسی باتیں نہ کیجئے جنہیں میں نے کبھی کسی سے نہیں سنا!"

گوبند پرشاد۔ "اچھا شما (معاف) کیجئے، اب ایسی غلطی نہیں ہوگی۔ آپ جانتی ہیں میری زندگی کا مقصد کیا ہے؟"

دیول دیوی۔ "نہیں جانتی، لیکن جان کر کروں گی بھی کیا؟ ہر انسان اپنی زندگی کا ایک مقصد رکھتا ہے اور وہ مقصد صرف اس کی زندگی سے تعلق رکھتا ہے، کسی اور کو اس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا!"

گوبند پرشاد۔ "راجکماری! یہ نہ کہئے، سچ بولتے ہوئے بھی آپ غلط کہہ رہی ہیں۔ کم از کم میرے بارے میں تو یہ صحیح نہیں۔ میری زندگی کا جو مقصد ہے اس کا تعلق آپ سے اور صرف آپ سے ہے۔ کسی اور سے نہیں ——— !"

یہ باتیں تیر کی طرح دیول دیوی کے دل پر لگ رہی تھیں۔ وہ اس شخص سے نفرت کرتی تھی۔ اس کی عاشقانہ باتوں سے خار کھاتی تھی۔ لیکن اس وقت مجبور تھی۔ اس نے اپنی دلی کیفیت چھپاتے ہوئے کہا:

"تو پھر کہہ دیجئے وہ مقصد کیا ہے؟ میں بھی دیکھوں میری ذات آپ کی زندگی اور زندگی کے مقصد سے کیونکر وابستہ ہو سکتی ہے ——— ؟"

گوبند پرشاد۔ "میری زندگی کا مقصد صرف ایک ہے ——— یہ کہ آپ خوش رہیں۔ آپ کو خوش دیکھوں، آپ کی ہر مصیبت کے لئے سپر بن جاؤں، آپ کے ہر دکھ کا مرکز میری ذات ہو۔ بس صرف یہ۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ جب سے آپ آئی ہیں، آپ کو افسردہ اور ملول دیکھ رہا ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی میرے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کئے دے رہا ہے۔ کاش میں اپنی جان دے کر آپ کو خوش رکھ سکوں ——— !"

دیول دیوی نے سوچا تھا کبھی ملاقات ہوئی تو دو چار اخلاق و تپاک کی باتیں کر کے مجلس ختم کر دے گی۔ لیکن یہ تو اس طرح جم کر بیٹھا تھا اور اس استقلال کے ساتھ اپنے عشق و محبت کو الفاظ کے

پردے میں چھپا کر ظاہر کر رہا تھا، جس سے خواہ مخواہ طبیعت میں تکدر اور انقباض پیدا ہو رہا تھا۔ لیکن دل ہی دل میں راج کماری نے یہ طے کر لیا تھا کہ اپنے انقباض اور تکدر کو ظاہر نہیں ہونے دے گی۔ وہ کہنے لگی :-

"راجکمار! ذرا سوچئے تو سہی، مجھ پر کیسی قیامت گزر گئی۔ میں سب کچھ تھی، اور دیکھتے دیکھتے کچھ نہ رہ گئی۔ میرا باپ ایک سلطنت کا مہاراجہ تھا، اب ایک پناہ گزین ہے۔ میری ماں ایک مہاراجہ کی چہیتی مہارانی تھی، اب دشمن کے ہاتھ میں قید ہے۔ میرے دیس کی فوج بہادری اور شجاعت میں اپنا جواب نہ رکھتی تھی۔ لیکن بھاگی تو اس طرح سر پر پاؤں رکھ کر کہ اپنی رانی تک کو نہ بچا سکی۔ ——— کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میرا دل پتھر کا ہے، وہ کچھ محسوس نہیں کرتا؟ میں خون کے آنسو روتی ہوں اور آنکھوں کے راستے میرے دل کے ٹکڑے بہہ رہے ہیں۔ یہ مصیبت کسی اور پر پڑی ہوتی، تو وہ دیوانہ ہو جاتا۔ لیکن پتا جی کی تعریف کرنے پر مجبور ہوں کہ بہادری اور حوصلہ کے ساتھ اس دُکھ کو سہہ رہے ہیں۔ میں بھی انہی کی لڑکی ہوں۔ جو کچھ گزرتی ہے، دل پر گزر رہی ہے۔ شکایت زبان پر نہیں آنے پاتی۔ ورنہ مجھے تو بھگوان سے بھی شکایت ہے۔ آخر ہم نے ان کی کیا خطا کی تھی کہ اس طرح ہمیں دے پٹکا اور تباہ کر دیا؟ ——— کیا بھگوان بے خطا قصور ہی لوگوں کو سزا دیا کرتے ہیں؟"

گوبند پرشاد:۔ "نہیں راجکماری! ایسا نہ کہئے، بھگوان کی شکایت کرنے سے کیا فائدہ؟ حال جو کچھ ہوا، بہت برا ہوا۔ لیکن اس دُنیا میں ہر روز انقلاب ہوتا رہتا ہے، جو کچھ ہو چکا ہے وہ بدل بھی سکتا ہے۔ بھگوان نے چاہا تو آپ پھر اپنے اس نئے محل میں جائیں گی۔ مہاراج کرن سنگھ پھر راج سنگھاسن پر بیٹھیں گے۔ مہارانی کنول دیوی پہلے سے زیادہ جاہ و حشم کے ساتھ پھر واپس آئیں گی۔ یہ خلجی کیا چیز ہے۔ وقت کی بات کہ جیت گیا۔ اسے بہادروں سے ابھی پالا نہیں پڑا ہے۔ جب پڑے گا تو چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا۔ میں پالم پور اسی لئے جا رہا ہوں کہ پتا جی سے کہہ کر

ایک بہت بڑی فوج لاؤں، آپ کا کھویا ہُوا راج پاٹ آپ کے حوالے کر دوں - ہماری فوج میں ایسے ایسے سورما اور بہادر ہیں کہ دُنیا میں کوئی اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتا - دیکھ لیجیئے گا مغل (تاتار) کم بھی خلجی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے - اس کی موت ہمارے سپاہیوں کے ہاتھ سے لکھی ہے - اس کی تباہی ہماری فوج کے ہاتھوں مکمل ہو گی - مجھے ذرا پالم پور سے واپس آنے دیجئے ــــــــ!"

دیول دیوی چپ چاپ گوبند پرشاد کی یہ لاف زنی سُن رہی تھی - وہ مغموم تھی - لیکن گوبند پرشاد کی ان لن ترانیوں کو سُن کر وہ اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکی - اس نے کہا:-

"آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں یہ اگر کر دکھایا تو سب سے زیادہ خوشی مجھے ہو گی، لیکن آپ پالم پور کب جائیں گے ــــــــ؟"

گوبند پرشاد:- "بس کل صبح ــــــــ اسی لئے تو ایسے وقت آ گیا - مَیں نے سوچا، کہ اب تو آپ سے ملاقات نہیں ہو سکے گی، چلوں اس وقت مل لوں - کہیں پندرہ بیس دن کے بعد واپسی ہو گی ــــ اگر آپ کو نیند آ رہی ہو تو واپس چلا جاؤں ــــــــ؟"

واقعہ یہ ہے کہ راجکماری دیول دیوی تھک چکی تھی - یہ باتیں سنتے سنتے اسے نیند بھی آ رہی تھی - لیکن زبان سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ آپ تشریف لے جایئے - اس نے متانت کے ساتھ کہا:-

"مجھ سے بڑھ کر بھی کوئی ناشکرا ہو سکتا ہے کہ آپ تو میرے لئے اتنے دُکھ سہیں مصیبت جھیلیں اور مجھے نیند آنے لگے؟ ــــــــ ذرا بھی نیند نہیں آ رہی ہے - شوق سے بیٹھئے، جتنی دیر تک جی چاہے تشریف رکھئے - مَیں آپ کی باتیں بڑی توجہ سے سُن رہی ہوں!"

گوبند پرشاد:- "شکریہ! اس نوازش کا شکریہ! اب ایک بات اور بتا دیجئے، بس اس کے بعد پھر سامانِ سفر کی تیاریوں میں مشغول ہو جاؤں گا! ــــــــ صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ مَیں جس سے محبت کرتا ہوں اُسے بھی میرا خیال ہے کہ نہیں؟"

دیول دیوی:- "بس تو آپ آزمائش میں پورے اُترے، امتحان میں کامیاب ہو گئے۔ اب آپ کو حق ہے کہ محبت کریں، اب آپ مستحق ہیں کہ آپ کی محبت کا جواب محبت سے دیا جائے!"

گوبند پرشاد خوش ہو گیا، وفورِ مسرت سے اس کا چہرہ چمکنے لگا۔ اس نے خوشی اور سرمستی کے عالم میں کہا "یعنی وہ امتحان اور آزمائش صرف یہ ہے کہ میں پالم پور جاؤں، اور وہاں سے کمک لے کر آ جاؤں ———— ؟ بس صرف یہ؟ صرف اسی قدر؟"

دیول دیوی نے جواب دیا:-

"ہاں، آپ اسے صرف کہہ رہے ہیں، میں اس کو سب کچھ سمجھتی ہوں، پتا جی کو راج پاٹ مل جائے۔ مجھے آپ راج محل میں پہنچا آئیے، اس سے زیادہ اور کیا چاہا جا سکتا ہے۔ یہی میری تمنا ہے، یہی میری آرزو۔ بس اب آپ پالم پور سدھاریئے اور جلد از جلد وہاں سے واپس آئیے ————! پھر آپ سے باتیں اطمینان اور تفصیل سے بگلانہ کے راج محل میں ہوں گی، وہیں اسی پائیں باغ میں جہاں ہم آپ بیٹھا کرتے تھے، اس درخت کے نیچے جو ہمارا نشیمن تھا۔ وہاں کی بہار، وہاں کا سماں کیا آپ بھول گئے؟ ———— اس قدر جلد؟"

گوبند پرشاد۔ (والہانہ وارفتگی کے ساتھ) "نہیں دیول دیوی نہیں بھولا، کبھی نہیں بھول سکتا مجھے بگلانہ عزیز ہے، اس کا راج محل عزیز ہے، راج محل کا پائیں باغ عزیز ہے۔ پائیں باغ کا وہ سایہ دار درخت عزیز ہے جہاں ہم تم بیٹھا کرتے تھے، بھلا ان چیزوں کو بھول سکتا ہوں ———— انہیں بھول جاؤں تو پھر یاد کیا رہے گا؟ ———— بس تو طے ہو گیا؟"

دیول دیوی۔ "ہاں راجکمار ہاں ———— کیوں بار بار ایک ہی بات آپ کہلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کیا آپ کو میری بات کا وشواش (بھروسہ) نہیں؟"

راجکمار گوبند پرشاد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھا، اور چپ چاپ باہر چلا

گیا۔ جاتے جاتے اس نے صرف اتنا کہا :۔

"راجکماری میرے لئے پرارتھنا (دعا) کرتی رہنا"

اور پھر وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

اتنی دیر تک دیول دیوی نے گوبند پرشاد کی باتیں سُنی تھیں، بظاہر خوشی اور خوش دلی کے ساتھ اس کی باتوں کا جواب بھی دیا تھا، لیکن دل ہی دل میں وُہ دعا کر رہی تھی کہ کسی طرح یہ بلا یہاں سے ٹلے

جب گوبند پرشاد چلا گیا، اور دیول دیوی بستر پر سونے کے لئے لیٹی تو نیند اُڑ چکی تھی۔ طرح طرح کے خیالات نے اسے پریشان کر رکھا تھا۔ وہ بار بار سوچتی تھی کیا گوبند پرشاد جو کچھ کہہ گیا ہے واقعی کر ڈالے گا، اگر ایسا ہُوا تو کیا، مجھے اپنی زندگی برباد کرنی پڑے گی ——— ؛ لیکن دل جواب دیتا تھا، جو شخص اتنا بزدل ہو کہ چند آدمیوں سے نہ لڑ سکے، اور وہ آدمی اس کے سامنے اس کی محبوبہ کو چھین لے جائیں، وہ اتنا بہادر نہیں ہو سکتا کہ ایک فوج کی کمان کرتا ہُوا اس کے لئے اپنی جان جوکھم میں ڈال لے!

دل کے اس جواب سے وہ مطمئن ہو جاتی تھی۔ یقین ہوتا تھا گوبند پرشاد کچھ نہیں کر سکے گا۔ تو پھر وہ کسی قسم کا استحقاق بھی نہیں ثابت کر سکے گا!

لیکن پھر یہ خیال آتا تھا، اگر وہ کچھ نہ کر سکا تو پتا جی کیا کریں گے؟

ان کی زندگی اور مستقبل کا دار و مدار تو اب صرف اسی گوبند پرشاد اور اس کے باپ پر ہے۔ کیا وہ یونہی یاس و حرماں کی زندگی بسر کریں گے؟ یونہی بلاوطن رہیں گے؟ دوسرے کے ملک میں بقیہ ساری زندگی بسر کریں گے، اور ایک دن اس دُنیا سے رخصت ہو جائیں گے؟

ہائے بھگوان یہ کیا ہو گیا؟

اور کرن سنگھ سے خیال ہٹتا تو رانی کنول دیوی یاد آجاتی، وہ اپنی ماں کے بارے میں ضرورت

سے زیادہ حساس تھی۔ وہ سوچنے لگتی، وہ کہاں ہوں گی؟ اس وقت کیا کر رہی ہوں گی، کیا کھاتی ہوں گی، کیا پہنتی ہوں گی؛ کس طرح اپنا جیون بسر کرتی ہوں گی؟ ہمارے دیس میں جنگی قیدیوں کو غلام بنالیا جاتا ہے جو عورتیں ہوتی ہیں انہیں داسی بنا کر کسی کے حوالے کردیا جاتا ہے۔ کیا رانی کنول دیوی میری ماں مہاراج کرن سنگھ کی بیوی، بگلانہ کی رانی کسی کی داسی بن کر رہے گی؟ ——— کیا اتنا بڑا انقلاب بھی ہوسکتا ہے؟ ——— بھگوان! کس جرم کی سزا مجھے میری ماں کو اور میرے باپ کو مل رہی ہے ——— ؟"

یہ سوچتے سوچتے وہ رونے لگی، ——— سسکیاں لے لے کر!

پہلے اگر کبھی اس کی آنکھ میں آنسو آجاتے تھے تو سارے راج محل میں ہلچل مچ جاتی تھی اسے روتا دیکھ کر سب حواس باختہ ہوجاتے تھے، رانی اور راجہ بیقرار ہو ہو کر اسے خوش کرنے کی کوشش کرتے تھے، اور آج وہ رو رہی تھی، سسکیاں لے رہی تھی، مگر کوئی نہ تھا، جو اس کے آنسو پونچھتا، اس کی دل دہی کرتا، اس کے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھتا، اسے دلاسا دیتا، اُس کی مایوسی کو اُمید سے، نراشا کو آشا سے بدل دیتا!

مصیبت میں انسان بے تاب ہو کر خدا کو یاد کرتا ہے۔ دیول دیوی اس وقت مصیبت میں تھی، بپتا میں تھی، کوئی اُس کے پاس نہ تھا، افسوس کرنے والا تک نہیں۔ اس بے بسی میں اسے بھگوان یاد آیا، اور وہ اپنے بستر سے اُٹھ کر سامنے رکھے ہوئے بُت کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑی ہوگئی اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے، آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور وہ لرزتی ہوئی آواز میں کہہ رہی تھی:

"بھگوان! ہم پر دیا کرو، ہم پاپی ہیں۔ ہمیں شما (معاف) کردو ———!"

بے بسی!

قسمت جب بگڑتی ہے تو بگڑتی ہی چلی جاتی ہے، حالات جب ناسازگار ہوتے ہیں تو بنی ہوئی صورت بھی نقصان دہ اور خطرناک ہوتی ہے۔ اُمید کا دیا جب بجھ جاتا ہے، تو پھر یاس کی تاریکی بڑھتی پھیلتی اور کالی ہی ہوتی چلی جاتی ہے، پھر کوئی تدبیر کام نہیں آتی، کوئی وسیلہ کامیاب نہیں ہوتا، کوئی اُمید پوری نہیں ہوتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے زمانہ مخالف ہے، قسمت مخالف ہے، قدرت مخالف ہے، کسی طرف سے کسی سمت سے کوئی ایسی صُورت نظر نہیں آتی، جو یاس کو آس سے بدل دے، جو بگڑے ہوئے حالات کو سنوار دے، بنا دے!

کرن سنگھ اور دیول دیوی کی اس وقت یہی حالت تھی۔ امید و بیم کے منجدھار میں اُن کی کشتی بادِ مخالف سے ٹکراتی، ابھرتی، ڈوبتی، بچتی، بچاتی چلی جا رہی تھی، اور کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا اس کا بیڑہ کہاں لگے گا؟ یہ منزلِ مقصود تک پہنچ کر ساحلِ مراد پر رُکے گی یا منزلِ مقصود تک پہنچنے سے پہلے کسی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے گی۔ جب انسان زیادہ پریشان ہوتا ہے، تو ذرا ذرا سی بات میں اُمید اور آرزو کی دُنیا بسا لیتا ہے، وہ جو کہتے ہیں ڈوبتے کو تنکے کا سہارا، وہ کچھ غلط نہیں ہے، واقعی ایک تنکے کا سہارا لے کر انسان پرشور موجوں اور بلاخیز لہروں سے بچ نکلنے کی اُمید

قائم کرلیتا ہے۔ کبھی کامیاب ہوتا ہے کبھی ناکام۔ لیکن جب تک زندہ رہتا ہے، امید کا دامن نہیں چھوڑتا۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہے، ———!

بالکل یہی کیفیت اس وقت کرن سنگھ کی تھی۔ وہ اپنا راج پاٹ کھو چکا تھا۔ وہ اپنی رفیقۂ حیات کنول دیوی سے محروم ہو چکا تھا، وہ کنول دیوی کا منہ اب دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن راج پاٹ کی ہوس موجود تھی، وہ کنول دیوی کو واپس لینا نہیں چاہتا تھا، لیکن راج پاٹ واپس لانے کے لئے چل رہا تھا، یہی ہوس تھی، جو اسے گجرات سے بگلانہ لائی تھی، اور بگلانہ جب چھٹا تو یہی ہوس اسے رام نگر میں لے آئی!

دیول دیوی کی حالت باپ سے جدا تھی، اسے راج پاٹ کی ذرا بھی فکر نہیں تھی۔ اس کے لئے رام نگر کا رنواس اور بگلانہ کا راج محل یکساں تھا۔ ماں کی یاد نے اسے بیقرار اور اشکبار کر رکھا تھا۔ مستقبل کی فکر نے اسے ہراساں اور مضطرب بنا رکھا تھا ——— ماتاجی کے درشن (زیارت) اب دنیا میں ہوں گے یا نہیں؛ یہ فکر اسے مارے ڈالتی تھی۔ راجکمار گوبند پرشاد سے اس کا پیچھا چھٹے گا یا نہیں؛ ——— اس فکر نے اسے خلجان میں مبتلا کر رکھا تھا!

جب سے گوبند پرشاد گیا تھا، وہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ راج دھانی لوٹ کر واپس آکر نجانے کیا گل کھلاتا ہے، رادھا اگرچہ اب ٹھیک ہو چکی تھی اور سارا وقت دیول دیوی کے پاس صرف کرتی تھی۔ لیکن اس فکر کا علاج اس کے پاس بھی نہیں تھا۔ اس روگ کو دور کرنے کی کوئی تدبیر اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ یہ دونوں گھنٹوں اور پہروں سر سے سر جوڑے باتیں کیا کرتی تھیں۔ اپنی سمجھ کے مطابق رادھا کافی تسلی دیتی۔ لیکن ان طفل تسلیوں سے کہیں کام چلتا ہے۔ ماں کے بارے میں رادھا صرف یہ کہتی، وہ ضرور ملیں گی۔ خلجی ان کے ساتھ بے ادبی نہیں کر سکتا۔ ویسے تو سارے بڑے مورکھ ہوتے ہیں۔ لیکن عورت کی جتنی عزت وہ کرتے ہیں کوئی نہیں کرتا۔ دُنیا

ہیں کسی ملک کے اندر بھی عورتوں کا وہ مان نہیں ہے، جو مسلمان ملکوں میں ہے۔ یہ باتیں سُن کر کسی حد تک دیول دیوی کے مغموم دل کو تسلی ہو جاتی۔ لیکن گوبند پرشاد کے بارہ میں خود رادھا بھی سخت پریشان تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس خطرہ کو کس طرح کم کر کے آقا کے سامنے پیش کرے، کس طرح اسے باور کرائے کہ یہ کچھ نہیں کر سکتا؛ جب کہ دل ہی دل میں وہ دیول دیوی سے زیادہ اس فتنہ کی شدت اور اہمیت کو محسوس کر رہی تھی!

ایک دن رادھا اور دیول دیوی بیٹھی آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔ دیول دیوی نے بڑے غمزدہ اور افسردہ لہجہ میں ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا:۔

"آخر ماتاجی کا کیا ہو گا رادھا! اب تک کچھ پتہ نہیں چلا ان کا! پتاجی تو اس طرح انہیں بھول بیٹھے جیسے کبھی صاحب سلامت ہی نہیں تھی!"

رادھا اس سوال کا کیا جواب دیتی، جب کہ صورتِ حال یہ تھی کہ اس نے جب بھی اکیلے دوکیلے میں کرن سنگھ سے اس بارے میں سوال کیا، اس نے تلخی اور ترشی کے ساتھ باتیں کر کے اسے خاموش کر دیا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کیا جواب دے کہ اتنے میں کرن سنگھ اسی طرف آتا ہُوا دکھائی دیا۔ رادھا کو موقع مل گیا۔ اس نے کہا:۔

"راجکماری! وہ دیکھو، مہاراجہ اسی طرف آ رہے ہیں۔ پوچھ لو نہ انہی سے! ——— ان سے بڑھ کر سچّا جواب اُور کون دے سکتا ہے!"

رادھا چاہتی تھی کہ کرن سنگھ اس سلسلے میں جو تلخ ترش باتیں مجھ سے کرتا ہے، دیول دیوی کے سامنے بھی دوہرائے تاکہ روز روز کے سوال و جواب کا سلسلہ ختم ہو ——— اور شاید کرن سنگھ بھی بیٹی کے پیام سلام سے تنگ آ کر یہ فیصلہ کر کے آیا تھا کہ دیول دیوی کا دل چاہے جتنا دُکھے اب

اسے تاریکی میں نہیں رکھنا چاہئے، اسے بتا دینا چاہئے کہ کنول دیوی اب واپس نہیں آسکتیں، اور آ بھی جائیں تو قبول نہیں کی جا سکتیں!

رادھا نے تو کرن سنگھ سے کچھ نہیں کہا، لیکن دیول دیوی نے دیکھتے ہی اس کی خبر لے ڈالی۔ کہنے لگی:۔ "پتا جی! ایسا معلوم ہوتا ہے آپ ماتا جی کو بالکل بھول گئے، لیکن میں تو نہیں بھول سکتی۔ ہر وقت میری آنکھوں میں ان کی تصویر پھرا کرتی ہے، ہر دم ان کی یاد مجھے ستایا کرتی ہے، ان کے بنا مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا، یہ زندگی سونی سونی سی لگتی ہے، آخر کب پتہ چلے گا ان کا؟ کب درشن ہوں گے ان کے؟ آپ کیا کر رہے ہیں ان کی بازیابی کے لئے؟"

کرن سنگھ نے ایک آہ سرد کھینچتے ہوئے بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھا، اور ڈبڈبائی آنکھوں گلوگیر آواز اور تھرائے ہوئے لہجہ میں کہا۔

"بیٹی! اپنے باپ کو اتنا پاپی اور کٹھور نہ سمجھو، بھلا جس عورت کے ساتھ زندگی کی دھوپ چھاؤں بسر ہوئی ہے اسے بھول سکتا ہوں؟ اس کو فراموش کر دوں گا؟ وہ تیری ماتا تھی۔ میرے دکھ کی ساتھی تھی۔ میرے جیون کو بنانے میں کسی کا اتنا ہاتھ نہیں ہے جتنا کنول دیوی کا!"

بچوں کی طرح منہ بنا کر باپ کی گردن میں دیول دیوی نے باہیں ڈال دیں، اور شکایت بھرے لہجہ میں کہا:۔

"تو پھر آپ انہیں کیوں نہیں ڈھونڈتے؟ وہ ضرور مل جائیں گی۔ بھلا خلجی انہیں قید رکھ کر کیا کرے گا؟ ——— کیا مل جائے گا اسے؟"

کرن سنگھ نے جیسے یہ ساری باتیں سنی ہی نہیں۔ اس نے خلا کی طرف گھورتے ہوئے بالکل اسی لب و لہجہ میں کہا:۔

"لیکن بیٹی، ایک بات صاف صاف کہہ دوں، ——— بے شک میں کنول کو بہت چاہتا

ہوں۔ لیکن تم سے زیادہ نہیں۔ کنول کو تجھ پر قربان کر سکتا ہوں، لیکن تجھے کنول پر قربان نہیں کر سکتا۔"

اس غیر متوقع گفتگو کو سن کر دیول دیوی بہت متعجب ہوئی۔ اس نے باپ کے گلے میں ویسے ہی باہیں ڈالے ڈالے کہا:۔

"لیکن پتا جی، اس قربانی کا سوال آپ کیوں لے بیٹھے؟ مانا کہ آپ مجھے ماتا جی سے زیادہ چاہتے ہیں، لیکن مجھ پر انہیں قربان کر دیں، اس کی ضرورت کیا ہے؟"

ایک کامیاب اداکار کی طرح کرن سنگھ نے پھر ایک ٹھنڈی سانس لی، اور دیول دیوی کے سر پر محبت اور شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا:۔

"میری بچی! تو ابھی نادان ہے، نا سمجھ ہے، تو جوان ہو چکی ہے، لیکن باتیں بچوں کی سی کرتی ہے اگر کنول کو تجھ پر قربان کرنے کی ضرورت نہ پیش آگئی ہوتی، اگر یا میں کوئی دقیقہ اٹھا رکھتا اس کی تلاش میں؟ کنوؤں میں بانس ڈال دیتا، روپوں کا ڈھیر لگا دیتا، خود بھیس بدل کر رہ جاتا، اور جہاں کہیں بھی وہ ہوتی اسے جا کر لاتا، تب کھانا کھاتا، تب پانی پیتا، تب بستر پر لیٹتا، تب دھلے ہوئے کپڑے پہنتا تب اطمینان کا سانس لیتا، تب چین کی نیند سوتا!"

دیول دیوی کا تعجب اور زیادہ بڑھ گیا۔ اس کی عقل کام نہیں کر رہی تھی کہ آج مہاراج کس طرح کی باتیں کر رہے ہیں۔ اس نے استعجاب اور حیرت کی کیفیت اپنے اوپر طاری کرتے ہوئے کہا:۔

"تو پتا جی آخر آپ یہ سب کچھ کیوں نہیں کرتے؟ کیا ماتا جی سے کوئی خطا ہوئی؟ —— بتایئے، میرا دل ہول رہا ہے، آنسو اُمڈے آ رہے ہیں میری آنکھوں میں!"

اور یہ کہتے کہتے واقعی آنسوؤں کا سیلاب اس کی آنکھوں سے بہہ نکلا۔ کرن سنگھ نے بیتاب ہو کر اسے چھاتی سے لگا لیا اور کہا:

"میری بچی! اب رونا دھونا بیکار ہے، جو ہونا تھا وہ ہو چکا، اب زندگی بھر کنول تجھے نہیں

بل سکتی۔ اسے بھول جا، اس کی یاد دل سے نکال دے، وہ اب تیری نہیں رہی، وہ اس قابل نہیں رہی کہ یہاں آسکے، وہ ملیچھ ہو چکی، ناپاک ہو چکی، وہ مسلمانوں میں جا کر اب کسی توقیر کی مستحق نہیں رہ گئی۔ اب وہ یہاں نہیں آسکتی، اور آجائے تو کھپ نہیں سکتی، اسے واپس جانا پڑے گا!"

دیول دیوی کے آنسو سوکھ گئے۔ باپ سے ذرا ہٹ کر وہ بیٹھ گئی، اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا:۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں پتا جی؟ کسی اور کو نہیں اپنی دھرم پتنی کو؟ میری ماں کو؟ آخر انہوں نے کون سا پاپ کیا ہے؟ کیا وہ خود سے قید ہو گئیں؟ کیا وہ خود سے مسلمانوں کے پاس چلی گئیں؟ پتا جی! ایسا ظلم نہ کیجئے، ایسی باتیں نہ کیجئے، میرا دل پھٹ جائے گا۔ میری ماں سیتا کی طرح پاک اور پوتر ہے، اسے کون پاپی کہہ سکتا ہے؟ کس کے منہ میں زبان ہے کہ اسے پاپی کہے؟ —— بتائیے کون کہتا ہے یہ؟"

بڑی سنجیدگی کے ساتھ کرن سنگھ نے اپنے اوپر ذرا بھی جذباتی کیفیت طاری کئے بغیر بڑے ٹھنڈے لہجے میں کہا:۔

"بیٹی! بات وہی ہے جو میں کہہ رہا ہوں۔ تو نے اپنی ماں کو سیتا سے تشبیہ دی ہے۔ لیکن یاد کر، پاک اور پوتر (مقدس) ہونے کے باوجود جب وہ راون کے پاس چند دن قید میں کاٹنے پر مجبور ہوئیں، ہندو سماج نے معاف کر دیا انہیں؟ —— جس سماج نے سیتا جیسی پوتر دیوی کو معاف نہیں کیا، تیرا خیال ہے کہ وہ کنول دیوی کو معاف کر دے گی؟ کتنی بھولی ہے میری دیول دیوی؟ اسی لئے تو کہتا ہوں تو ابھی بچہ ہے —— بالکل بچہ —— !"

لیکن یہ باتیں دیول دیوی کو مطمئن نہ کر سکیں۔ اس نے تیوری چڑھا کر جھلائے ہوئے لہجہ میں بڑی سختی کے ساتھ باپ کو ٹوکا، کہنے لگی:۔

"پتاجی، کیا ہماری ہندو سماج اتنی ظالم، ایسی سفاک اور اس قدر غیر منصف ہے؟"
کرن سنگھ کے پاس جواب تیار تھا:۔

"ہاں بیٹی! ——— آج سے نہیں، ہزاروں سال بیت گئے، جب سے یہی چلن چلا آرہا ہے، اور جب تک قیامت نہیں آجاتی، ہمارے سماج کا یہ قانون اسی طرح قائم رہے گا!"
دیول دیوی کی باغیانہ روح جاگ اٹھی اور اس نے تڑپ کر کہا:۔
"پتاجی! میں اس سماج کو نہیں مانتی۔ میں اس سماج کو ٹھکراتی ہوں۔ سماج کو ہمارے معاملہ میں دخل دینے کا کیا حق ہے؟ ایسی سماج کو ہم نہیں مانتے!"
کرن سنگھ کے ہونٹوں پر تبسم کھیلنے لگا۔ اس نے کہا:۔
"بیٹی! میں کہہ چکا تُو ابھی بچہ ہے، جو کچھ میں جانتا ہوں تو نہیں جانتی۔ ہم سماج کو چھوڑ بھی دیں لیکن سماج کی گرفت سے آزاد نہیں ہو سکتے!"

دیول دیوی نے بے بسی اور غصہ کے ساتھ کہا:۔
"واہ پتاجی، آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ میں نہیں مانتی ہوں ایسی باتوں کو۔ آپ شاید بھگوان سے بھی زیادہ سماج سے ڈرتے ہیں!"
کرن سنگھ نے اس جرم کا اعتراف کر لیا۔ اور نہایت صفائی سے کہا:۔
"ہاں بیٹی، میں بھگوان سے اتنا نہیں ڈرتا، جتنا سماج سے ڈرتا ہوں۔ بھگوان تو معاف کر دیتے ہیں، لیکن سماج سے بخشش کی امید نہیں، اور اس سے بغاوت کر کے زندہ رہنا ممکن نہیں!"
دیول دیوی ان باتوں سے ذرا بھی مطمئن نہیں ہوئی۔ وہ باپ سے تابڑ توڑ سوال پر سوال کئے جا رہی تھی۔ اس نے پوچھا:۔
"آخر کیوں زندہ نہیں رہ سکتے، ——— آپ تو خواہ مخواہ ڈرتے ہیں۔ ڈر دل سے نکال دیجئے

پھر سماج بے بس ہو جائے گی، دیکھ لیجئے گا!"

کرن سنگھ نے بھی لاجواب نہ ہونے کی قسم کھائی تھی، کہنے لگا:۔

"دیکھ بیٹی! اگر میں سماج کو ٹھکرا دوں تو تجھے کیا کروں گا؟ کیا مجھ میں اتنی ہمت اور سکت ہے کہ تجھے بھی ٹھکرا دوں؟"

ہر ہر بات پر دیول دیوی کا استعجاب بڑھتا جاتا تھا۔ ہر ہر استفسار پر اسے ایک ایسی نئی بات معلوم ہوتی تھی جو اس کی پریشانی اور حیرت میں پہلے سے زیادہ اضافہ کر دیتی تھی۔

"پتا جی! آپ میرا ذکر کیوں لے بیٹھے؟ نہ میں نے سماج کا کچھ بگاڑا ہے، نہ مجھ سے کوئی وجہ پرخاش ہے۔ آپ کی خود کی کوئی بات ہو تو کہئے ———!"

کرن سنگھ نے سمجھانے کے انداز میں کہا:۔

"بیٹی! ذرا عقل سے کام لے۔ اگر ہم لوگ سماج سے بے پروا ہو گئے، تو پھر تیری شادی کہاں ہو گی؟ کیا ہماری سماج ایسی لڑکی کو قبول کر لے گی، جس کی ماں مسلمانوں کے پاس رہ چکی ہو، وہ اس عورت کو بھی نفرت سے دیکھیں گے اور اس کی بیٹی کو بھی، ———!"

اس کا جواب دیول دیوی کے پاس تیار تھا:۔

"کوئی پروا نہیں۔ میں خود ایسی سماج سے، ایسے لوگوں سے نفرت کرتی ہوں!"

کرن سنگھ نے سوال کیا:۔

"لیکن نفرت کر کے جاؤ گی کہاں؟ ——— کیا اس دیس سے باہر کسی دیس میں جا کر رہو گی؟ کیا اس سماج کے علاوہ کوئی اور سماج پیدا کر لو گی؟ کیا ان لوگوں کے علاوہ کوئی اور لوگ ہوں گے، جن کے مرنے جینے میں شریک ہو گی؟ ——— نہیں بیٹی، ایسی بات نہ سوچو جو ہو نہ سکے، جسے سوچ لینا تو آسان ہو لیکن جس پر عمل کرنا ناممکن ہو۔ اگر ہٹ دھرمی کر رہنا ہے اس سماج میں بھی

رہنا پڑے گا، اور اگر اس سماج کو چھوڑو گی، تو دھرم بھی چھوڑنا پڑے گا، اور دھرم چھوڑنے کے بعد پھر کسی اور دیس کی تلاش کرنا پڑے گی، ——— کیا تم اس کے لئے تیار ہو؟ ——— بولو؟ ——— جواب دو ——— ؟"

رادھا بول پڑی بیچ میں :-

"نہیں مہاراج کچھ بھی ہو جائے اپنا دھرم تو نہیں چھوڑ سکتے۔ ہم دھرم چھوڑ کر کہاں جائیں گے؟ نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے، ——— !"

کرن سنگھ نے رادھا کی پیٹھ تھپکی اور کہا :-

"بیٹی تُو سچ کہتی ہے، جو کچھ تو نے کہا، یہی میں بھی کہہ رہا ہوں، لیکن دیول دیوی کی سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ میری بات تو مانتی نہیں، تیری بات مانتی ہے، تُو ہی اسے سمجھا سکتی ہے۔ میں تو اب جاتا ہوں، تُو اس سے باتیں کر اور جو غلط باتیں اس کے دل میں بیٹھ گئی ہیں انہیں نکال دے !"

رادھا کو اپنے بارے میں اتنا حسنِ ظن نہیں تھا، کہ وہ دیول دیوی کو سمجھا کر راہِ راست پر لا سکے گی، لہٰذا اس نے بغیر کسی انکسار کے صاف صاف کہہ دیا :-

"مہاراج! انہیں تو آپ ہی سمجھا سکتے ہیں، اور کوئی نہیں سمجھا سکتا، ——— لیکن جلدی کیا ہے، سمجھ جائیں گی خود ہی رفتہ رفتہ !"

کرن سنگھ نے کوئی جواب نہیں دیا، اور مسکراتا ہوا چلا گیا۔ کرن سنگھ کی باتوں سے رادھا پورے طور پر مطمئن ہو چکی تھی، لیکن دیول دیوی کے دل میں جو کانٹا کھٹک رہا تھا، اس کی کھٹک بدستور قائم تھی۔ وہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہی تھی، سماج کے ظلم پر، باپ کی کمزوری پر، اپنی بے بسی پر، اور رادھا کی بے وقوفی پر اسے غصہ آ رہا تھا۔ کرن سنگھ کے جانے کے بعد اس نے برہم لب و لہجہ میں رادھا سے کہا :-

"کیوں ری تیری بھی یہی رائے ہے نا! ماتاجی اب پوتر (پاک) نہیں رہیں، تو بھی انہیں ملیچھ سمجھنے لگی ہے۔ تیری نگاہ میں ان کی کوئی عزت اور وقعت نہیں رہی؟ وہ اگر آجائیں تو پھر تو بھی انہیں حقیر و ذلیل سمجھے گی؟ ان کے ساتھ اچھوتوں کا سا برتاؤ کرے گی؟"

رادھا کی رگِ وفاداری پھڑک اٹھی۔ اس نے کہا:۔

"ارے واہ کہیں ایسا ہو سکتا ہے بھلا؟ وہ آجائیں تو میں ان کے قدموں کی خاک اپنے سر پہ ملوں، وہ بھلا ملیچھ ہو سکتی ہیں؟ اچھوت ہو سکتی ہیں؟ ان سے اچھی کوئی عورت تو میں نے دیکھی نہیں آج تک مجھ پر ہمیشہ مہربانی کرتی رہیں۔ میں تو ان کے احسان کے بوجھ تلے دبی ہوئی ہوں، لیکن ذرا یہ تو سوچو، میرے تمہارے سوچنے سے کیا ہوتا ہے؟ بات سماج ہی کی بالا رہے گی چاہے ٹھیک ہو یا غلط، معقول ہو یا نامعقول، اس سے لڑائی کرنا عقلمندی نہیں۔ ہم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، اور خود کہیں کے نہ رہیں گے۔ کہیں بھی پناہ نہیں ملے گی ہمیں!"

دیول دیوی نے فیصلہ کن انداز میں کہا:۔

"پتاجی چاہے جو کچھ کہیں، تو چاہے جو سوچ، سماج کی رائے کچھ بھی ہو، میں سب کو، ساری دنیا کو ٹھکرا سکتی ہوں، لیکن اپنی ماتاجی کو نہیں ٹھکرا سکتی۔ وہ میری نظر میں آکاش کے تاروں سے زیادہ پاک اور پوتر ہیں!"

رادھا نے بات کو مختصر کرتے ہوئے کہا:۔

"اچھا، تو جب وہ آجائیں، تب جو چاہے کرنا۔ اب تو اُن کا خیال چھوڑ دو، کیا جان دے دو گی — اپنی، انہیں یاد کر کر کے؟"

دیول دیوی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے رادھا کی طرف سے مُنہ پھیر لیا اور کہا:۔

"ہاں، ماتاجی کے بنا یہ جیون بیکار ہے میرے لئے۔ میں کسی طرح بھی زندہ نہیں رہ سکتی انہیں

چھوڑ کر، انہیں بھلا کر ———— مَیں تمہارا اور پتا جی کا ایسا دل کہاں سے لاؤں!"

رادھا دیول دیوی کے قدموں سے لپٹ گئی۔

"میرے دل کو بُرا نہ کہو، وہ اچھا ہے، بہت اچھا ہے، وہ تمہیں چاہتا ہے، تمہاری پُوجا کرتا ہے، تمہارے لئے جان دے سکتا ہے۔ میری باتوں کو معاف کردو۔ مَیں نے جو کچھ کہا تھا وہ دشمنی میں نہیں، دوستی میں کہا تھا۔ مجھ سے تمہاری یہ حالت نہیں دیکھی جاتی کسی طرح!"

اور پھر رادھا پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگی۔ دیول دیوی نے اس کی ہنس کی سی گردن اوپر اُٹھائی، اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا:۔

"پگلی کہیں کی، رونے کیوں لگی؟ ———— مَیں نے کچھ کہا ہے تجھے؟ ——— مَیں تو یونہی ایک بات کہہ رہی تھی، ——— !"

کئی دن گزر گئے، اس عرصے میں کوئی خاص اور نئی بات نہیں ہوئی؛ سوا اس کے، کہ گوبند پرشاد راجدھانی سے واپس آچکا تھا۔ اپنے ساتھ سپاہ کا اچھا خاصا دستہ لے کر، جب سے وہ آیا تھا، اس میں ایک عجیب قسم کی تبدیلی نظر آرہی تھی۔ یعنی ایسا معلوم ہوتا تھا، اب وُہ نیازمند اور سرنگوں نہیں، حاکم اور فرمانروا ہے۔ وہ صرف دیول دیوی سے محبت ہی نہیں کرتا اپنی محبت منوا بھی سکتا ہے۔ اب تک بہت مختصر سی دو چار ملاقاتیں ہوئی تھیں، لیکن کھُل کر گفتگو نہیں ہوسکی تھی۔ البتہ کرن سنگھ سے بند کمرہ میں ہر روز بڑی دیر تک گفتگو ہُوا کرتی تھی، اور یہ گفتگو بھی عجیب قسم کی تھی۔ جب سے گوبند پرشاد واپس آیا تھا، کرن سنگھ پر چُپ چُپ سی لگ گئی تھی۔ نہ چہرے پر بشاشت تھی، نہ اطمینان، کچھ کھویا کھویا سا پریشان اور مضطرب سا نظر آنے لگا تھا۔ خاص طور پر بند کمرہ میں گوبند پرشاد سے گفتگو کرنے کے بعد جب وہ برآمد ہوتا تھا تو صاف معلوم ہوتا

تھا، اتنا پریشان ہے کہ جان سے بیزار ہے۔ اس عرصہ میں اس نے رادھا اور دیول دیوی سے بھی کسی قسم کی بات چیت نہیں کی تھی جس سے اِن دونوں کی پریشانی اَور بھی بڑھ رہی تھی۔ ایک دن رات کو کافی دیر تک باتیں کرنے کے بعد دیول دیوی اور رادھا سونے کی تیاریاں کرنے لگیں۔ اتنے میں کرن سنگھ آتا ہُوا دکھائی دیا۔ ایسے ناوقت اور خلافِ معمول کرن سنگھ کو آتا دیکھ کر رادھا اور دیول دیوی کا ماتھا ٹھنکا ضرور کچھ دال میں کالا ہے، ورنہ یہ کون سا وقت ہے آنے کا۔ دونوں گُم سُم ہو کر بیٹھ گئیں کہ دیکھیں اب مہاراج کیا کہتے ہیں؛ لیکن مہاراج آ کر چُپ چاپ بیٹھ گئے۔ مُنہ سے کچھ بولتے ہی نہیں۔ آخر دیول دیوی نے قفلِ خاموشی توڑا۔ کہنے لگی:۔

"پتا جی، کیا بات ہے، آج کئی دن سے آپ چُپ چاپ نظر آ رہے ہیں۔ حالانکہ گوبند پرشاد کافی فوج بھی لے آیا اپنے ساتھ!"

کرن سنگھ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے کہا:۔

"بیٹی کیا کہوں؛ نہ جانے قسمت میں کیا لکھا ہے؛ نہ جانے کیا ہونے والا ہے؟ ایسا معلوم ہوتا ہے، میری زندگی کے دن پُورے ہو گئے۔ مَوت آ گئی ہے تو آ جائے، مر جاؤں گا۔ لیکن سوچتا ہوں میرے بعد تیرا کیا ہو گا؛ تیری دیکھ بھال کون کرے گا؛ تجھے تسلی تشفی کون دے گا؟"

یہ سُن کر دیول دیوی کا دِل دھک دھک کرنے لگا۔ خاموش رہتے بنتی تھی، نہ کچھ پُوچھتے ہوئے، نہ جانے پتا جی کیا خبر لائے ہوں؛ نہ جانے کیا کہہ بیٹھیں؛ آخر جی کڑا کر کے اس نے پوچھا:۔

"کچھ تو بتایئے، کیا ہُوا؛ کیا گوبند پرشاد کی یہ فوج آپ کا ساتھ نہیں دے گی؟"

ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کرن سنگھ نے کہا:۔

"بیٹی! یہ فوج نہ خلجی کے لئے آئی ہے، نہ کسی دشمن کے لئے، یہ صرف میری سرکوبی کے لئے آئی ہے!"

یہ سنتے ہی دیول دیوی کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ اس کی گھگھی بندھ گئی، یہ پتاجی کیا کہہ رہے ہیں؟ رادھا نے ہمت کرکے پوچھا :-

"یہ کیا بات ہوئی مہاراج؟ کیا راجکمار کے باپ نے آپ کا ساتھ دینے سے مسلمانوں سے لڑنے سے انکار کر دیا ——— ؟"

کرن سنگھ نے افسردہ لہجہ میں کہا :-

"ہاں انکار کر دیا، وہ ہماری خاطر مسلمانوں سے نہیں بگاڑنا چاہتے ہیں، وہ کہتے ہیں ہم بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ نہیں لگا سکتے، نہ مسلمانوں سے لڑ سکتے ہیں، نہ لڑنا چاہتے ہیں، بلکہ مسلمانوں سے لڑائی جھگڑے کا نام بھی سننا نہیں چاہتے!"

رادھا نے غصہ سے برافروختہ ہو کر کہا :-

"ہائے بھگوان، راجکمار یہ پیام لائے ہیں اپنے پتاجی کا؟"

کرن سنگھ۔ "ہاں! ——— اور صرف یہی نہیں، راجکمار اپنے باپ کا یہ حکم بھی لا چکے ہیں کہ قتلغ خواجہ کے پاس اب کوئی سفارت بھی میں نہیں بھیج سکتا!"

رادھا۔ (دانتوں تلے انگلی دبا کر) "ہائے رام! یہ کیوں؟ کیا قتلغ خواجہ سے بھی ڈرتے ہیں وہ؟"

کرن سنگھ۔ "وہ کہتے ہیں مسلمانوں کو ضرور پتہ چل جائے گا کہ میں نے یہ سفیر رام نگر سے بھیجا تھا، لہٰذا وہ ہمارے دشمن بھی ہو جائیں گے، ضرور انتقام لیں گے، اور اس کی زد میں ہم بھی آ جائیں گے!"

رادھا۔ (پریشان ہو کر) "پھر اب کیا ہوگا مہاراج؟ یہ تو بڑی بُری بات ہوئی۔ راجکمار یہاں سے تو بڑی بڑی باتیں بنا کر گیا تھا، اور پھر چاہے گا ہماری راجکماری سے اس کا بیاہ ہو جائے؟ ہُوا بیاہ، لشکاروں گی اس کی مُنہ میں!"

کرن سنگھ۔ "رادھا تو کیا کہہ رہی ہے؟ تو کچھ نہیں جانتی، اندر ہی اندر کیا ہو رہا ہے؛ تجھے کچھ

اور بھی معلوم ہے، آج راجکمار نے کیا کہا ہے؟"

رادھا۔ "میں کیا جانوں مہاراج، جو کچھ آپ کہیں گے وہی معلوم ہو سکتا ہے مجھے تو ۔۔۔۔ اور کیا کہا ہے، بتلائیے!"

کرن سنگھ: "گوبند پرشاد کہتا ہے کہ دیول دیوی کی شادی مجھ سے کر دو!"

رادھا۔ (بگڑ کر) "پھر آپ نے کیا جواب دیا؟ ۔۔۔۔ منظور کر لیا؟ ۔۔۔۔ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا، چاہے اِدھر کی دُنیا اُدھر ہو جائے۔ راجکماری اُس سے نفرت کرتی ہیں، وہ ہر کار رُزبول سے نفرت کرتی ہیں، وہ کسی طرح بھی اس سے شادی کرنے پر رضامند نہیں ہو سکتیں۔ مُنہ دھو رکھئے اپنا!"

کرن سنگھ نے جیسے یہ ساری باتیں سُنی ہی نہیں۔ اس نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا:۔

"وہ کہتا ہے، اگر دیول دیوی سے میری شادی نہ کر دی، تو میں زبردستی کر لوں گا، اور تمہیں گرفتار کر کے خلجی کے پاس بھیج دوں گا! ۔۔۔۔ بتاؤ بیٹا، اب میں کیا جواب دوں اسے؟ کر دُوں انکار ۔۔۔۔؟"

رادھا نے کوئی جواب نہیں دیا، گُم سُم کھڑی رہی۔ کرن سنگھ نے پھر پوچھا:۔

"تُو خاموش کیوں ہو گئی رادھا؟ کچھ تو مُنہ سے بول، کچھ تو بتا، اس نے صرف ایک دن کی مہلت دی ہے۔ اگر چوبیس گھنٹہ کے اندر اس کے حسبِ منشا جواب میں نے نہ دیا، تو میں گرفتار کر کے خلجی کے پاس بھیج دیا جاؤں گا!"

رادھا رونے لگی۔ خود ہی اپنے آنسو پونچھتے ہوئے اس نے کہا:۔

"ہتیارا کہیں کا، پاپی، چنڈال!"

اور پھر اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

کرن سنگھ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے دیول دیوی سے نہ آنکھ ملائی، نہ بات کی۔ جاتے جاتے پھر رادھا

سے کہا — "تم لوگ آپس میں مشورہ کر لو اور کل مجھے جواب دے دو، وعدہ کرتا ہوں اگو بند پرشاد سے وہی کہوں گا جو تمہاری صلاح ہو گی — مجھے خلجی کے پاس گرفتار ہو کر جانا اور جا کر قتل ہو جانا منظور ہے۔ لیکن میں دیول دیوی کا دل دکھانا نہیں چاہتا۔ میں اس پر جبر کرنا نہیں چاہتا۔ میں اس کی مرضی کے خلاف کوئی کام کرنا نہیں چاہتا — سوچنے کی بات صرف یہ ہے کہ میں انکار کروں، تو کیا شادی رک جائے گی؟ جو مجھے گرفتار کر کے خلجی کے پاس بھیج دینے کی طاقت رکھتا ہے۔ کیا وہ ایک کمزور لڑکی کو گرفتار نہیں کر سکتا؟ اس پر جبر نہیں کر سکتا؟ اس سے من مانی بات نہیں منوا سکتا؟ — اچھا بیٹی! اب میں چلا — اب صبح آؤں گا — !"

کرن سنگھ کے جانے کے بعد بڑی دیر تک اس کمرے میں سناٹا چھایا رہا، نہ دیول دیوی نے کوئی بات کی، نہ رادھا کے منہ سے کوئی لفظ نکلا۔ دونوں خاموش تھے، دونوں پر اضطراب و اضطرار کی کیفیت طاری تھی۔

بڑی دیر کے بعد سہمے ہوئے انداز میں رادھا نے کہا:۔

"اب کیا ہو گا راجکماری! یہ تو ہم عجیب مصیبت میں پھنس گئے؟ گوبند پرشاد ایسا چنڈال نکلے گا اس کا تو کبھی بھولے سے بھی خیال نہیں آیا تھا!"

مطمئن لہجہ میں دیول دیوی نے کہا:۔

"کمزور کو سب دباتے ہیں رادھا! اس میں گوبند پرشاد کا کیا قصور ہے؟ اس کی جگہ جو بھی ہوتا یہی کرتا! سوال یہ ہے اب کیا کیا جائے —؟"

رادھا:۔ "یہی تو میں بھی پوچھ رہی ہوں؟ — میری تو عقل حیران ہے!"

دیول دیوی:۔ "میں موت سے نہیں ڈرتی، میں قوت اور طاقت سے بھی خوفزدہ نہیں ہوتی۔ میں ہر حالت میں اپنے آپ کو راجکمار سے بچا سکتی ہوں!"

رادھا: "کس طرح؛ ذرا ہمیں بھی تو بتاؤ؟"

دیول دیوی: "بھاگ کر، ـــــ میرے گھوڑے کا پیچھا راجکمار کسی طرح نہیں کر سکتا!"

رادھا: "لیکن اس کے پاس فوج ہے، ـــــ وہ تمہیں گھیر کر پکڑ لے گا، پھر کیا کرو گی؟"

دیول دیوی: "پھر زہر کھا لوں گی، کیا وہ زہر کا اثر بھی کم کر سکتا ہے؟ میری انگوٹھی میں وہ نگینہ ہے، جو پل بھر میں میرے شریر (جسم) کو پانی کر دے گا۔ پھر کیا راجکمار گوبند پرشاد اس سے بیاہ رچائیں گے؟"

رادھا: "بھگوان نہ کرے، تم اپنی جان کیوں دینے لگیں، مرے وہ چنڈال!"

دیول دیوی: "نہیں! ایسے ظالموں کی رسی دراز ہوتی ہے، وہ زندہ رہے گا، اسے کوئی نہیں مار سکتا"

رادھا: "دیکھو تو جب سے پالم پور سے آیا ہے تم سے اچھی طرح ملا بھی نہیں!"

دیول دیوی: "ہاں، ـــــ اسے قوت و طاقت پر غرہ جو ہے، پھر کیوں ملے؟"

رادھا: "اگر تم نے جان دینے کا فیصلہ کر لیا ہے تو مجھے بھی مرنے دو۔ میں بھی زندہ نہیں رہنا چاہتی۔ پہلے وہ زہر میں کھاؤں گی، پھر تم کھانا، ـــــ!"

دیول دیوی: "نہیں رادھا یہ نہیں ہو سکتا، اور میں زہر کھا لوں گی؟ اس کا فیصلہ تو ابھی نہیں کیا۔ میں نے ایک بات ذہن میں آئی تھی، کہہ دی ـــــ!"

رادھا: (خوش ہو کر) "تو تم زہر نہیں کھاؤ گی؟ ہاں کیوں جان دیتی ہو اپنی، ابھی تم نے دنیا کا دیکھا کیا ہے؟"

دیول دیوی: "نصیحت تو رہنے دو، زہر کھاؤں گی ضرور، ممکن ہے راجکمار کو بھی تھوڑا سا چکھا دوں، لیکن ابھی نہیں، ـــــ!"

رادھا: "پھر کب؟ ـــــ تم تو پہیلیاں بجھا رہی ہو، ـــــ صاف صاف کہو!"

دیول دیوی: "پتاجی کی جان بچ جانے کے بعد ـــــ یعنی راجکمار سے شادی کے بعد!"

رادھا۔ (حیرت سے) "تو کیا تم راجکمار سے شادی کر لو گی؟"

دیول دیوی: "ہاں، اس کے سوا پتاجی کی جان بچانے کی اور صورت کیا ہے؟ میں ان کی جان تو نہیں لے سکتی کسی طرح؟ کیا ایک بیٹی باپ کے لئے پیامِ موت بن جائے؟"

رادھا۔ "اور شادی کے بعد خود بھی زہر کھا لو گی اور راجکمار کو بھی کھلا دو گی؟"

دیول دیوی۔ "بے شک! ـــــ اس کے سوا اس کمینہ سے انتقام لینے کی اور صورت کیا ہے ـــــ عورت کا انتقام بڑا ہولناک ہوتا ہے۔ میں راجکمار سے انتقام لوں گی؛ ضرور لوں گی، کسی طرح بھی اسے معاف نہیں کر سکتی!"

رادھا۔ "تو کیا تمہارے اور راجکمار کے مرنے کے بعد اس کا باپ مہاراج سے انتقام نہیں لے گا؟"

دیول دیوی: "وہ کیوں انتقام لے گا؛ اسے کیا معلوم کہ اصل معاملہ کیا تھا؟ کیا تم مخبری کر دو گی جا کر؟"

رادھا۔ "اے واہ! میں تو تمہارے ساتھ مروں گی۔ مخبری کرنے کیا میرا بھوت جائے گا؟ ـــــ ہاں یہ اچھی صورت ہے!"

دیول دیوی: "بس یہی ایک صورت ہے، ـــــ صبح جب پتاجی جواب لینے آئیں تو ان سے کہہ دینا دیول دیوی کو یہ رشتہ منظور ہے، ـــــ بلکہ ان سے یہ بھی کہنا، شبھ گھڑی دیکھ کر جلد سے جلد شادی کا بندوبست کریں!"

رادھا۔ "یہ لو، اتنی جلدی کاہے کی ہے؟"

دیول دیوی: "انتقام لینے کی ـــــ جب ایک کام کرنا ہی ہے تو پھر دیر کیوں کی جائے؟"

رادھا۔ "ہاں ٹھیک ہے، ـــــ کہہ دوں گی مہاراج سے! ـــــ لیکن ایک بات کا خاص طور پر تمہیں خیال رکھنا پڑے گا ـــــ!"

دیول دیوی:۔ "کون سی بات؟ ——— کس بات کا خاص طور پر خیال رکھنا پڑے گا مجھے۔"

رادھا:۔ "راجکمار کو ہمارے ارادوں کا پتہ نہ چل سکے۔ اس لئے اس سے بڑی اچھی طرح پیش آنا پڑے گا!"

دیول دیوی:۔ "اتنا میں بھی سمجھتی ہوں، بلکہ میں خود تجھ سے ابھی یہی کہنے والی تھی۔ شکار کو قابو میں کرنے کے لئے دانہ ڈالنا پڑتا ہے۔ بغیر اس کے وہ قابو میں نہیں آتا، ——— اچھا ہؤا، فیصلہ ہؤا جاتا ہے زندگی بھر کے جھگڑوں کا! ——— اب سو جاؤ رادھا، بہت رات آگئی ہے!"

رادھا نے جمائی لیتے ہوئے کہا:۔

"ہاں، رات تو بہت آگئی ہے لیکن نیند بھی تو اُڑ گئی ہے، دیکھ لینا کروٹیں ہی بدلتے ساری رات صرف ہوگی، کیا مجال جو ایک پل کے لئے بھی پلک جھپک جائے!"

دیول دیوی بستر پر لیٹ چکی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں، اور وہ عالمِ خیال میں نہ جانے کہاں کی سیر کر رہی تھی، نہ جانے کیا سوچ رہی تھی؟ نہ جانے کس کس طرح کے نقشے بنا رہی تھی؟

رادھا نے بڑی دیر تک کروٹیں بدلنے کے بعد پوچھا:۔

"کیا سو گئیں، دیول دیوی، ——— ؟"

وہ اگرچہ جاگ رہی تھی، لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا!

قابوچی!

نہ جانے کرن سنگھ بھی رات بھر سویا تھا یا نہیں لیکن صبح وہ راجکماری دیول دیوی کے کمرہ میں پہنچ گیا۔ رادھا اور دیول دیوی اسے جاگتی ہوئی ملیں، کل ان دونوں کے چہرے پر جو پریشانی نظر آرہی تھی، آج اس کا کہیں نام و نشان بھی نہیں تھا، دونوں کے چہروں پر بحالی تھی، اور اطمینان جھلک رہا تھا۔ کرن سنگھ کو یہ منظر دیکھ کر حیرت ہوئی۔ وہ تو یہ سوچ کر آیا تھا کہ رادھا کو ملول و مغموم، اور دیول دیوی کو گریاں و پریشان دیکھے گا۔ بڑی دیر تک دونوں کو سمجھائے گا، نشیب و فراز سمجھائیگا حکمت اور مصلحت کا درس دے گا، تب کہیں یہ ضدی لڑکی قابو میں آئے گی، لیکن یہ اطمینان اور بحالی دیکھ کر اس کا مرجھایا ہوا دل شگفتہ ہوگیا۔ وہ سمجھا، دل کی مراد بر آئی۔ سوچا اب سوال کروں لیکن چور کا دل کتنا؟ پھر دھڑکنے لگا۔ پھر اندیشہ ہائے دُور دراز آنے لگے۔ پھر یہ وسوسہ پیدا ہوا کہیں ان دونوں نے یہ فیصلہ تو نہیں کر لیا کہ انکار کر دیں؟ —— اگر ایسا ہوا تو میں کیا کروں گا؟ کیا کر سکتا ہوں میں؟ لیکن پھر یہ سوچ کر وہ مطمئن ہو گیا کہ اگر دیول دیوی نے انکار بھی کر دیا، تو میں گوبند پرشاد سے یہ کہہ کر اپنی جان بچالوں گا۔ بھئی میں کنیا دان پر راضی ہوں۔ میری طرف سے دیول دیوی تمہاری بیوی بن چکی۔ جی چاہے یہاں رکھو اور رہو، جی چاہے اپنی راجدھانی لے جاؤ بے شک وہ دیول دیوی پر زیادتی

کرے گا، لیکن آخرکار اُسے رضامند ہونا پڑے گا۔ جب میں اسے بچا نہیں سکتا، تو اس سے بڑھ کر حماقت کیا ہو سکتی ہے کہ اس کی حمایت اور تائید کر کے اپنی جان تج دوں؛ وہ مجھے گرفتار کر لے اور خلجی کے پاس بھیج دے، وہ بلا کو جس طرح میری جان لے گا، میں جانتا ہوں۔ اس تصور سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ نہیں میں مرنا نہیں چاہتا، اور خلجی کے ہاتھ سے تو ہرگز مرنا نہیں چاہتا دیول دیوی کو گوبند پرشاد سے شادی کرنا پڑے گی۔ اس نے ذرا برہمی کی کیفیت اپنے اوپر طاری کی اور دیول دیوی سے مخاطب ہوئے بغیر رادھا سے پوچھا:۔

"کہو تم لوگوں نے غور کر لیا میری رات کی تجویز پر؟"

رادھا مسکراتی ہوئی بولی:۔

"ہاں مہاراج! اچھی طرح غور کر لیا، بہت اچھی طرح!"

یہ الفاظ سُن کر کرن سنگھ کو اچنبا سا ہُوا۔ دل پھر دھڑکنے لگا۔ ان نالائقوں نے کیا فیصلہ کیا ہے؟ نہ جانے موافق یا مخالف؛ بہرحال گومگو سے تو کام نہیں چل سکتا، مجھے پوچھنا ہی پڑے گا، اور انہیں بتانا ہی پڑے گا۔ کیونکر ممکن ہے کہ خاموشی ہی خاموشی میں یہ معاملہ ٹل جائے۔ آخر اس نے اپنے حواس مجتمع کر کے پوچھا ــــ "تو یہ بھی بتا دو کیا فیصلہ کیا ہے تم لوگوں نے؟ تاکہ اور کچھ نہیں طبیعت تو یکسو ہو جائے!"

رادھا: "مہاراج! مجھے راجکماری کو سمجھانے کی ذرا بھی ضرورت نہیں پڑی۔ آپ کے جاتے ہی انہوں نے اپنا فیصلہ سنا دیا مجھے!"

کرن سنگھ: (ذرا جھلّا کر) "تو بتاتی کیوں نہیں، کیا فیصلہ کیا ہے راجکماری نے؟"

رادھا: "راجکماری نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ راجکمار گوبند پرشاد سے شادی کر لیں گی!"

یہ سُن کر کرن سنگھ اچھل پڑا۔ اسے یقین نہیں آیا کہ جو کچھ سُن رہا ہے سچ ہے؛ اس نے سراپا اضطراب و انتظار بن کر کہا:۔

"تو سچ کہتی ہے؟ ——— واقعی دیول دیوی نے یہ فیصلہ کر لیا ہے؟"

رادھا پھر مسکرا دی۔ اس نے کہا:-

"آپ کے سامنے تو بیٹھی ہیں، پوچھ لیجئے خود ہی، میں تو کہتی ہوں لڑکی ہو تو ایسی جیسی ہماری راجکماری ہیں۔ آپ جانتے ہیں وہ راجکمار سے پریم نہیں کرتیں، نفرت کرتی ہیں ———"

کرن سنگھ نے بات کاٹ کر کہا:-

"اور وہ کمبخت ہے بھی نفرت کے قابل، وہ کائر ہے، چنڈال ہے، دُنیا کی کون سی بُرائی ہے جو اس میں نہ ہو، لیکن کریں کیا، ہم اس کے بس میں ہیں، وہ سب کچھ کر سکتا ہے، ہم کچھ نہیں کر سکتے، ہماری جان اس کے ہاتھ میں ہے، اور ہم اس کا ناخن بھی نہیں توڑ سکتے!"

رادھا نے اپنی بات کا سلسلہ قائم کرتے ہوئے کہا:-

"میں یہ کہہ رہی تھی کہ راجکماری اس سے نفرت کرتی ہیں۔ لیکن صرف آپ کی جان بچانے کے لئے وہ اس رشتہ پر رضامند ہو گئیں، ورنہ یہ چنڈال کچھ بھی تو نہیں کر سکتا تھا ان کا!"

کرن سنگھ اس بات سے مطمئن نہیں ہوا، اس نے پوچھا:-

"کیوں کیا وہ راجکماری کو مجبور نہیں کر سکتا تھا؟ جو شخص کرن سنگھ جیسے شخص کا سر جھکا سکتا ہے، وہ کرن سنگھ کی بیٹی کو مجبور نہیں کر سکتا؟ نہیں رادھا، یہ نہ کہو۔ ہم بازی ہار چکے ہیں، وہ جیت چکا ہے۔ خیر جو کچھ ہوا، اچھا ہوا۔ خوشی ہوئی کہ دیول دیوی راضی ہو گئیں۔ سچ پوچھو تو اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار بھی نہیں تھا۔ اس شرط کو منظور کئے بغیر ہم زندہ بھی نہیں رہ سکتے تھے!"

اب دیول دیوی ضبط نہ کر سکی۔ اس نے جھلا کر کہا:-

"پتا جی! میں اپنی زندگی کی پروا نہیں کرتی۔ جب سے ماتا جی بچھڑی ہیں، میرے لئے زندگی میں کوئی سواد نہیں رہ گیا ہے، یہ زندگی کاٹنے کو دوڑتی ہے مجھے۔ میں مرنا چاہتی ہوں، زندہ رہنا

نہیں چاہتی۔ یہ راجکمار میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ کوئی بڑے سے بڑا طاقتور بھی مجھ سے اپنی بات نہیں منوا سکتا۔ میں بہت آسانی سے مرکر اس کی ضد کو شکست دے سکتی تھی۔ اب بھی ایسا کرسکتی ہوں۔ لیکن آپ زندہ رہنا چاہتے ہیں، اور ایک بیٹی کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ باپ کو بھی اپنے ساتھ مرنے پر مجبور کرے۔ بس یہ ہے میری رضامندی کا راز!"

یہ جلے کٹے فقرے سن کر کرن سنگھ شرمایا بھی اور تلملایا بھی۔ جی چاہا سخت جواب دے، بلکہ اس گستاخ لڑکی کے منہ پر طمانچہ ماردے جو یوں باپ کو طعنہ دے رہی ہے، زندگی سے محبت کا۔ کرن سنگھ مصلحت بیں اور موقع شناس بھی تھا۔ اس نے سوچا، اگر اس وقت بات بڑھی تو پھر ہرگز سدھر نہ سکے گی۔ لہٰذا وہ اپنا غصہ پی گیا، اپنی برہمی اس نے ظاہر نہ ہونے دی۔ بڑے ٹھنڈے اور میٹھے لب و لہجہ میں اس نے کہا:

"بیٹی تُو تو خفا ہوتی ہے خواہ مخواہ اپنے باپ پر، اگر تُو زہر کھا لیتی تو کیا میں زندہ رہتا پھر؟ میں بھی اسی وقت زہر کھا لیتا اور جان دے دیتا۔ لیکن جس لڑکی کو میں نے اتنے چاؤ اور پیار سے پالا ہے اسے مرتے دیکھنے کی مجھ میں ہمت نہیں —— اور بیٹی! یہ دُنیا ہے، یہاں ہر بات ہماری مرضی کے مطابق نہیں ہوتی۔ ہم کچھ چاہتے ہیں، بھگوان کی مرضی کچھ اور ہوتی ہے۔ ہوتا وہی ہے جو بھگوان چاہتے ہیں، اور بیٹی ایک بات تجھے اور بھی بتاؤں، بھگوان کی جو مرضی ہوتی ہے، اس میں ہماری بھلائی ہی ہوتی ہے۔ لیکن یہ بات شروع میں نہیں معلوم ہوتی، بعد میں معلوم ہوتی ہے۔ مجھے یقین ہے اس شادی میں بھی بھگوان کی کوئی مصلحت ہے ——!"

دیول دیوی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ راو رضا نے عقیدت سے سرشار ہو کر کہا:۔

"ہاں مہاراج! یہ بات تو ہے، بھگوان ہمارا بھلا نہ چاہیں گے تو کون چاہے گا، —— خیر راجکماری نے رضا مندی دے دی، اب آپ جلد سے جلد شبھ گھڑی دیکھ کر شادی کر دیجئے ——!"

کرن سنگھ،" وہ تو مَیں آج ہی گوبند پرشاد سے کہہ دوں گا، اور وہ خود ہی جلدی کرے گا۔ ہم تم سے کہیں زیادہ اسے جلدی ہے، ـــــــ لیکن تُو جلدی کی تاکید کیوں کر رہی ہے؟"

رادھا نے کرن سنگھ کے کان کے پاس مُنہ لے جا کر آہستہ سے کہا:۔

"مہاراج! آپ تو سمجھتے نہیں۔ راجکماری ایک ضدی ہیں، وہ آپ کی محبت سے مجبور ہو کر رضامند ہو گئی ہیں، لیکن اگر زیادہ دن لگے اور اگر نہیں پھر انکار کر بیٹھیں تو کیا ہوگا؟ ـــــــ آپ ہی جانیے ـــــــ!"

کرن سنگھ نے رادھا کی پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا:۔

"ہاں ہاں، اتنا مَیں بھی سمجھتا ہوں، ـــــــ!"

پھر وہ دیول دیوی کے پاس آیا، اور اس کے سر پر دستِ شفقت پھیرتے ہوئے کہنے لگا:۔

"بیٹی! مَیں تیرا شکر گزار ہوں، تُو نے اپنی شرافت سے ایک بڑا کٹھن اور نازک مسئلہ حل کر دیا۔ بھگوان تجھے اس کا بدلہ دیں گے ـــــــ"

پھر وہ ایک لمحہ بھی نہیں ٹھہرا، اور چلا گیا۔ وہ ڈر رہا تھا کہیں ان باتوں کے جواب میں پھر دیول دیوی کچھ جلی کٹی باتیں نہ سُنا ڈالے۔ درحقیقت وہ اپنی اس کمزوری پر دل ہی دل میں شرمندہ تھا۔ ضمیر بھی ملامت کر رہا تھا، لیکن یہ بھی گوارا نہیں تھا کہ مجرم کی طرح خلجی کے دربار میں حاضر ہو، اور وہاں اس کے تکّے بوٹی کئے جائیں ـــــــ!

کرن سنگھ کے جانے کے تھوڑی دیر بعد مسکراتا ہُوا، ہنستا ہُوا، ہشّاش بشّاش، سراپا سرور انبساط راجکمار گوبند پرشاد داخل ہُوا۔ اسے دیکھ کر رادھا بھی کھڑی ہو گئی اور دیول دیوی بھی ـ وہ بے تکلفی سے دیول دیوی کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ کہنے لگا:۔

"بڑے بھاگ رانی! کہ آج آپ کو مسکراتے ہوئے دیکھ رہا ہوں!"

دیول دیوی:- "آپ کو مسکراتا دیکھ کر مجھے تو یہ محل، یہ پھول، یہ باغ، یہ کیاریاں، یہ بیلیں، یہ بوٹے یہ ساری فضا، یہ ساری دُنیا مسکراتی ہوئی نظر آرہی ہے، پھر میں کیوں نہ مسکراؤں ـــــ !"

یہ الفاظ سُن کر گوبند پرشاد فخر سے جھومنے لگا۔ اس نے کہا:-

"راجکماری میں تمہارا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں کہ تم نے مجھے قبول کر لیا ـــــ بغیر امتحان لئے۔ میں تمہارے امتحان سے بہت ڈرنے لگا ہوں۔ اِس لئے جب سے راجدھانی سے آیا ہوں تم سے زیادہ بات چیت نہیں کی، پہلے مہاراج کرن سنگھ سے تمہارا عندیہ لیا، تب یہاں آنے کی جرأت ہوئی!"

رادھا خاموش نہ رہ سکی۔ بول پڑی:-

"واہ راجکمار، آپ بھی بس یونہی ہیں، کوئی مذاق کی باتوں کو اتنی سنجیدگی سے محسوس کرتا ہے؟ آپ مذاق کا رنگ اور لب و لہجہ نہیں سمجھتے!؟"

گوبند پرشاد:- "کیوں نہیں سمجھتا، لیکن عاشق جو ہوں، ـــــ عاشق کا دل چھوٹا ہوتا ہے وہ محبوب کی باتوں کو بہت محسوس کرتا ہے، ـــــ !"

عاشق اور محبوب کے الفاظ سُن کر دیول دیوی کا جی چاہا۔ کانوں میں پگھلا ہُوا سیسہ ڈال کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بہری ہو جائے۔ اسے گوبند پرشاد سے جتنی نفرت تھی، اس تھوڑی دیر میں وہ کئی گنا زیادہ ہو گئی۔ لیکن وہ شکار کو قابو میں لانا چاہتی تھی۔ کہنے لگی:-

"اور آپ یہ کیوں سمجھتے ہیں کہ میں نے آپ کو امتحان سے مستثنیٰ کر دیا، ـــــ امتحان تو ضرور لوں گی آپ کا ـــــ !"

یہ الفاظ سُن کر رادھا بھی گھبرا گئی۔ کہیں راجکماری اپنی بات سے پھر تو نہیں گئی، اور گوبند پرشاد کا چہرہ تو فورِ دہشت سے سفید پڑ گیا۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے تئیں سنبھال کر کہا:-

"توکیا مہاراج کرن سنگھ نے مجھ سے غلط کہا کہ آپ شادی پر رضامند ہیں ——

رادھا نے شوخی کے ساتھ جواب دیا:۔

"غلط کیوں کہتے، سچ کہا ہے، —— !"

گوبند پرشاد نے سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے دیول دیوی سے دریافت کیا:۔

"میں آپ سے دریافت کر رہا ہوں !"

دیول دیوی نے مسکراتے ہوئے کہا:۔

"کیا آپ رادھا کو جھوٹا سمجھتے ہیں؟ پتاجی کی بات کا اعتبار نہیں کرتے؟"

گوبند پرشاد نے زبردستی مسکرانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا:۔

"نہیں یہ بات تو نہیں، لیکن اگر میرے کانوں میں آپ بھی امرت ٹپکا دیں تو بات ہی اَور ہے !"

دیول دیوی نے سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا:۔

"راجکمار آپ کیسی باتیں کرتے ہیں، بھلا کہیں ایسا ہو سکتا تھا کہ میں انکار کر دیتی، اور پتاجی آپ سے اقرار کر لیتے —— ؟"

گوبند پرشاد خوش ہو گیا، سرمستی کے عالم میں پوچھا:۔

"تو پھر میں یقین کر لوں؟ مان لوں؟ سچ سمجھ لوں؟"

دیول دیوی:۔ "اگر آپ نہ یقین کرنا چاہیں تو میں آپ کو مجبور نہیں کر سکتی، —— !"

اتنا کہہ کر دیول دیوی پھر مسکرانے لگی، اس کے تبسم میں نہ جانے کیا بات تھی، کہ ہر مرتبہ گوبند پرشاد نئے سرے عاشق ہو کر دل ٹٹولنے بیٹھتا تھا۔ اس نے کہا:۔

"راجکماری! تم نے مجھے پھر زندہ کر لیا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے اُمید نہیں تھی، کہ تم مجھے قبول کر لو گی —— !"

دیول دیوی نے تیوری چڑھا کر پُوچھا :۔

"کیوں اُمید نہیں تھی ؟ آخر وجہ ؟ سبب ؟ کیا خامی ہے آپ میں ؟ آپ کانے ہیں ، اندھے ہیں ؟ لُولے ہیں ؟ لنگڑے ہیں ؟ بدصورت ہیں ؟ جاہل ہیں ؟ آخر وہ کون سی بات ہے ، جو دوسروں میں ہے اور آپ میں نہیں ، اور پھر ایک بات اَور بھی تو پیشِ نظر رکھئے ، مَیں نے آپ کے سوا آج تک کسی اور مرد کو دیکھا بھی تو نہیں ہے کہ آپ کو چھوڑ کر اُس پر ریجھ جاؤں ، میرے لئے تو جو کچھ ہیں بس آپ ہی ہیں ! "

اِن باتوں سے گوبند پرشاد بالکل مطمئن ہو گیا ۔ اس نے دیول دیوی کو اپنے اعتماد میں لیتے ہوئے کہا :

"بس اب تو اُس مبارک گھڑی کا انتظار ہے ، جب ہم تم دھرم کی نظر میں بھی ایک ہو جائیں گے ! "

رادھا نے پوچھا :۔

"تو اس مبارک دن کا کب تک انتظار کرنا پڑے گا ؟ یہ بھی تو بتا دیجئے مہربانی کر کے ! "

گوبند پرشاد نے جواب دیا :۔

"آج ہی میرا پیغام بر پتا جی کے پاس راجدھانی جا رہا ہے ۔ وہ جوتشی کے صلاح و مشورہ سے جو شبھ گھڑی اور دن تاریخ مقرر کریں گے ، بس اسی دن شادی ہو جائے گی ! ——— اور راجکماری ! تمہیں ہمارے ساتھ چلنا پڑے گا ! "

دیول دیوی نے آمادگی کے ساتھ جواب دیا :۔

"مجھے تو آپ چاہئیں ، ——— چاہے یہاں رہئے ، چاہے کہیں اَور ، جہاں آپ ، وہاں مَیں ، اب تو سایہ کی طرح آپ کے ساتھ رہنا ہے ۔ یہ کوئی گھڑی دو گھڑی کا ساتھ تو ہے نہیں ، یہ تو ساری زندگی کا ، ایک جینے اور مرنے کا ساتھ ہے ، ——— ! "

گوبند پرشاد : " بے شک ، بے شک ، ——— تم خوش ہو جاؤ گی وہاں جا کر ۔ وہاں کے مناظر

وہاں کی آب وہوا، وہاں کے تالاب، دریا، پہاڑ ہر چیز میں ایک کشش ہے، ایک رعنائی ہے، ایک بانکپن ہے، ایک لطف ہے، وہیں زندگی کا لطف آئے گا۔ وہیں ہم تم عیش اور کامرانی کی زندگی بسر کریں گے!

رادھا۔ "اور راجکمار، میرا فیصلہ بھی تو لگے ہاتھوں کر ڈالیے!"

گوبند پرشاد۔ "تمہارا فیصلہ؟ —— تم کیا چاہتی ہو؟"

رادھا۔ "میں کہاں رہوں گی؟ —— ایک لمحہ کے لئے بھی راجکماری سے جُدا کی جاؤں، یہ مجھے منظور نہیں!"

گوبند پرشاد۔ "تو ہم کب یہ چاہتے ہیں؟ جہاں ہم وہاں تم، —— کیا میں جانتا نہیں، دیول دیوی تمہیں کتنا عزیز اور محبوب رکھتی ہیں؟"

رادھا۔ "بس تو ٹھیک ہے، —— کب جا رہا ہے آپ کا پیغامبر ——؟"

گوبند پرشاد۔ "آج چلا جائے گا، —— میں نے اسے ہدایت کر دی ہے!"

رادھا۔ "اور آئے گا کب تک؟ یہ بھی بتا دیجئے، ذرا!"

گوبند پرشاد۔ "پندرہ بیس دن میں، —— اس سے زیادہ نہیں!"

رادھا۔ "پندرہ بیس دن میں ——؟ یہ تو بہت ہوئے، کہئے ایک ہفتہ میں آجائے!"

گوبند پرشاد۔ "ہاں اتنے دن تو لگ جائیں گے، —— بات یہ ہے کہ راستہ بڑا دشوار گزار ہے، وہاں علاءالدین خلجی خیریت سے تشریف نہیں لا سکتے، اور اگر آجائیں تو خیریت سے واپس نہیں جا سکتے۔ ایسی مزاج پرسی ہوگی ..... !"

رادھا۔ "اوہ ہوگا، —— کیوں اَیسے پاپی کا نام لے کر آپ ہمارا لطف کرکرا کرتے ہیں، اچھا شادی کے فوراً بعد چل دیں گے، ——؟"

گوبند پرشاد۔ "فوراً بعد تو نہیں، ہفتہ دو ہفتہ یہاں رہیں گے، پھر چلیں گے اطمینان سے، ایسی

جلدی کاہے کی پڑی ہے ؟"

رادھا:۔ "ہاں! میں نے تو یونہی ایک بات پوچھ لی تھی۔ دیکھئے راجکمار برات بڑی دھوم دھام سے آنا چاہئے۔ ایسی دھوم سے کہ لوگ یاد کریں ہاں کسی کی شادی ہوئی تھی!"

گوبند پرشاد:۔ "دیکھ لینا ——— (دیول دیوی سے مخاطب ہوکر) اچھا دیول دیوی، تو بتاؤ، یہ رادھا بہت چٹر پٹر بول رہی ہے، کیوں نہ اس کی شادی بھی کردی جائے کسی کے ساتھ، ٹھیک اسی دن جس دن ہماری شادی ہو ؟"

یہ سُن کر رادھا تو گم ہو گئی، اور دیول دیوی بھی گھبرا گئی۔ لیکن وہ تھی زیرک، اپنی پریشانی نہیں ظاہر ہونے دی، کہنے لگی :۔

"نہیں راجکمار، اس کی شادی نہیں ہوسکتی کسی طرح ——— !"

گوبند پرشاد نے پوچھا :۔

"واہ بھئی! یہ کیسی زبردستی ہے ؟ کیوں نہیں شادی ہوگی بیچاری کی ——— ؟"

دیول دیوی نے جواب دیا :۔

"پوچھ لیجئے! میں جھوٹ تو نہیں کہتی، یہ مجھ سے عہد کر چکی ہے کہ زندگی بھر شادی نہیں کرے گی، صرف میری سیوا کرتی رہے گی، ——— کیوں رادھا بولتی کیوں نہیں ——— ؟"

رادھا کو موقع مل گیا، وہ پھول کی طرح کھل اُٹھی، اس نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ کہا :۔

"ہاں راجکمار، اب کہا تو کہا، پھر کبھی میری شادی کا نام نہ لینا۔ ورنہ جانتے ہو پھر کیا ہوگا ؟"

گوبند پرشاد:۔ "نہیں بھئی نہیں جانتا۔ بتاؤ کیا کرو گی پھر ؟"

رادھا:۔ (دیول دیوی کی طرف اشارہ کرکے) "پھر انہیں بہکا دوں گی، یہ ساری خوشی دھری رہ جائے گی آپ کی، یہ میرے ہاتھ میں ہیں، ——— سمجھے ؟"

گوبند پرشاد نے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:۔

"ہاں بھئی! یہ تو مَیں بھول ہی گیا تھا، تم کتنی بڑی طاقت ہو، غلطی ہوئی، معاف کر دو، اب کبھی اگر تمہاری شادی کا نام لوں تو جو چور کی سزا وہ میری!"

دیول دیوی کھلکھلا کر ہنس پڑی:۔

"ڈر گئے، ——— بڑے بزدل ہیں آپ؟ ——— بھلا کوئی رادھا جیسی بے حقیقت ابلا (لڑکی) سے ڈرتا ہے۔ جائیے ہٹئیے۔ ہم نہیں بولتے آپ سے!"

گوبند پرشاد نے رادھا سے کہا:۔

"تمہارے ہاتھ میں ہیں یہ، اور ہم سے خفا ہوئی جا رہی ہیں، اب مناؤ تو جانیں!"

وہ بولی:— "یہ کونسا مشکل کام ہے، ابھی لیجئے ——— کیوں راجکماری تم راجکمار سے خفا ہو جاؤ گی ———؟ اور اگر کہیں مَیں روٹھ گئی تو منائے نہ منوں گی، سوچ لو!"

دیول دیوی نے کہا:۔

"نہیں پگلی، مَیں تو ہنس رہی تھی، بھلا تجھ سے خفا ہو سکتی ہوں کہیں؟"

رادھا۔ "دیکھ لیا راجکمار آپ نے میرا اثر!؟"

گوبند پرشاد۔ "ہاں دیکھ لیا۔ یہ بڑا اچھا نسخہ معلوم ہو گیا، اب جب بھی یہ روٹھیں گی ہمیشہ تمہارے ہی ذریعہ انہیں منایا کریں گے!"

دیول دیوی۔ "جی مُنہ دھو رکھئے، رادھا کی کیا مجال ہے جو میرے اور آپ کے معاملات میں دخل دے سکے۔ ہم جانیں اور آپ، تیسرا کیوں آئے بیچ میں؟"

اپنائیت کی ان باتوں سے گوبند پرشاد کے دل کی عجیب حالت تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا دیول دیوی کو اٹھا کر اپنے دل میں رکھ لے۔ کتنی آسانی سے یہ گوہر بے بہا ہاتھ لگ گیا تھا۔ اگر کہیں بگلا نہ کے

مہاراج کرن سنگھ بھاگ کر رام نگر نہ پہنچے ہوتے تو کہیں شادی ہو سکتی تھی دیول دیوی سے لیکن قسمت مقدر! ــــــــ بھگوان نے میری قسمت میں یہ نعمت لکھ دی تھی، اب اسے کون چھین سکتا ہے؟

رادھا نے گوبند پرشاد کو چپ جو دیکھا تو پوچھا :-

"کیا سوچ رہے ہیں آپ راجکمار؟ اطمینان رکھیے ہماری راجکماری بڑے اچھے مزاج کی ہیں، وہ کبھی آپ سے خفا نہیں ہوں گی، ــــــــ بس ایک بات کا خیال رکھنے گا ذرا، ــــــــ !"

گوبند پرشاد چونک پڑا۔

"کون سی بات؟ ــــــــ ہاں بتا دو بھئی تاکہ ہمیشہ اس کا خیال رکھوں!"

رادھا۔ "بڑی معمولی سی بات ہے، ــــــــ بالکل معمولی!"

گوبند پرشاد۔ "تو بتاؤ بھی تو کسی طرح، ــــــــ کیا بات ہے؟ کس بات کا خیال رکھنا چاہیے مجھے؟"

رادھا۔ "ان کے ساتھ شکار کو نہ جائیے گا کبھی، کیونکہ آپ ان کا ساتھ دے نہیں سکیں گے، پھر یہ ضرور خفا ہو جائیں گی۔ مجھ سے بھی اگر خفا ہوئی ہیں تو بس اسی بات پر۔ لیکن دل کی اتنی اچھی ہیں کہ جہاں ایک دفعہ معافی مانگی اور یہ مسکرائیں۔ غصہ کافور ہو جاتا ہے۔ آپ بھی معافی مانگ لیجیے گا بلکہ ابھی سے پیشگی مانگ لیجیے!"

دیول دیوی ہنس پڑی اور کہنے لگی :-

"بڑی چنچل ہو گئی ہے تو، خواہ مخواہ اتنی دیر سے راجکمار کو پریشان کر رہی ہے !"

پھر اس نے گوبند پرشاد سے کہا :-

"آپ اتنے دن سے آئے ہوئے ہیں، اور کبھی ہمارے ساتھ کھانا بھی نہیں کھایا!"

رادھا۔ "ہاں راجکمار، آج ہمارے ساتھ کھانا کھائیے اور دیکھیے ہماری راجکماری کیسی اچھی اچھی چیزیں پکاتی ہیں، مزہ آ جائے گا ــــــــ !"

گوبند پرشاد۔ "راجکماری اس لئے نہیں ہیں کہ کھانا پکائیں۔ تمہارا تو دماغ چل گیا ہے رادھا!"

دیول دیوی۔ "تو اس میں کیا ہوا، کسی اور کے لئے تو نہیں آپ کے لئے پکاؤں گی۔ یہ میرا فرض ہے اس میں آپ بھی نہیں روک سکتے!"

سرخوشی کے عالم میں گوبند پرشاد نے کہا:۔

"کیا کیا پکا لیتی ہو تم؟ ذرا بتاؤ تو!"

دیول دیوی۔ "جو آپ چاہیں، —— بتائیے کیا کھانا چاہتے ہیں آپ؟"

گوبند پرشاد۔ "مثلاً ماش کی دال؟ لوکی کی ترکاری؟"

رادھا۔ "ماش کی دال تو اس طرح سے پکاتی ہیں ہماری راجکماری کہ بس کچھ نہ پوچھئے —— اور کچھ پوچھ کر دیکھئے!"

گوبند پرشاد۔ "اب پوچھ کر نہیں دیکھتے، چکھ کر، کھا کر دیکھیں گے!"

رادھا۔ "بہت اچھا، —— لیکن کب؟"

گوبند پرشاد۔ "جب راجکماری حکم دیں!"

دیول دیوی۔ "آج ہی شام کو سہی!"

گوبند پرشاد۔ "اس قدر جلد —— ؟ ذرا تیار تو ہو لینے دو، اتنا اچھا کھانا اچھی طرح کھانے کے لئے!"

دیول دیوی۔ (مسکرا کر) "اس قدر جلد کا کیا سوال ہے؟ کیا کھانا پکانے میں دو چار مہینہ کی مدت درکار ہوتی ہے؟ —— ابھی کہئے تو ابھی سہی!"

گوبند پرشاد۔ "نہیں ابھی نہیں، رات ہی کو رکھئے! اس کے بعد اطمینان سے بیٹھ کر باتیں بھی کریں گے!"

دیول دیوی۔ "دیکھئے پھر بھول نہ جائیے گا کہ میں اتنی محنت کروں اور وہ اکارت جائے!"

محبت بھری نظروں سے گوبند پرشاد نے دیول دیوی کو دیکھا اور کہا:۔

"ایسا بھی ہو سکتا ہے کہیں، آؤں گا، ضرور آؤں گا، سر کے بل آؤں گا! لیکن زیادہ تکلیف نہ کرنا، بس ایک آدھ چیز بکانا اپنے ہاتھ سے ——— !"

دیول دیوی۔ "اسے مجھ پر چھوڑیئے ——— بس ٹھیک وقت پر آجایئے گا!"

گوبند پرشاد فخر و مسرت، نشاط و انبساط، جوش و خروش اور کیف و سرور کی ایک دُنیا لے کر اپنے راج محل پہنچا۔ آج وہ خوش تھا۔ زندگی بھر اتنی مسرت اسے کبھی نہیں ہوئی تھی جتنی آج دیول دیوی کی باتوں سے، اس کے التفات سے، اس کی لگاوٹ سے ہوئی، اب وہ دل ہی دل میں افسوس کر رہا تھا کہ جب یہ بات تھی اور دیول دیوی خود ہی اس سے شادی کرنے پر تلی ہوئی تھی، تو اس نے کرن سنگھ کو دھمکی کیوں دی؛ اس کا دل کیوں بگاڑا؛ کیوں براہ راست سب سے پہلے دیول دیوی اور رادھا سے اس سلسلہ میں بات چیت نہ کرلی؛ یہ سوچ کر وہ سیدھا کرن سنگھ کی طرف چلا کہ اس کے پاس جائے اور اپنی میٹھی میٹھی باتوں سے اس اثر کو کم کر دے، جو دھمکی سے اس کے دل میں پیدا ہو گیا ہوگا:

اتفاق کی بات کرن سنگھ راستہ ہی میں مل گیا۔ اس نے گوبند پرشاد کو دیول دیوی کے کمرہ سے نکلتا دیکھ لیا تھا، اور دل ہی دل میں ڈر رہا تھا، کہیں وہاں اس کے جانے کے بعد کھیل بگڑ تو نہیں گیا۔ دیول دیوی کی خفگی اور برہمی؛ نامہ تو نہیں ہو گئی۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ کچھ پوچھے۔ گوبند پرشاد نے پوچھا:۔

"پتا جی! میں بڑی دیر سے آپ کو ڈھونڈ رہا ہوں —— !"

کرن سنگھ اس تخاطب سے خوش ہو گیا، اور گوبند پرشاد نے سمجھ لیا، کہ اسے پتا جی کہنے کے بعد خود بخود تلافی ہو گئی ——— نہ کرن سنگھ نے جھوٹ پر ٹوکا، نہ گوبند پرشاد نے جھوٹ کا سلسلہ جاری رکھا ——— شاید یہ دونوں ایک دوسرے کو سمجھ رہے تھے ——— !

قتلغ خواجہ!

تاتاریوں یا دوسرے الفاظ میں مغلوں نے اب مستقل اقامت ماوراء النہر، خراسان اور افغانستان میں اختیار کرلی تھی۔ مشرقِ وسطیٰ کا کم و بیش سارا علاقہ ان کے تصرف میں تھا، جہاں ان کی یکتائی کا پرچم لہرا رہا تھا۔ ہندوستان میں اگرچہ وہ کبھی کبھی آچکے تھے لیکن سندھ، بلوچستان اور لاہور کی سرحد سے آگے قدم بڑھانے کی جرأت نہیں پڑی تھی۔ شمالی ہند کا علاقہ اب تک ان کی تاخت و تاراج سے یکسر محفوظ تھا، اور یہی علاقہ ہندوستان کی جان تھا۔ یہاں کی سرسبزی اور شادابی یہاں کی زرخیزی، یہاں کے مناظر، یہاں کے جنگل، پہاڑ، دریا، شہر، عمارات ہر چیز کو وہ للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے تھے، اور جب تک وہ دلی کو فتح نہ کرلیں، ہندوستان کا دل ان کے قبضہ میں نہیں آسکتا تھا۔ وہ بار بار اس سرزمین کو فتح کرنے کا منصوبہ باندھتے تھے، وہ بار بار اس سرزمین پر اپنا لشکرِ گراں[۱] لے کر چڑھ آتے تھے لیکن عروسِ کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو پاتے تھے۔ کوئی نہ کوئی ایسی بات رونما ہو جاتی تھی کہ اُن کا منصوبہ ناکام ہو جاتا تھا، اور وہ بے نیل و مرام واپس چلے جاتے تھے۔ طرغی خاں سوا لاکھ آدمیوں کو لے کر بڑے زور شور سے بڑھا تھا، اس نے دلی کا محاصرہ بھی کرلیا تھا

---

[۱] ملاحظہ ہو تاریخ فرشتہ ـــــ فرشتہ نے مغلوں کی متعدد یلغاروں کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے۔

لیکن ظاہری امکانِ فتح کے باوجود خود بخود ان کے پاؤں اُکھڑ گئے، اور بھاگ کھڑے ہوئے۔ گویا اپنے ہاتھوں جیتی بازی ہار گئے۔

لیکن قتلغ خواجہ، طرغی خاں نہیں تھا۔ یہ خراسان کا اور نہ صرف خراسان کا بلکہ ماوراء النہر تک کا ایسا فرمانروا تھا جس کے نام سے لوگ کانپتے تھے، جس کے جاہ و جلال کا ڈنکا بج رہا تھا۔ جس کی ہیبت اور سطوت سے سلاطینِ عالم لرزتے تھے، جس کی قوت و طاقت اور فوجِ ظفر موج کے سامنے پہاڑ اور دریا سرنگوں اور سجدہ ریز تھے، جس کے پاس کارآزمودہ اور سرد و گرم چشیدہ سپاہیوں کی فوج نہیں، سمندر تھا۔ اور یہ سمندر جس طرف کا رُخ کرتا تھا، تباہی، بربادی اور ہلاکت پھیلاتا ہوا بڑھتا چلا جاتا تھا۔ کسی کی مجال تھی کہ اسے روک سکے؛ کسی میں ہمت تھی کہ اسے ٹوک سکے؛ کسی کو یارا تھا کہ اس کے سامنے ٹھہر سکے؟

اسی قتلغ خواجہ کی داستانِ عروج و اقبال بھی بڑی دلچسپ ہے۔ پہلے یہ ایک سپاہی تھا، پھر ترقی کرتے کرتے ایران کے مغل بادشاہ غازان محمود[1] کا سپہ سالار بن گیا۔ اس شان سے سپہ سالاری کی کہ اس کے نام کا جھنڈا گڑ گیا، نہ خطرہ سے مُڑتا تھا، نہ موت سے، بہادری میں یکتا، دلیری میں لاجواب، تہوّر اور شجاعت میں بے مثل، قسمت مساعد تھی، حالات سازگار تھے، دست و بازو کی قوت اور ذہن و دماغ کی رسائی نے بہت سے معین و مددگار و جاں نثار پیدا کر دیئے۔ اب ایک بادشاہ کی سپہ سالاری اسے گراں گزرنے لگی، جو شخص خود تاجِ شہریاری سر پر رکھ سکتا تھا، وہ کسی دوسرے شہریار کی اطاعت کیوں کرے؛ اور بالآخر دیکھنے والوں نے ایک دن دیکھ لیا کہ قتلغ خواجہ ایران کے ایک مغل بادشاہ کا سپہ سالار نہیں بلکہ خراسان سے لے کر ماوراء النہر تک کا فرمانروا ہے۔ بادشاہ مطلق العنان ہے، آمرِ مطلق ہے، جو چاہتا ہے وہ ہوتا ہے، جو کہہ دیتا ہے اسے ہونا پڑتا ہے۔ عناصر اس کے تابع تھے،

---

[1] یہ بادشاہ ۶۹۵ھ سے ۷۰۴ھ تک حکمرانی کرتا رہا۔

قدرت اس کی سرپرست تھی۔ حالات اس کے ہواخواہ اور ہمدرد تھے ــــ!

کئی مرتبہ تغلق خواجہ کے دل میں لہرآئی کہ ہندوستان کو فتح کرلے، شہنشاہی کا جو پرچم خراسان اور ماوراءالنہر پر لہراتا ہے، وہ دتی پر بھی کیوں نہ لہرائے؛ کئی مرتبہ اس نے فوج مرتب کی، اور چڑھائی کا پروگرام بنالیا۔ کئی مرتبہ اس کے پاس کرن سنگھ کی سفارتیں پہنچیں اور انہوں نے اسے اُکسایا، کہ وہ اس سونے کی چڑیا کو اپنے قبضہ میں کرلے۔ کئی مرتبہ وہ آمادہ ہوا اور تیاریاں شروع ہوگئیں لیکن ہر مرتبہ کوئی نہ کوئی ایسا مانع پیش آگیا کہ اسکیم ملتوی کردینا پڑی، پروگرام منسوخ کردینا پڑا، اور تاخت و تاراج کا عزم کسی دوسرے موقع پر اٹھا رکھنا پڑا۔

لیکن طرغی خاں کے فرار نے تغلق خواجہ کو غم و غصہ سے بھردیا۔ وہ طرغی خاں کے فرار کو اپنی شکست سمجھ رہا تھا، ایک مغل سرداریوں ہراساں ہوکر بھاگ کھڑا ہو، یہ اس سردار کی نہیں، ساری مغل قوم کی، سارے تاتاریوں کی توہین تھی، اور اس توہین کو برداشت کرنے کے لئے تغلق خواجہ کسی طرح تیار نہ تھا، جب سے اس نے طرغی خاں کے فرار کی داستان سنی تھی پیچ و تاب کھارہا تھا، غصہ سے لال ہورہا تھا۔ لیکن طرغی خاں کی اس حرکت نے اسے چوکنا اور محتاط بھی کردیا تھا، اب وہ سلطان ہند علاءالدین خلجی کو ایک لقمۂ تر نہیں سمجھ رہا تھا۔ اب اس کا خیال تھا یہ لوہے کا چنا ہے، جسے چبانے کے لئے دانت اگر مضبوط نہ ہوں، تو وہ ٹوٹ بھی سکتے ہیں۔ وہ چاہتا تھا دتی پر اس شان و شکوہ اور جاہ و جلال کے ساتھ حملہ آور ہو کہ علاءالدین صرف اس کی فوج گراں دیکھ کر لڑائی سے دستبردار ہوجائے، رومال سے دونوں ہاتھ باندھے اور عفو و جاں بخشی کی استدعا لے کر حاضر ہو، اور اگر اس میں ذرا بھی تامل کرے، تو اس کی فوج دتی کی اینٹ سے اینٹ بجادے، وہاں کے باشندوں کا اس طرح قتل عام کرے کہ وہ بلبلا اُٹھیں، اور پھر وہاں مغل پرچم لہرانے لگے ــــ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے!

فوجی تیاریاں خراسان میں زور شور سے ہورہی تھیں۔ سب جانتے تھے یہ فوج گراں دتی پر

حملہ کرنے کے لئے تیار ہو رہی ہے۔ لیکن سب کو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ آخر یہ تیاریاں کب ختم ہوں گی؟ بارہا قتلغ خواجہ نے دوسرے ملکوں اور راجدھانیوں پر حملہ کیا تھا۔ لیکن جب ارادہ کیا، فوج لے کر نکل کھڑا ہوا، اور اس وقت تک چین سے نہ بیٹھا جب تک کامرانی نہ حاصل کر لی۔ لیکن یہ کیسی مہم ہے جس کی تیاریاں اتنے دن سے ہو رہی ہیں۔ لیکن ختم نہیں ہو پاتیں۔ سلاحِ جنگ میں برابر اضافہ ہو رہا ہے، سپاہیوں کی بھرتی برابر جاری ہے، خزانہ کا روپیہ ان کاموں پر بے دریغ صرف ہو رہا ہے، اور پھر بھی یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کوچ کب ہوگا؟ ——— کیا دلّی کا فتح کرنا اتنا مشکل ہے ——— نفسیاتی طور پر اس نہ ختم ہونے والی تیاری نے ایک جھرجھری سی پیدا کر دی تھی، مغل سپاہیوں میں پہلی مرتبہ انہیں غیر معلوم طور پر یہ احساس ہونے لگا تھا کہ معاملہ خطرناک ہے، اور اس میں نقصان و زیاں کا امکان بھی ہے۔ اب تک اُنہوں نے کبھی اس پہلو پر غور نہیں کیا تھا ——— !

اور عین اس وقت جب قتلغ خواجہ کی تیاریاں اوجِ کمال پر پہنچ چکی تھیں، تین لاکھ[1] سے زیادہ فوج مرتب ہو چکی تھی۔ ہر طرح کا ساز و سامانِ جنگ مہیا ہو چکا تھا۔ رام نگر سے کرن سنگھ کا ایک سفیر پھر اس کے حضور میں حاضر ہوا، اور اس سے کہا کہ ہمارے مہاراج آپ کو دلّی پر حملہ کرنے کی دعوت دیتے ہیں ——— !

سفیر کی باتیں سُن کر قتلغ خواجہ مسکرایا، اور اس نے حقارت کے ساتھ کہا :-

"تمہارا مہاراجہ صرف ہم کو دعوت کیوں دیتا ہے؟ خود دلّی پر چڑھائی کیوں نہیں کرتا؟ ہماری فوجوں کو یہاں سے وہاں تک جانے میں جو دشواریاں پیش آئیں گی، مہاراج کرن سنگھ کی فوجوں کو اتنی ہی آسانیاں حاصل ہیں، ——— تمہارا مہاراج خود خلجی سے ڈرتا ہے، اور ہمیں اس سے بھڑا

[1] تاریخ فرشتہ ملاحظہ ہو!

دینا چاہتا ہے؛ ——— کیا دوستی اسی طرح کی جاتی ہے؟ کیا انہی کارناموں پر ہم اسے اپنا دوست اور ہوا خواہ مان لیں؟ ———"

سفیر نے ڈرتے ڈرتے بڑی مدھم اور دل گرفتہ آواز میں کہا:۔

"ہمارے مہاراج بھی زور شور سے جنگی تیاریاں کر رہے ہیں، وہ جیسے ہی سنیں گے کہ آپ نے دلی کا محاصرہ کر لیا ہے، فوراً اپنی فوج لے کر آپ کی مدد کو پہنچ جائیں گے!"

یہ سن کر قتلغ خواجہ کے چہرے پر برہمی اور نفرت کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اس نے گرجدار آواز میں کہا:۔

"تمہارا مہاراجہ یا خود بیوقوف ہے یا ہمیں بیوقوف بنانے کی کوشش کر رہا ہے ——— وہ ہماری مدد کرے گا؟ ہماری مدد کو فوج لے کر دلی پر چڑھ آئے گا؟ ——— کیوں یہی کہہ رہے تھے نا تم؟"

سفیر نے بڑی آمادگی، مستعدی اور سعادت مندی کے ساتھ جواب دیا:۔

"جی سرکار! یہی بات ہے۔ ہمارا مہاراجہ کیل کانٹے سے لیس ہو چکا ہے۔ بس صرف اس خبر کے پہنچنے کی دیر ہے کہ آپ روانہ ہو رہے ہیں!"

قتلغ خواجہ اپنا غصہ ضبط نہ کر سکا۔ اس نے آدابِ سفارت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے سفیر کو ڈانٹا اور کہا:۔

"خاموش، ——— کیا خلجی تمہارے مہاراج کی سرکوبی نہیں کر چکا ہے؟ کیا تمہارا مہاراجہ بھاگ کر ایک دوسرے مہاراجہ کے دیس میں پناہ گزین نہیں ہوا ہے؟ کیا اس کے پاس اب بھی فوج ہے؟ سپاہ ہے؟ خزانہ ہے؟ وہ کس برتے پر ہماری مدد کرے گا؟ کیا اپنے دوست سے قرض کے طور پر فوج حاصل کر کے ہماری مدد کو آئے گا؟ ——— اس سے کہہ دو ہم جو کچھ کرتے ہیں اپنے بل بوتے پر کرتے ہیں، ہمیں کسی قسم کی امداد یا رفاقت کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ بنگالہ میں ہوتا جب بھی کچھ نہیں کر سکتا تھا، اب ام نگر میں بیٹھ کر تو کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ اس سے یہ بھی کہہ دو ہم دلی پر حملہ ضرور کریں گے۔

لیکن اس لئے نہیں کہ اس نے ہمیں اُکسایا ہے، اس لئے کہ ہم اپنے وقار کے لئے اسے ضروری سمجھتے ہیں اور ہاں اس سے یہ بھی کہہ دینا کہ ہم خراسان میں بیٹھ کر جب بگلادہ اور رام نگر کی خبر رکھتے ہیں، تو دِلّی اور خلجی کے حالات سے بھی بے خبر نہیں ہیں، اور اس بیوقوف کو یہ بھی بتا دینا کہ اس کا سفیر جتنے دنوں میں رام نگر سے خراسان آتا ہے، اس سے نصف مدّت میں ہمارے جاسوس سارے بھارت کو کھنگال کر حالات معلوم کرکے دشمن کی تمام سرگرمیوں، کارروائیوں اور حرکتوں کا جائزہ لے کر ہمارے پاس پہنچ جاتے ہیں، ——— !"

کرن سنگھ کا سفیر گم صم یہ باتیں سُن رہا تھا، اور بیدِ لرزاں کی طرح کانپ رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں ڈر رہا تھا کہیں یہ منچلا بادشاہ یہیں دربار میں اس کی گردن اُڑوانے کا حکم نہ صادر کردے وہ جلد از جلد قتلغ خواجہ کے سامنے سے ہٹ جانا چاہتا تھا۔ وہ دل میں مصمم ارادہ کرچکا تھا کہ دربار سے واپس جاتے ہی وہ خراسان سے رختِ سفر باندھے گا، اور سیدھا رام نگر جاکر دم لے گا! ——— وہ یہی سوچ رہا تھا کہ قتلغ خواجہ کی آواز اس کے کانوں میں گونجی :۔

"تم جاسکتے ہو، ——— دربار ہی سے نہیں، خراسان سے بھی، اور اب کبھی ہمارے پاس آنے کی ہمت نہ کرنا، ورنہ ضرور تمہیں قتل کی سزا ملے گی، ——— بس اب ہم کچھ نہیں سُننا چاہتے!"

سفیر سجدہ میں گر پڑا، پھر اُلٹے پاؤں دربار سے باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد قتلغ خواجہ نے دربار برخاست کیا، اور اپنے چیدہ چیدہ افسروں کو اپنے ساتھ لیتا گیا۔ ایوانِ شاہی میں پہنچ کر اس نے مجلسِ مشاورت منعقد کی اور اپنے سپہ سالار سے دریافت کیا :۔

"ہماری فوج کی تعداد اب کہاں تک پہنچ چکی ہے ؟!"

سپہ سالار نے دست بستہ عرض کیا :۔

"سلطانِ والا جاہ، ہماری فوج تین لاکھ سے متجاوز ہو چکی ہے، اس میں پیدل بھی ہیں اور سوار بھی!

یہ سُن کر قتلغ خواجہ کا چہرہ خوشی سے چمک اُٹھا، اس نے مطمئن انداز میں کہا :۔

" اتنی تعداد بہت کافی ہے، کیونکہ ہمیں قابلِ اعتبار ذریعہ سے اطلاع مل چکی ہے کہ خلجی کی فوج ایک لاکھ بھی نہیں ہے، ———— اور پھر وہ داخلی دشواریوں اور پریشانیوں میں بھی مبتلا ہے، وہاں وہ امن نہیں جو خراسان میں ہے۔ ہم جتنے اطمینان اور یک سوئی کے ساتھ لڑ سکتے ہیں، وُہ نہیں لڑ سکتا ———— !"

سپہ سالار نے دست بستہ عرض کیا :۔

" اور سلطانِ ذی شان اس امر کو بھی ملحوظِ خاطر رکھیں کہ اگر خلجی نے ڈٹ کر مقابلہ بھی کیا تو ہمیں کیا پروا ہو سکتی ہے ؟ اس کے سپاہیوں میں وہ بانکپن کہاں سے آئے گا جو ہمارے سپاہیوں میں ہے، اس کی تلواریں وہ کاٹ کہاں سے لائیں گی، جس نے ہماری تلواروں کو شہرۂ آفاق بنا دیا ہے، خود اس میں وہ حوصلہ کہاں سے پیدا ہوگا، جو ہمارے بادشاہ والاجاہ کے اندر موجزن ہے !"

قتلغ خواجہ نے سپہ سالار کی ان باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ لیکن چہرے کی چمک اور ہونٹوں کے تبسّم سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اپنے سپہ سالار سے پورے طور پر متفق ہے، اور اس کی ان باتوں سے بہت خوش ہو رہا ہے۔ سپہ سالار نے بھی یہ کیفیت محسوس کر لی، اس نے اور زیادہ جوش و خروش کے ساتھ کہا :۔

" اور جہاں پناہ ہمیں ایک اور بھی سہولت حاصل ہے !"

قتلغ خواجہ نے بدستور مسکراتے ہوئے پوچھا :۔

" کون سی سہولت ؟ کیا کوئی خاص بات تمہارے پیشِ نظر ہے ———— ؟"

سپہ سالار نے عرض کیا :۔

" جہاں پناہ، وہ بات یہ ہے کہ جب جنگ شروع ہوگی، تو وہاں ایسے بہت سے راجہ

مہاراجہ ہیں جو اگرچہ اس کی اطاعت قبول کر چکے ہیں، اسے خراج دیتے ہیں، اور اس کی حکومت کو تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن دل سے نفرت کرتے ہیں۔ موقع کے منتظر ہیں کہ ذرا بھی حالات سازگار ہوں، تو پھر اپنی خود مختاری اور بادشاہت کا اعلان کر دیں۔ وہ ہمارے لئے نہیں! اپنی سلامتی اور تحفظ کے لئے ہمارا ساتھ دیں گے!"

فیصلہ کن انداز میں قتلغ خواجہ نے کہا:۔

"ہاں ایسا ہو سکتا ہے لیکن ان کے اور خلجی کے انجام میں کوئی فرق تو نہیں ہوگا؛ —— ہم یہ گوارا نہیں کر سکتے کہ ہمارے حدودِ مملکت میں کوئی اور بھی بادشاہ ہو، کوئی اور راجہ یا مہاراجہ بھی ہو، خواہ وہ ہمارا کتنا ہی دوست ہو، خواہ اس نے ہماری کتنی ہی مدد کی ہو، ہم اپنے اصول سے منحرف نہیں ہو سکتے ——!"

سپہ سالار نے بغیر کسی ادنیٰ تامل کے برجستہ عرض کیا:۔

"بے شک، بے شک، —— یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم اپنا اصول بدل دیں لیکن جہاں پناہ! ہمارا اصول یہ بھی تو ہے کہ ہم دشمن سے جب اور جتنا فائدہ اُٹھا سکتے ہیں اُٹھائیں!"

قتلغ خواجہ:۔ "شاید تمہارا اشارہ کرن سنگھ کی طرف ہے؟ —— وہ فریب کار اور فریب خوردہ ہے، اس پر ذرا بھی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا!"

سپہ سالار:۔ "بے شک، جہاں پناہ کا ارشاد بالکل صحیح ہے، لیکن صرف ایک کرن سنگھ نہیں بھارت میں بہت سے کرن سنگھ ہیں جو ہماری مدد کریں گے، اور پھر ہمارے ہاتھوں سے قتل ہوں گے! —— اور ہم ان کے راج پر اسی طرح قبضہ کر لیں گے جس طرح خلجی کے راج پر کریں گے!"

قتلغ خواجہ:۔ "میں چاہتا ہوں اس مرتبہ ہندوستان کا فیصلہ کر کے آؤں!"

سپہ سالار۔ بے شک جہاں پناہ، ــــــ ایسا ہی ہوگا!"

قتلغ خواجہ۔ "میرا مطلب یہ ہے کہ ہندوستان تمام و کمال ہمارے قبضہ میں آجائے، ــــــ میں صرف دلّی فتح کرنا نہیں چاہتا۔ ہندوستان کی ہر ریاست پر حکومت، ہر حصۂ زمین پر قبضہ کرنا اور اسے اپنے تصرّف میں لانا مقصود ہے، خواہ وہ شمالی ہند ہو یا جنوبی ہو۔ خواہ اس کا تعلق مشرق سے ہو یا مغرب سے!"

سپہ سالار۔ "بلاشبہ یہی ہوگا، اور یہی ہونا چاہئے!"

قتلغ خواجہ۔ "فوج کی کثرت، سامانِ جنگ کی افراط اور سلاح جنگ کی فراوانی پر میں جو اتنی توجہ کر رہا ہوں، اس کا راز صرف یہی ہے، ــــــ بجائے اس کے کہ ہم بار بار ہمیں لے کر بھارت پر چڑھائی کریں، کیوں نہ ایک مرتبہ اسے فتح کر کے ہمیشہ کے لئے اپنے ممالکِ محروسہ میں شامل کر لیں؟"

سپہ سالار۔ "بہت بجا اور درست فرمایا شاہِ ذی جاہ نے ــــــ لیکن میرا خیال ہے ہمیں زیادہ مشقّت نہیں کرنی پڑے گی!"

قتلغ خواجہ۔ "کیوں؟ ــــــ یہ خیال تمہارے دل میں کیسے آیا؟"

سپہ سالار۔ "غلام کا خیال ہے کہ خلجی کی شکست سارے بھارت کی شکست ہے۔ پھر ہمارے مقابلہ میں کوئی سر نہیں اٹھا سکے گا۔ کسی میں ہمت نہ ہوگی کہ سرکشی یا خود مختاری کا نام لے!"

قتلغ خواجہ۔ "یہی تو ہم معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ یہ رائے تم نے کیوں اور کس بنیاد پر قائم کی ہے؟"

سپہ سالار۔ (مسکرا کر) "جو کام ہمیں بھارت کے چپہ چپہ پر کرنا پڑتا یعنی جنگ و پیکار، وہ ہم سے پہلے خلجی کر چکا ہے، لہٰذا ہمیں تو اپنا سارا زور خلجی پر لگا دینا ہے، اس کے بعد میدان صاف ہے!"

قتلغ غور سے اپنے سپہ سالار کی باتیں سنتا رہا۔ پھر اس نے کہا:۔

"ہمیں تمہاری رائے سے اتفاق ہے۔ لیکن ہر ہنگامی حالت کا مقابلہ کرنے کے لئے ہمیں تیار تو رہنا چاہیئے!"

سپہ سالار:۔ "بے شک جہاں پناہ! ——— اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے؛ اگر ہر ہنگامی حالت کا مقابلہ کرنے کے لئے ہم نے اپنے آپ کو تیار نہیں رکھا، تو اس سے بڑھ کر کیا کوئی بے تدبیری ہو سکتی ہے؛ ——— لیکن خلجی کے بارے میں اس غلام نے اس لئے عرض کیا تھا کہ یہ بات بھی ہمارے پیشِ نظر رہنی چاہئے کہ اصل مہرہ کون ہے؛ اور وہ خلجی کے سوا کوئی نہیں!"

قتلغ خواجہ۔ (کچھ سوچتے ہوئے) "ایک سوال اور بھی قابلِ غور ہے، ——— نہ جانے تم نے اس پہلو پر بھی غور کیا ہے یا نہیں ———؟"

سپہ سالار:۔ "ارشاد، ——— ارشاد، غلام جہاں پناہ کے ہر سوال کا کافی اور شافی جواب دینے کی کوشش کرے گا!"

قتلغ خواجہ:۔ "ان مسلمانوں میں ایکا بہت ہوتا ہے، یک جہتی بہت ہے!"

سپہ سالار:۔ "بے شک ہوتا ہے جہاں پناہ!"

قتلغ خواجہ:۔ "اور ان میں ایک دوسرے کی مدد کرنے، ایک دوسرے کا ساتھ دینے، ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہونے کا جذبہ بھی ہوتا ہے!"

سپہ سالار:۔ "یہ بات بھی جہاں پناہ نے بالکل صحیح ارشاد فرمائی۔ یہ جذبہ ہوتا ہے مسلمانوں میں، ——— سچ پوچھئے تو اس جذبہ کی وجہ سے یہ قوم ابھی تک زندہ ہے، ورنہ ہمارے آبا و اجداد کے مقابلہ میں ٹھہر سکتی تھی؛ چنگیز کی ہلاکت سامانیوں اور قتلِ عام کے بعد زندہ رہ سکتی تھی؛ صرف یہی جذبہ تھا جس نے اسے مٹنے سے بچا لیا، زندہ رکھا، ———!"

قتلغ خواجہ ۔ " ہاں، تو کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ جب ہم دلی پر حملہ کریں، تو خلجی دوسرے مسلم ملوک و سلاطین سے استمداد کرے، اور وہ اس کی مدد کو چڑھ دوڑیں ——— ؟"

سپہ سالار ۔ (غور و تأمّل کے بعد) " جہاں پناہ، اس خطرہ کو نظرانداز تو نہ کرنا چاہیئے ۔ لیکن غلام اسے کچھ زیادہ اہمیت نہیں دیتا ——— یہ صرف خیال ہی خیال ہے !"

قتلغ خواجہ ۔ " تعجب ہے تم اتنے اہم خطرہ کو کوئی اہمیت نہیں دیتے ——— آخر کس لئے ؟"

سپہ سالار ۔ " مسلمانوں میں لاکھ ایکا ہو، ——— لاکھ وہ ایک دوسرے کے معین و ہمدرد ہوں، لاکھ وہ ایک دوسرے کے دُکھ درد میں شریک ہوں، لیکن کیا ہماری تلوار کے سامنے ٹھہر سکنے کی ہمت ہے ان میں ——— ؟"

قتلغ خواجہ ۔ " نہ ہو ——— یہ دوسری بات ہے لیکن ہمیں اپنی طرف سے تیار تو رہنا چاہیئے یہ تو بڑی بیوقوفی ہوگی کہ ایک خطرہ کو ہم صرف اس لئے نظرانداز کر دیں کہ بظاہر وہ ناممکن نظر آتا ہے، کم از کم مَیں تو اس رائے کی تائید نہیں کر سکتا ۔ مَیں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کیا ہمارے پاس اتنی سپاہ، اتنے سلاح، اتنا خزانہ اور اتنا ذخیرہ ہے کہ ایسی صُورت میں بھی کامیابی کے ساتھ ہم جنگ کو جاری رکھ سکیں ۔ اگر ایسا ہُوا تو ہم دشمن سے یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ ہم نے تم سے مقابلہ کی تیاریاں نہیں کی تھیں، لہٰذا اب جاتے ہیں، پھر کسی موقع پر ملاقات ہوگی ؟ ——— کیا تم نے مجھے طرغی خاں سمجھ رکھا ہے ؟ مَیں اس کی طرح احمق اور نادان نہیں ہوں، مَیں خراسان سے صرف اس وقت قدم باہر نکالنا چاہتا ہوں جب میرا دل مطمئن ہو جائے کہ ہاں ہم ہر حملہ اور ہر خطرہ کا آسانی سے مقابلہ کر سکتے ہیں ——— !"

سپہ سالار ۔ " جہاں پناہ! تین لاکھ فوج، سارا عالمِ اسلام مل کر بھی ہمارے مقابلہ میں مہیا نہیں کر سکتا ۔ یہ تین لاکھ دس لاکھ لشکر پر بھاری ہیں ۔ ہمارے پاس رسد کا اتنا اچھا ذخیرہ ہے کہ دس برس

تک بھی اگر جنگ ہو تو کال نہیں پڑ سکتا، اور اسی پر دوسری چیزوں کا قیاس کر لیجئے۔ دلی کی حالت یہ ہے کہ وہاں گیہوں بھی ہمارے مقابلہ میں گراں ہے، اور دوسری ضروریاتِ زندگی بھی۔ پھر جنگ شروع ہونے کے بعد قدرتاً بھاؤ اور چڑھے گا، گرانی اور بڑھے گی۔ ہم صرف جنگ کو طول دے کر خلجی اور اُس کے معاونوں کو ذلت بخش شکست دے سکتے ہیں، ——— اور یہ تو میں نے صرف ایک بات کہی، بغیر جنگ کو طول دیئے بھی ہم ضرور کامیاب ہوں گے ——— !"

سپہ سالار کی ان باتوں سے قتلغ خواجہ مطمئن ہو گیا۔ اس نے شفقت بھری نظروں سے اپنے سپہ سالار کو دیکھا اور کہا: "تو پھر کب کوچ کر دینا چاہئے ہمیں دلی کی طرف ——— ؟"

سپہ سالار: "جلد از جلد، ——— بیکاری سے ہماری فوج میں بددلی پیدا ہو جائے گی !"

قتلغ خواجہ: "ہاں ٹھیک کہتے ہو، لیکن تم نے اپنے جاسوسوں سے یہ اچھی طرح معلوم کر لیا ہے، کہ خلجی ہماری طرف سے بالکل مطمئن ہے ——— ؟"

سپہ سالار: "ابھی کل ہمارے معتمد جاسوسوں کا جو گروہ خاص دلی سے آیا ہے، اس کی اطلاع یہ ہے کہ دلی کے بے فکرے اور منچلے لوگ عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں، اور خلجی حدودِ ہندوستان کے اندر توسیعِ مملکت کی فکر میں ہے۔ اس کی فوجوں کا کافی حصہ اِدھر اُدھر منتشر ہے، ——— یہ ایک اور سہولت ہمیں خداداد طور پر حاصل ہے !"

قتلغ خواجہ: "ہاں، ——— بشرطیکہ اچانک اس کے سر پر جا پڑیں !"

سپہ سالار: "ضرور ایسا ہی ہوگا جہاں پناہ: ——— اسی طرح تو لڑائی کا لطف ہے، دشمن کو خبردار کر کے مارنے میں وہ لطف نہیں جو اچانک اس پر جا پڑنے میں آتا ہے !"

قتلغ خواجہ مسکرانے لگا۔ پھر اس نے کہا، ——— "اس مہم کے سپہ سالار ہم ہوں گے ——— !"

ایثار ——!

کنول دیوی سے علاءالدین خلجی کی شادی ہو چکی تھی۔ وہ اگرچہ کنول دیوی کی شائستگی نیکی، خوبی اور وفاداری سے بہت متأثر اور مسرور تھا، لیکن امورِ سلطنت اور معاملاتِ مملکت میں شراب سے تائب ہونے اور حضرت سلطان المشائخؒ سے تائب رہنے کا عہد کر چکنے کے بعد اتنا مصروف و منہمک رہتا تھا کہ محل میں آنے، کنول دیوی اور دوسری بیگمات سے بات چیت کرنے کا بہت کم وقت ملتا تھا۔

ایک مرتبہ وہ رات گئے اپنے شبستان میں پہنچا۔ محل کا یہ حصّہ کنول دیوی کے لئے وقف تھا۔ بالعموم ایسا ہوتا تھا کہ جب وہ کاروبارِ سلطنت سے فارغ ہو کر سونے کے لئے آرام کدے میں پہنچتا تھا، تو تھک کر چُور ہو چکا ہوتا تھا۔ اس لئے رانی سے بات چیت کرنے کا موقع بالکل نہیں ملتا تھا۔ یا اگر بات چیت کا موقع نکلا بھی تو بے حد مختصر۔ رانی ہمیشہ تبسّم کناں اس کی پیشوائی کرتی تھی اور جب تک وہ سو نہیں جاتا تھا، اس کے حضور میں حاضر رہتی تھی۔ آج بھی ایسا ہی ہوا لیکن علاءالدین خلجی نے محسوس کیا، اگرچہ رانی مسکرا رہی ہے، لیکن اس کے تبسّم میں سوگواری پنہاں ہے، اگرچہ اس کی آنکھوں میں محبت کی چمک ہے، لیکن یہ آنکھیں رو چکی ہیں اور پپوٹے سوجے ہوئے ہیں۔

اگرچہ وہ خوش اخلاقی کا مظاہرہ کر رہی ہے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے دل کسی صدمہ سے غمگین ہو۔ کوئی بہت بڑی فکر اور پریشانی لاحق ہو۔ گو وہ تھکا ہُوا تھا، نیند سے آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں لیکن رانی کی یہ کیفیت نہ برداشت کر سکا۔ وہ بیٹھ گیا اور اُس نے محبت بھرے لہجہ میں کہا:۔

علاءالدین خلجی:۔ "ہر روز میں تمہیں مسرور اور خوش دیکھتا تھا۔ آج تمہارے تابناک چہرے پر غم کی گھٹائیں نظر آ رہی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے چاند بادلوں کی اوٹ میں چھپ گیا ہو۔ تمہارے پپوٹے سوجے ہوئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے بہت رو چکی ہو۔ ——— آخر کیوں؟"

کنول دیوی:۔ (ایک ٹھنڈی سانس لے کر) "نہیں جہاں پناہ! آپ کے زیرِ سایہ رہ کر بھی اگر میں غمگین اور اُداس رہوں تو مجھ سے بڑھ کر ناشکرا کون ہو سکتا ہے؟ ——— آپ نے مجھے نئی زندگی دی ہے، جب اپنے گھر میں میرے لئے جگہ نہ رہی، آپ نے اپنے محل کے پھاٹک میرے لئے کھول دیئے۔ جس دل پر میں حکومت کرتی تھی، وہ مجھ سے بیزار ہو گیا۔ ابھی کل ہی میری ایک باندی سنجوگتا رام نگر سے بھاگ کر میرے پاس آئی ہے۔ میری تلاش کرتی ہوئی وہ کہہ رہی تھی راجہ کرن سنگھ اب اس کے روادار نہیں ہیں کہ میں واپس جاؤں یا وہ مجھے اپنے پاس رکھیں۔ وہ سماج سے ڈرتے ہیں اور کوئی بات ایسی نہیں کر سکتے جو سماج کی مرضی کے خلاف ہو، اس کے مقابلہ میں میں دیکھتی ہوں، میری کتنی عزت بڑھائی آپ نے؟ باندی بنانے کی بجائے رانی بنا دیا مجھے، ——— پھر بھلا میں غمگین ہو سکتی ہوں؟ نہیں مہاراج یہ نہ کہیئے، یہ میرا ایمان (توہین) ہے ———!"

علاءالدین اِن باتوں پر ہنسنے لگا۔ اس نے کہا:۔

"اب تو تم بڑی دلچسپ باتیں کرنے لگی ہو، لیکن کچھ بھی ہو، تمہیں بتانا پڑے گا، افسردہ اور غمگین کیوں نظر آ رہی ہو ———!"

رانی کنول دیوی:۔ نہیں مہاراج کوئی بات نہیں۔ یہ داسی پر آپ کی مہربانی ہے کہ آپ اس کی

اتنی چنتا (فکر) رکھتے ہیں!"

علاء الدین خلجی۔ "جو کچھ تم نے کہا، سچ ہے، واقعی میں تمہارا بہت خیال رکھتا ہوں، میرے دل میں تمہاری عزت بھی ہے، اور محبت بھی، لیکن اسی لئے تو مجھ سے تمہاری پریشانی نہیں دیکھی جاتی، میں پوچھ کر رہوں گا، اور تمہیں بتانا پڑے گا۔ آخر اس افسردگی کا راز کیا ہے؟"

رانی کنول دیوی۔ "نہیں مہاراج، داسی کی بات پر بھروسہ کیجئے ـــــ کوئی بات نہیں!"

علاء الدین خلجی۔ "اس کے یہ معنی ہیں کہ تم ہم پر اعتبار نہیں کرتیں، بھروسہ نہیں کرتیں ہم پر ہمیں اس قابل نہیں سمجھتیں کہ دل کی بات کہو ـــــ ہمیں افسوس ہے اس کا ـــــ!"

رانی کنول دیوی۔ (بیتاب ہو کر) "نہیں مہاراج یہ نہ کہئے، آپ ہی میرے سرتاج ہیں، میرے سب کچھ ہیں، بھلا آپ سے بھی چھپا سکتی ہوں، ـــــ لیکن کوئی ایسی بات کہنے سے کیا حاصل جو کہہ تو دوں لیکن نتیجہ کچھ نہ نکل سکے، ـــــ!"

علاء الدین خلجی۔ "کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے؟ ـــــ کیا علاء الدین خلجی کوئی بات چاہے، اور وہ نہیں بھی ہو سکتی۔ رانی تم کہہ کر تو دیکھو ـــــ!"

رانی کنول دیوی۔ "بات یہ ہے مہاراج کہ وہ سنجوگتا جب سے آئی ہے، میں نے کھانا نہیں کھایا، پانی نہیں پیا، آنسو نہیں تھمے میرے، نیند نہیں آئی ایک پل کے لئے بھی!"

علاء الدین خلجی۔ "ہاں، ـــــ تمہارے کہے بغیر ہم یہ سب کچھ محسوس کر رہے ہیں، لیکن کیوں؟ ـــــ کیا کہا سنجوگتا نے؟"

رانی کنول دیوی۔ "اس نے میری بچی دیول دیوی کی ایسی داستانِ درد سنائی جس نے مجھے بے چین کر رکھا ہے!"

علاء الدین خلجی۔ "ایں کیا کہا؟ ـــــ تمہارے کوئی لڑکی بھی ہے؟"

رانی کنول دیوی :- "ہاں مہاراج، چاند کی طرح بے داغ، دودھ کی طرح پوتر، تاروں کی طرح حسین، میرے دل کا سکھ، میرے جگر کا ٹکڑا، ——— !"

علاء الدین خلجی :- "اوہ، ——— تو پھر کیا ہُوا اسے؟ ——— آخر اپنے باپ ہی کے پاس تو ہے، ——— رانی اس معاملہ میں افسوس ہے کہ ہم تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ ہم سے یہ ظلم نہیں ہو سکتا کہ باپ سے اس کی لڑکی چھین لیں۔ ہم تمہیں بھی واپس کرنے کو تیار تھے لیکن ہندو سماج کے دروازے تم پر بند ہو گئے۔ ہم نے تمہیں عزت اور محبت سے اپنے پاس رکھ لیا۔ لیکن دیول دیوی سے تو سماج خفا نہیں ہے، وہ اپنے شکست خوردہ باپ کے پاس ہے۔ اب ہم اسے دوسرا دُکھ دیں کہ اس کی لڑکی بغیر کسی خطا قصور کے چھین لیں، یہ نہیں ہو سکتا ہم سے، یہ ظلم ہے۔ اور تم ایسی فرمائش نہ کرو جس سے دوسروں پر ظلم ہوتا ہو، ہم تمہارے جذبات سمجھتے ہیں۔ ماں کی ممتا کا ہمیں احساس ہے۔ لیکن باپ بھی اولاد سے کم محبت نہیں کرتا۔ تم نے خضر خاں کو ہمارے لڑکے کو دیکھا ہے۔ ماشاء اللہ جوان ہو چکا ہے۔ بچپن میں اُس کی ماں مر گئی تھی۔ ہم نے اسے کتنی محبت سے پالا، اسے یا ہم جانتے ہیں یا وہ خود، آج وہی ہمارا ولی عہد ہے۔ رانی باپ اپنی اولاد سے اتنی ہی محبت کرتا ہے جتنی ماں، ——— !"

رانی کنول دیوی :- (رجل کر) "لیکن ہر باپ علاء الدین خلجی نہیں ہوتا ——— !"

علاء الدین خلجی :- (چونک کر) "کیا کہا؟ ——— ہر باپ علاء الدین خلجی نہیں ہوتا؟ کیا کرن سنگھ دیول دیوی کو تکلیف دے رہا ہے؟"

رانی کنول دیوی :- (روتے ہوئے) "وہ میری بچی کو تکلیف نہیں دیتا، اس کی جان لے رہا ہے۔ مہاراج! اگر آپ میری مدد نہیں کر سکتے تو تھوڑا سا زہر منگا دیجئے مجھے، میں زندہ رہنا نہیں چاہتی۔ ایک ماں کے لئے اس سے بڑھ کر بھی شرمناک زندگی کوئی ہو سکتی ہے کہ وہ خود تو محل میں رہے

عیش کرے اور اس کی اکلوتی بیٹی کڑھے، جلے، مرے، خودکشی کی تدبیریں سوچے۔ مہاراج آپ کے مجھ پر بڑے احسانات ہیں، ایک احسان اور کیجئے، مجھے مرجانے دیجئے!"

یہ کہہ کر دیول دیوی پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگی۔ علاء الدین خلجی کچھ دیر تک اس کی یہ کیفیت دیکھتا رہا۔ پھر اس نے کہا:۔

علاء الدین خلجی:۔ "لیکن تم نے یہ نہ بتایا کہ اس پر کیا ظلم ہو رہے ہیں؟ کیا تکلیف دی جارہی ہے اسے؟ کس مصیبت اور بپتا میں مبتلا ہے وہ ——— ؟"

رانی کنول دیوی:۔ "میری بچی بڑی بہادر ہے۔ وہ بڑی اچھی شہسوار ہے، تیرانداز ہے، نیزہ باز ہے، اور بہادری میں یکتا ہے۔ اس کی شادی اس کی مرضی کے خلاف ایک ایسے کائر (بزدل) شخص سے کی جارہی ہے، جس سے وہ نفرت کرتی ہے، جس کی وہ صورت دیکھنا نہیں چاہتی۔ کیا میری بچی پر یہ ظلم میری موجودگی میں بھی ہو سکتا تھا؟"

رانی پھر رونے لگی۔

علاء الدین خلجی:۔ "کرن سنگھ نے اس میں کچھ بہتری سوچی ہوگی۔ وہ بہرحال باپ ہے!"

رانی کنول دیوی:۔ "مہاراج کوئی بہتری نہیں۔ بات صرف یہ ہے کہ وہ گوبند پرشاد کا احسان مند ہے اور اسے خوش رکھنا چاہتا ہے، اور راجکمار گوبند پرشاد سے دیول دیوی ہمیشہ سے نفرت کرتی ہے ——— میں برداشت نہیں کرسکتی کہ اس کی زندگی برباد کی جائے!"

پھر رانی نے اسے گوبند پرشاد اور دیول دیوی کے تمام واقعات سنائے۔ یہ باتیں سُن کر علاء الدین ہنس پڑا۔ اس نے کہا:۔

"بڑی تیز لڑکی معلوم ہوتی ہے ——— امتحان خوب لیا اپنے عاشق کا!"

رانی کنول دیوی:۔ "اور وہ کس بُری طرح ناکام ہوا مہاراج!"

علاء الدین خلجی :- "ہاں یہ تو ٹھیک ہے، لیکن دیول دیوی کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ تم یہاں ہو، اور اس کی مدد کر سکتی ہو ——— ؟"

رانی کنول دیوی :- "اس بیچاری کو یہ تو نہیں معلوم کہ میں آپ کے محل میں ہوں، یہ معلوم ہے کہ میں آپ کی قید میں ہوں۔ اسے جب اپنے باپ سے یہ معلوم ہوا کہ اب وہ میرے چھڑانے اور رہا کرانے کا کوئی بندوبست نہیں کرے گا، کیونکہ سماج مجھے قبول نہیں کرے گا، اور جب باپ نے زبردستی یہ حکم سنا دیا کہ اس کی شادی گوبند پرشاد سے ہو گی، تو اس نے بڑے جتن کر کے اپنی ایک داسی سنجوگتا کو یہاں بھیجا یہ پیغام دے کر کہ میں رہا ہونے کی کوشش کروں ورنہ جس طرح بھی ہو سکے زہر کھا کر مر جاؤں۔ یہ بھی کہلایا کہ جب بچنے کی کوئی صورت نہ نکلے گی اور گوبند پرشاد سے شادی ہو جائے گی، تو وہ بھی زہر کھا کر اپنی جان دے دے گی ——— !"

یہ کہتے کہتے رانی کی آنکھیں بھر بھر آئیں اور وہ چپکوں ہچکوں رونے لگی۔

علاء الدین خلجی خاموشی اور تفکر کے ساتھ رانی کی باتیں سنتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔

علاء الدین خلجی :- "بہت دُکھ ہوا دیول دیوی کا ماجرا سُن کر، ہمیں ہمدردی ہے اس سے ——— کب ہو رہی ہے اس کی شادی گوبند پرشاد سے ؟"

رانی کنول دیوی :- "راج دربار کے جوتشی نے جو تاریخ دی ہے، وہ آج سے ٹھیک ایک ماہ بعد اسی تاریخ کو پڑے گی !"

علاء الدین خلجی :- "ہاں، ——— وقت بہت کم ہے۔ اتنے وقت میں کیا ہو سکتا ہے ؟"

رانی کنول دیوی :- "کچھ نہیں ہو سکتا ہم جیسوں کے کئے، ——— لیکن آپ چاہیں تو سب کچھ ہو سکتا ہے !"

علاء الدین خلجی :- "آخر تم چاہتی کیا ہو ؟ ——— ہم سے کیا توقع رکھتی ہو ؟"

رانی کنول دیوی:- "صرف ایک بات، مجھے چند سپاہی دے دیجئے۔ میں بھیس بدل کر جاؤں گی، اور جس طرح بنے گا، اپنی بچی کو کرن سنگھ اور گوبند پرشاد کے پنجے سے چھڑا کر لاؤں گی، ـــــ بس اتنا کرم کر دیجئے مجھ پر!"

علاءالدین خلجی:- "تم جاؤ گی؟ ـــــ رانی تم جاؤ گی؟"

رانی کنول دیوی:- "ہاں مہاراج میں جاؤں گی، ـــــ ماں اپنی اولاد کے لئے ہر خطرہ کا مقابلہ کر سکتی ہے، مر بھی سکتی ہے، جان بھی دے سکتی ہے خوشی سے، ـــــ!"

علاءالدین خلجی:- "کیا تم بھی دیول دیوی کی طرح شہسوار ہو؟ تیر انداز ہو؟ نیزہ باز ہو؟"

رانی کنول دیوی:- "نہیں مہاراج، یہ کام مجھے نہیں آتے!"

علاءالدین خلجی:- "پھر جا کر کیا کرو گی؟ ـــــ کیا اس لئے جاؤ گی کہ گرفتار ہو کر سماج کے ہاتھوں ذلتیں برداشت کرو ـــــ؟"

رانی کنول دیوی:- "آپ کے سپاہی بھی تو میرے ساتھ ہوں گے مہاراج؟"

علاءالدین خلجی:- "چند سپاہی ہی تو ہوں گے، کوئی لشکر تو نہ ہوگا۔ یہ مٹھی بھر آدمی گوبند پرشاد کی فوج سے لڑ سکیں گے؟ ذرا سوچو تو کیا کہہ رہی ہو تم؟"

رانی کنول دیوی:- "بے وقوفی کی بات کہہ رہی ہوں، لیکن اس کے سوا اور کہہ بھی کیا سکتی ہوں اور ہے بھی میرے بس میں کچھ، ـــــ؟"

علاءالدین خلجی:- "نہیں رانی ہم تمہیں نہیں جانے دیں گے۔ یہ نہیں ہو سکتا، یہ ہمارے ناموس کا معاملہ ہے۔ تم اب کنول دیوی نہیں ہو، علاءالدین خلجی کی بیگم ہو، ـــــ تم کو بھلا اس طرح جانے کی اجازت دی جا سکتی ہے؟"

رانی کنول دیوی:- "پھر کیا ہوگا مہاراج؟ ـــــ کیا میں اپنی بچی سے مایوس ہو جاؤں؟

اسے برداشت کرلوں کہ وہ زہر کھا کر خودکشی کرلے؟ اور خود زندہ رہوں، آپ تو بڑے دیالو ہیں بڑے مہربان ہیں، بڑے اللہ والے ہیں۔ مجھ پر اتنا ظلم نہ کیجئے۔ ایک ماں پر اتنا بڑا ظلم نہ کیجئے اس کا کلیجہ پھٹ جائے گا، اس کی آنکھوں میں دنیا تاریک ہو جائے گی۔ وہ اپنی اکلوتی اور چہیتی لڑکی کو مرتے، ایڑیاں رگڑتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔ آخر آپ کا رحم کیوں نہیں جاگتا مہاراج؟"

علاءالدین خلجی۔ "ہمارا رحم کبھی نہیں سوتا، وہ ہمیشہ جاگتا رہتا ہے، ــــــ!"

رانی کنول دیوی۔ "کیا اس وقت بھی جاگ رہا ہے؟"

علاءالدین خلجی۔ "ہاں، ــــــ جب تک ہم جاگتے ہیں وہ جاگتا رہے گا، جس دن ہماری آنکھیں بند ہوں گی وہ بھی سو جائے گا!"

رانی کنول دیوی۔ "ایسا نہ کہیئے آپ بہت دن زندہ رہیں گے، آپ خدا کے بندوں پر رحم کرتے ہیں، وہ آپ پر رحم کرے گا، ــــــ!"

علاءالدین خلجی۔ "آخر ان باتوں سے تمہارا مقصد کیا ہے؟"

رانی کنول دیوی۔ "میں کچھ نہیں جانتی، میری لڑکی مجھے دلا دیجئے، ــــــ ورنہ پھر مجھے اجازت دیجئے کہ میں جاؤں اور اسے بچا سکوں تو اس کی بجائے میں اپنی جان قربان کر دوں!"

علاءالدین نے دفعتہً تالی بجائی۔

فوراً ہی دو غلام برہنہ تلواریں لئے ہوئے نمودار ہوئے اور سامنے آ کر خاموش کھڑے ہو گئے!
رانی ان غلاموں کو دیکھ کر سہم گئی۔ اس نے خیال کیا، آج میری گستاخی کی سزا ملے گی، ان کو حکم دیا جائے گا کہ میری گردن کاٹ لیں، ــــــ کاٹ لیں! میں زندہ بھی نہیں رہنا چاہتی۔ دیول دیوی کے بعد یہ زندگی عذاب بن جائے گی میرے لئے، گردن کٹنے کے ساتھ ہی پاپ کٹ جائیگا!

لیکن علاءالدین نے یہ حکم نہیں دیا کہ رانی کنول دیوی کی گردن کاٹ لی جائے۔ اس نے کہا:۔

"خضر خاں ہے؟ ــــــ کیا کر رہا ہے؟ ــــــ کیا وہ محل میں ہے؟"

ایک غلام نے عرض کیا:۔

"جی ہاں وہ محل میں ہیں اور آرام کر رہے ہیں!"

علاءالدین خلجی: "جاؤ اُسے جگاؤ اور فوراً ہمارے سامنے حاضر کرو!"

چند لمحوں کے اندر خضر خاں علاءالدین خلجی کا بیٹا اور ولی عہد آنکھیں ملتا ہوا باپ کا حکم پاکر لرزاں اور ترساں حاضر ہوگیا۔ علاءالدین نے اس پر ایک نظر ڈالی اور کہا:۔

"تم سو رہے تھے خضر خاں؟"

خضر خاں نے ڈرتے ڈرتے کہا:۔

"ذرا نیند آگئی تھی، ــــــ!"

علاء الدین خلجی: "ہم تم سے ایک کام لینا چاہتے ہیں، کرلو گے؟"

خضر خاں: "یہ پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟ آپ جو کہیں گے، اس کی تعمیل میری زندگی کا سب سے زیادہ خوشگوار فرض ہوگا!"

علاءالدین خلجی: "ہم تمہیں ایک مہم پر بھیجنا چاہتے ہیں، ــــــ جاؤ گے؟"

خضر خاں: "سر آنکھوں پر جاؤں گا، ــــــ!"

علاءالدین خلجی: "لیکن وہ مہم کافی خطرناک ہے، جان جوکھوں کا کام ہے، ــــــ یہ سوچ لو!"

خضر خاں: "خضر خاں صرف حکم کی تعمیل کرنا جانتا ہے، سوچنا نہیں جانتا!"

علاءالدین خلجی: "وقت آگیا ہے کہ تمہارے الفاظ عملی جامہ پہنیں۔ کیا اپنی صداقت ثابت کرنے کے لئے تم ابھی جاؤ گے؟"

خضر خاں: "جہاں پناہ! اسی وقت جاؤں گا، اسی محل سے براہِ راست جاؤں گا۔ اگر سپاہیوں کی ضرورت ہوگی تو وہ پیچھے آتے رہیں گے۔ لیکن میں پدرِ عالی قدر کا حکم سُن کر ایک لمحہ بھی تامّل نہیں کروں گا فوراً روانہ ہوجاؤں گا! ——— ارشاد ہو غلام کو کس طرف جانا ہے؟"

علاء الدین خلجی: "بہت دُور دراز ——— !"

خضر خاں: "کوئی مضائقہ نہیں جہاں پناہ ——— !"

علاء الدین خلجی: "تمہیں رام نگر جانا پڑے گا، یہ بگلانہ سے دو سو میل کے فاصلہ پر ایک ریاست ہے وہاں سے کنول دیوی کی لڑکی دیول دیوی کو لانا ہے ——— !"

خضر خاں: "بہت خوب، شاید دیول دیوی اپنی والدہ سے ملنے آنا چاہتی ہیں۔ کیا ان کے والد کرن سنگھ انہیں یہاں آنے دیں گے ——— جہاں پناہ!"

علاء الدین خلجی: (برہمی کے عالم میں) "نہیں ——— دیول دیوی کو تم کرن سنگھ اور رام نگر کے راجکمار گوبند پرشاد سے چھین کر لاؤ گے ——— !"

خضر خاں: "ضرور لاؤں گا جہاں پناہ ——— !"

علاء الدین خلجی: "اور اگر نہ لا سکے تو پھر اپنا مُنہ نہ دکھانا ہمیں!"

خضر خاں: "اور اگر نہ لا سکا تو پھر میرا مُنہ کوئی بھی نہ دیکھ سکے گا ——— میں زندہ نہیں واپس آؤں گا۔ آؤں گا تو دیول دیوی کو لے کر، ورنہ وہیں پیوندِ زمین ہوجاؤں گا ——— !"

علاء الدین خلجی: "ہاں ——— ہم بھی یہی چاہتے ہیں!"

خضر خاں: "انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا! "

علاء الدین خلجی: "کتنی فوج تمہیں چاہئے؟"

خضر خاں: "یہ مہم کب تک سر ہوجانا چاہئے؟"

علاءالدین خلجی:۔ "زیادہ سے زیادہ بیس روز میں، ـــــ آج کے اکیسویں دن بویول دیوی کو یہاں ہونا چاہئے!"

خضر خاں:۔ "انشاءاللہ ایسا ہی ہوگا!"

علاءالدین خلجی:۔ "تم نے یہ نہیں بتایا کتنی فوج لے کر جاؤ گے تم؟"

خضر خاں:۔ "مہم اگر اتنی جلدی سر کرنی ہے تو فوج کا لے جانا بیکار ہے۔ فوج کے ساتھ کئی ماہ میں سر ہوسکے گی، ـــــ!"

علاءالدین خلجی:۔ (رک رک کر) "پھر ـــــ؛ ارادہ بدل دیا تم نے؟"

خضر خاں:۔ "زیادہ سے زیادہ سو سوار ہمراہ کر دیئے جائیں، صرف مختصر قافلہ ہی تیزی کے ساتھ راہ طے کر سکتا ہے جہاں پناہ، ـــــ!"

علاءالدین خلجی:۔ "ہم جانتے ہیں، لیکن سو سوار بہت کم ہیں، کم سے کم تین سو ہونے چاہئیں!"

خضر خاں:۔ "جہاں پناہ کی رائے بہت صائب ہے!"

علاءالدین خلجی:۔ "بس تو صبح فجر کی نماز پڑھ کر خدا پر بھروسہ کر کے روانہ ہو جاؤ!"

خضر خاں:۔ "غلام ابھی جائے گا، ـــــ اسی وقت! ـــــ فوراً!"

علاءالدین خلجی:۔ "شاید تم خفا ہو گئے، ـــــ اگر یہ بات ہے تو نہ جاؤ، ہم اپنے غلام کافور کو بھیج دیں گے، وہ بھی بڑا بہادر، جیالا، منچلا اور بہادر ہے!"

خضر خاں:۔ "بے شک اس میں یہ صفات موجود ہیں، لیکن یہ جذبہ نہیں کہ اگر ناکام ہو تو جان دے دے۔ یہ جذبہ غلام ہی میں ہے۔ غلام ہی کو اجازت مرحمت ہو، ـــــ میں خلجی کا بیٹا ہوں، کافور غلام۔ بیٹے کو باپ کے حکم کا جتنا خیال ہو سکتا ہے، غلام کو خواہ وہ کتنا ہی وفادار ہو نہیں ہو سکتا ـــــ!"

علاء الدین خلجی: "پھر تم اسی وقت جانے پر اصرار کیوں کر رہے ہو؟ کیا یہ تمہاری خفگی کا ثبوت نہیں؟"

خضر خاں: "نہیں جہاں پناہ! بھلا غلام اپنے آقا سے، بیٹا اپنے باپ سے خفا ہو سکتا ہے؟

میرے دو سَو سپاہی ہر وقت مہم کے لئے تیار رہتے ہیں۔ باقی سو آپ صبح روانہ کر دیجئے گا،

مَیں جو فیصلہ کر چکا ہوں، اس پر قائم رہنے دیجئے، خود آپ ہی کا حکم ہے، ارادہ بدلنا سب سے بڑی

کمزوری ہے!"

علاء الدین خلجی: "ہاں ٹھیک کہتے ہو ـــــ تم جا سکتے ہو، جاؤ، لیکن ادھر آؤ!"

خضر خاں باپ کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ خلجی نے اس کی پیشانی کو بوسہ دیا اور کہا۔

"بہادر باپ کے بیٹے کو ایسا ہی بہادر ہونا چاہئے، ـــــ جاؤ خدا تمہاری مدد کرے، ـــ!"

خضر خاں باپ سے رخصت ہو کر اسی وقت چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد خلجی نے رانی

کنول دیوی سے کہا:۔

"مَیں نے اپنا بیٹا صرف اس لئے مہم پر بھیجا ہے کہ یا تمہاری بیٹی مل جائے، ورنہ مَیں بھی اپنے

بیٹے سے ہاتھ دھولوں ـــــ! ـــــ ہم تم خوش رہیں تو ساتھ ساتھ، اور غم کا بوجھ اٹھائیں تو ساتھ

ساتھ، ـــــ یقین کرو مجھے خضر خاں سے اتنی ہی محبت ہے جتنی تمہیں دیول دیوی سے ہو سکتی ہے!"

رانی کنول دیوی حیرت سے شوہر کو دیکھتی رہی، اس کی زبان گنگ تھی۔ وہ کچھ نہ کہہ سکی ـــ

البتہ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش ہو رہی تھی، اسے روتا دیکھ کر علاء الدین جاتے جاتے پھر بیٹھ

گیا، اس نے محبت بھرے لہجہ میں کہا:۔

"رانی! تم اب بھی رو رہی ہو؟ اب بھی خوش نہیں ہوئیں؟ کیا میرا یہ ایثار بھی تمہارے غم زدہ دل

کو تسکین نہیں دے سکا؟"

اب رانی ضبط نہ کر سکی، وہ خلجی کے پاؤں سے لپٹ گئی۔ اس نے کہا:۔

"نہیں میں اتنا بڑا ایثار نہیں چاہتی، آپ خضر خاں کو نہ جانے دیجئے، بُلا لیجئے اسے۔ میں اپنی لڑکی کے لئے تختِ حکومت کے وارث، ولی عہدِ سلطنت اور اپنے سرتاج کے فرزند دلبند کو خطرہ میں نہیں ڈالنا چاہتی۔ میں اپنے الفاظ واپس لیتی ہوں، وعدہ کرتی ہوں، ہمیشہ خوش رہوں گی، آپ کبھی میری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھیں گے۔ میں دیول دیوی کو بھول جاؤں گی، نہ کبھی اسے یاد کروں گی۔ نہ اس کا ذکر کروں گی۔ بس بہت ہو چکا اب خضر خاں کو بُلا لیجئے، ابھی وقت ہے!"

خلجی نے مسکراتے ہوئے کہا:۔

"نہیں رانی! ہمارا فیصلہ اٹل ہے! ــــــ"

اور وہ خوابگاہ میں چلا گیا۔ رانی حیرت سے اسے دیکھتی رہ گئی!

اَور اچانک ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ؟

دیول دیوی نے رادھا کے مشورے سنجوگتا کو کنول دیوی کے پاس بھیجا تھا۔ اور اب وہ بالکل مطمئن ہوگئی تھی۔ قسمت پرشاکر اور قانع! ماں کی طرف سے دھڑکا لگا رہتا تھا کہیں وہ ماتما کی ماری، کسی نہ کسی طرح دشمن کے پنجے سے چھوٹ کر اپنے شوہر کے لئے بیٹی کے لئے واپس نہ آجائے اور یہاں آکر ذلیل ہو، اچھوت بنا کر رکھی جائے، اب اطمینان ہوگیا تھا کہ وہ نہیں آئے گی بلکہ خودکشی کر کے اپنی زندگی ختم کردے گی۔ رہ گئی میں، سو باپ کی جان بچانے کے بعد اس طرح خود جان دوں گی اور گوبند پرشاد کی جان لوں گی کہ لوگ چہ میگوئیاں ہی کرتے رہ جائیں گے کہ یہ دونوں میاں بیوی کس طرح مر گئے؟ یہ راز ہم دونوں کے ساتھ چتا میں جل جائے گا، اور قیامت تک کوئی بھی اس کی اصل حقیقت سے آشنا نہ ہوسکے گا!

اس عرصے میں وہ کرن سنگھ سے بہت کم ملی تھی، اور اگر کبھی ملاقات ہو بھی جاتی تھی تو جلد از جلد کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے ختم کر دیتی تھی۔ راجکمار گوبند پرشاد البتہ وقت بے وقت آتا رہتا تھا، وہ اُس کا پُرتپاک خیرمقدم کرتی تھی، مسکرا مسکرا کر باتیں کرتی تھی، اس کی گفتگو میں، جھوٹ میں، شیخی بازی میں دلچسپی کے ساتھ حصّہ لیتی تھی، گھنٹوں اور پہروں مصروفِ تکلم

رہتی تھی - ہر ملاقات کے بعد گوبند پرشاد یہ یقین کرلیتا تھا کہ آج دیول دیوی کی محبت کل کے مقابلہ میں کئی گناہ بڑھی ہوئی نظر آرہی تھی، وہ سمجھتا تھا دیول دیوی سب کچھ بھول چکی ہے، اب وہ ایک ہندو استری کی طرح اس لئے زندہ ہے کہ شوہر پرستی کا ایک نیا ریکارڈ قائم کرکے دنیا کو بتادے، کہ ہندو عورت شوہر کی کیسی وفادار بیوی بن سکتی ہے!

راجکمار کی کل شادی ہونے والی تھی، اور آج ہی راجدھانی سے باپ کا کوئی فرمان موصول ہوا تھا، جسے پڑھ کر وہ کچھ افسردہ سا ہوگیا تھا - اب ہر معاملہ پر وہ دیول دیوی سے صلاح و مشورہ کرنے کے بعد اس کی ہدایت پر عمل کرنے کا عادی ہوگیا تھا - چنانچہ وہ دیول دیوی کے کمرے میں پہنچا، رادھا بیٹھی اسے اس کے کنگھی کررہی تھی، اسے دیکھتے ہی جلدی جلدی اس نے اپنا کام ختم کیا، اور ان دونوں کو تنہا چھوڑ کر اپنے کمرہ میں چلی گئی۔

راجکمار کو پریشان اور افسردہ دیکھ کر خود دیول دیوی نے بھی اپنے اوپر اضطراب و افسردگی کی کیفیت طاری کرلی اور بڑی اپنایت کے لہجہ میں پوچھا :-

"راجکمار کیا بات ہے آج آپ کچھ پریشان سے نظر آرہے ہیں، کوئی خاص بات ——؟"

گوبند پرشاد - (سر کھجاتے ہوئے) "کیا بتاؤں؟ پتاجی کا ایک خط آیا ہے، اور اس نے ہمارا سارا پروگرام غارت کرکے رکھ دیا!"

دیول دیوی :- "کیا لکھا ہے خط میں؟ (مسکراکر) کیا انہوں نے لکھا ہے کہ ایک ایسی لڑکی سے شادی نہ کرو جو اب صرف نام کی راجکماری ہے، جس کے باپ کا راج پاٹ چھن چکا، جو اب ہمارے ٹکڑوں پر پڑی ہے، تمہارا بیاہ کسی اونچے راجہ کی راجکماری سے کیا جائے گا، فوراً واپس آؤ ——— تو راجکمار! یہ باپ بیٹے کا معاملہ ہے، میں اس میں کیا کہہ سکتی

ہوں، آپ جانیں وہ جانیں۔ باقی یہ سچ ہے کہ اس کا افسوس مجھے بھی ہوگا۔ آپ کا افسوس تو دوسری راجکماری پاکر فوراً مٹ جائے گا۔ لیکن مَیں چونکہ کسی دوسرے راجکمار سے رشتہ نہیں جوڑوں گی، للہٰذا میری زندگی بھر کا یہ ساتھی بن جائے گا!"

شاید ابھی راجکماری کچھ اَور بھی کہتی، لیکن گوبند پرشاد کے لئے اب خاموش رہنا ناممکن ہو گیا۔ اس نے راجکماری کے مُنہ پر ہاتھ رکھ دیا، اور تقریباً چیختے ہوئے کہا۔ "خاموش! ـــــ راجکماری ایسی باتیں نہ کرو، جن سے میرا دِل پھٹ جائے۔ مَیں یہ باتیں نہیں سُن سکتا!"

دیول دیوی: "اچھا مَیں چُپ رہتی ہوں، یہ بھی نہیں پوچھوں گی، مہاراج نے آپ کو کیا لکھا ہے؟"

گوبند پرشاد: "یہ شوق سے پوچھو، اور نہ پوچھو گی تو مَیں خود بتا دوں گا۔ آخر آیا اسی لئے ہوں لیکن ایسی باتیں نہ کرو جن سے دِل دُکھے، جن سے صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے، جن سے میری رُوح تڑپ اُٹھے!"

بڑی معصومیت اور سادگی کے ساتھ دیول دیوی نے جواب دیا۔

"لیکن راجکمار مَیں کیا کچھ کہہ گئی، خود مجھے بھی اس کا ہوش نہیں، ـــــ اگر کوئی ایسی بات منہ سے نکل گئی ہو، جو آپ کو ناگوار گزری ہو تو اس کی معافی چاہتی ہوں، ـــــ!"

گوبند پرشاد: "پھر وہی ـــــ تم ان باتوں کا سلسلہ بند نہیں کرو گی؟"

دیول دیوی: "اچھا بند کر دیا، اب مَیں سنوں گی، آپ کہئے اور جی بھر کے کہئے جو کچھ کہنا چاہتے ہیں، ـــــ!"

گوبند پرشاد: "کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ اگر پتاجی مجھے یہ حکم دیں کہ مَیں تمہیں چھوڑ دوں، یا تم سے شادی نہ کروں تو مان لوں گا ـــــ؟"

دیول دیوی: "ہاں میں یہی سمجھتی ہوں، اور آپ کو ایسا ہی کرنا بھی چاہئے۔ بھلا کہیں بیٹا باپ

کی نافرمانی بھی کرسکتا ہے ؛ میں تو اس کا تصور بھی نہیں کرسکتی !"

گوبند پرشاد :۔ "تم نادان ہو، بیٹا باپ کی گردن بھی مار سکتا ہے، ——— آخر تم نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے ؛ کیا میں اتنا بزدل ہوں، اتنا کمزور ہوں کہ اس طرح احکام مان لوں گا ؛ پتا جی جانتے ہیں میں کس طبیعت کا ہوں۔ وہ ہرگز اس قسم کی بات نہیں کہہ سکتے !"

دیول دیوی :۔ (بھولے پن کے ساتھ) "تو مہاراج نے اس طرح کی کوئی بات نہیں لکھی ہے ؟"

گوبند پرشاد :۔ "نہیں، ——— وُہ ایسا لکھ ہی نہیں سکتے تھے !"

دیول دیوی :۔ "پھر تو مجھے بھی بڑی خوشی ہوئی، لیکن آپ پریشان کیوں ہو گئے اس خط سے؟ کوئی نہ کوئی بات تو ہوگی ضرور ایسی ویسی، ورنہ آپ جیسا جیالا آدمی یوں پریشان تو نہیں ہو سکتا !"

گوبند پرشاد :۔ "بات یہ ہے کہ پتا جی ٹھہرے جوتشیوں کے حکم کے پابند، جو وہ کہتے ہیں پتا جی ہاں میں ہاں ملا دیتے ہیں، ——— میں تو عاجز آ گیا ہوں اِن جوتشیوں سے !"

دیول دیوی :۔ "تو جوتشی جی مہاراج کیا فرماتے ہیں ؟"

گوبند پرشاد :۔ "وہ فرماتے ہیں کہ کل ٹھیک سات بجے صبح ہماری شادی ہو جائے !"

دیول دیوی :۔ "تو کیا ہُوا، یہ تاریخ تو بہت پہلے سے مقرر ہو چکی ہے، صرف وقت بدلا ہے، اور کوئی بُرا وقت بھی نہیں، اچھا ہے صبح صبح اس رسم سے فرصت ہو جائے، ——— واہ بس یہی بات تھی جس پر تلملائے جا رہے تھے ہمارے راجکمار !"

گوبند پرشاد :۔ (روٹھ کر) "تم اپنی جھونک میں کسی اَور کی تو سنتی نہیں ہو، ——— اس کے بعد کیا لکھا ہے یہ بھی تو سُن لو ——— !"

دیول دیوی :۔ "اس کے بعد بھی کچھ لکھا ہے ؟ ——— میں کیا جانوں کیا کیا لکھا ہے مہاراج نے ؟ ——— فرمائیے ! سُن رہی ہوں بڑی توجہ اور شوق سے !"

گوبند پرشاد :۔ "لکھا ہے شادی کے ٹھیک تین گھنٹے کے بعد، نہ ایک منٹ پہلے نہ ایک منٹ بعد، میں تم کو لے کر پالم پور چل پڑوں۔ باقی سب تقریبیں وہیں انجام پائیں گی!"

دیول دیوی :۔ (مسکراکر) "تو کیا ہوا؟ اس میں خفا ہونے اور پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟"

گوبند پرشاد :۔ "ہم نے پروگرام بنایا تھا، شادی یہاں ہوگی، پھر اطمینان سے یہاں کی سیر کریں گے۔ یہاں کے جنگل اور دریا، پہاڑ، تالاب تمہیں دکھائیں گے۔ آج خیمہ یہاں ہو گا کل وہاں، رات کہیں بسر ہوگی اور دن کہیں، یوں ہی ہنستے کھیلتے سیر کرتے نظارہ کرتے کئی مہینے گزار دیں گے۔ پھر اطمینان سے پالم پور جائیں گے ——— لیکن جوتشی جی مہاراج نے سارا پروگرام چوپٹ کر کے رکھ دیا!"

دیول دیوی :۔ "تو کیا ہوا ——— جب چاہیں ہم رام نگر واپس آسکتے ہیں۔ آخر اپنا ہی تو ملک ہے ——— ؟ واہ یہ ہماری ہے وہ صحرا بھی ہمارا! ——— لیکن مہاراج آپ کے باپ ہیں، آپ ان کے چہیتے بیٹے ہیں، ان کے دل میں بھی تو بہت سی اُمنگیں ہوں گی اپنے لاڈلے کا سہرا دیکھنے کی، اسے دولہا بنا ہوا دیکھنے کی۔ اس موقع پر راجدھانی میں جشن کرنے کی، دھوم دھام کے ساتھ رقص و سرود کی محفلیں برپا کرنے کی۔ جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا۔ یہاں رام نگر میں وہ بات کہاں جو وہاں ہوگی۔ خود میرا بھی جی چاہ رہا تھا۔ آپ کی وجہ سے خاموش تھی!"

گوبند پرشاد :۔ "خود تمہارا بھی جی چاہ رہا تھا پالم پور جانے کا؟"

دیول دیوی :۔ "بالکل، بالکل، بس یہی ٹھیک ہے، بھگوان کا نام لے کر کل یہاں سے ہمارا قافلہ کوچ کرے گا!"

گوبند پرشاد :۔ "اتنا اشتیاق ہے تمہیں وہاں جانے کا!"

دیول دیوی :۔ "جی ہے تو، ——— اعتراض ہے آپ کو کچھ؟"

گوبندپرشاد نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا اور باہر جاتے ہوئے کہا :-

" مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے، جو رائے تمہاری وہ ہماری - ابھی جاکر اپنے آدمیوں سے کہے دیتا ہوں، وہ سامانِ سفر ٹھیک کریں گے اور یہاں سے ہم لوگ وقتِ مقررہ پر روانہ ہو جائیں گے "

دیول دیوی :" شکریہ ——— آپ نے پتاجی کی بات مان لی اور میری دیرینہ خواہش بھی پوری کر دی ! "

جیسے ہی راجکمار گوبندپرشاد دیول دیوی سے مل کر واپس گیا - رادھا غصّہ میں بھری ہوئی اندر داخل ہوئی اور آتے ہی برہمی کے ساتھ بولی :-

" آخر یہ کیا نوبت ہے راج کماری ——— ؟ "

دیول دیوی :" کیا ہوا رادھا تُو تو بہت خفا معلوم ہو رہی ہے ؟ کسی نے کچھ کہا ؟ "

رادھا :" جی مجھے آپ کی مہربانی سے کچھ کہنے والا کون ہے - لیکن مَیں تو صرف یہ پُوچھنے آئی ہوں کہ آخر رام نگر سے کوچ کرنے کی اتنے شوق اور اصرار کے ساتھ کیا ضرورت پیش آگئی ؟ "

دیول دیوی :" اونھ ! ——— تو اس بات پہ روٹھی ہیں ہماری رادھا دیوی ؟ ——— چل پگلی ——— ! " یہ کہہ کر دیول دیوی ہنسنے لگی -

رادھا نے پیچ و تاب کھاتے ہوئے کہا :-

" بس راجکماری تمہاری یہ باتیں ہمیں اچھی نہیں لگتیں، بھلا کوئی بات ہوئی یہ ؟ "

دیول دیوی :" اُفوہ ! ——— کچھ بتائے گی بھی مَیں نے کون سا جرم کیا ؟ ——— کیا خطا کی ؟ "

رادھا :" ایسا جان پڑتا ہے جیسے تم راجکمار سے پریم کرنے لگی ہو ! سچ کہنا راجکماری ؟ "

دیول دیوی :- (ہنستے ہوئے) " آخر پتی (شوہر) سے پریم نہیں کروں گی، تو کس سے کروں گی ؟

بلاؤں اپنے راجکمار کو، اور کہہ دوں یہ جلتی ہے ہمارے تمہارے پریم سے؛ مارے کوڑوں کے کھال اُتار دیں گے تیری!!؟"

رادھا:- "مَیں تو مرنے کو تُلی بیٹھی ہوں، چاہے زہر کھا کر مروں یا کوڑے کھا کر لیکن تمہیں کیا ہؤا جا رہا ہے؟"

دیول دیوی:- "کچھ بھی نہیں ——— جو فیصلہ کر چکی ہوں اس پر قائم ہوں، دیکھ لینا!"

رادھا:- "دیکھ لینا! ——— پھر یہاں سے جا کیوں رہی ہو؟"

دیول دیوی:- "اری پگلی تو نہیں جانتی، اسی میں تو لطف ہے۔ باپ کے سامنے جب اس کا بڑا ظالم اور جوان بیٹے کی لاش تڑپے گی، وہی تو منظر ہوگا قابلِ دید، یہاں سے تو صرف خبر جاتی، وہاں تو سب کچھ اپنی آنکھ سے دیکھے گا، کریا کرم اپنے ہاتھ سے کرے گا!"

رادھا:- (مسکرا کر) "تو یہ سوچا ہے راجکماری نے؟"

دیول دیوی:- "ہاں، ——— اور تُو پرلے درجے کی احمق کیا سمجھ رہی تھی؟ بتا تو سہی، دیکھوں تیرے دماغ کی رسائی کہاں تک ہے؟ چپ کیوں بیٹھی ہے یوں؟"

رادھا:- (ہنستے ہوئے) "ہاں، واقعی مَیں بے وقوف ہوں ——— تم نے بڑی اچھی تدبیر سوچی ہے، لطف آجائے گا؛ ——— لیکن اگر وہاں داؤں نہ چلا تو؟ تب کیا ہوگا؟"

دیول دیوی:- "نہ کیوں چلا؟ چلنا پڑے گا، بھلا ہم ایک بات چاہیں اور وہ نہ ہو، ہم ایک بات کا فیصلہ کریں اور وہ ادھورا رہ جائے؛ ——— ذرا مجھے وہاں پہنچنے تو دے پھر دیکھ کیا ہوتا ہے؟"

رادھا دیول دیوی کی بڑی جاں نثار اور وفادار سہیلی تھی۔ وہ دل سے اس کے ساتھ زندہ رہنا اور ساتھ مرنا چاہتی تھی۔ جس دن سے اس نے دیول دیوی کا یہ فیصلہ سنا تھا کہ وہ اپنے باپ کی جان بچانے کے لئے گوبند پرشاد سے شادی کرے گی، اور اس کے بعد جان دے دے گی، اس دن سے رادھا نے بھی یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اپنی آقازادی کے ساتھ وہ بھی اس دنیا سے رخصت ہو جائے گی۔ دیول دیوی کے بعد زندگی بے معنی تھی۔ کئی بار اس کے جی میں آیا کہ دیول دیوی کو اس ارادہ سے باز رکھنے کی کوشش کرے۔ لیکن کرن سنگھ کے کرتوت، گوبند پرشاد کی کم ظرفی اور راج محل کی عام فضا کو دیکھ کر وہ بھی یہ سمجھ رہی تھی کہ ان حالات میں زندہ رہنے کے معنی صرف حقارت کی زندگی بسر کرنے کے ہیں، اور دیول دیوی جیسی خوددار اور باوقار لڑکی کسی قیمت پر بھی ایسی زندگی نہیں بسر کر سکتی!

راج محل میں اگرچہ داسیوں اور باندیوں کی کمی نہیں تھی، اور جب سے یہ معلوم ہوا تھا، کہ دیول دیوی، راجکمار کی دُلہن بننے والی ہے، ان سب کے طرزِ عمل میں زمین آسمان کا فرق آگیا تھا اور آج تو سب پلی پڑ رہی تھیں کہ دُلہن بنائیں اور ماہِ شب چہاردہم بنا دیں۔ لیکن رادھا نے کسی کو پاس نہیں پھٹکنے دیا۔ اس نے خود ہی سارے کام انجام دیئے۔ یوں تو سارا راج محل شادی کی خوشیوں اور تیاریوں میں مصروف و منہمک تھا، لیکن کرن سنگھ گوبند پرشاد اور رادھا کی مصروفیت قابلِ دید تھی۔ کرن سنگھ اس فکر میں تھا کہ جلد از جلد دیول دیوی گوبند پرشاد کی دُلہن بن جائے اور پھر وہ اپنی کھوئی ہوئی سلطنت کے حصُول کی کوئی تدبیر سوچے۔ گوبند پرشاد اس فکر میں تھا کہ جلد از جلد شادی کی رسم انجام پائے تاکہ وہ اس گلعذار کو لے کر پالم پور کا رُخ کرے، اور زندگی کے اس نئے اور شاندار دَور کا خوشی اور خرمی کے ساتھ آغاز کر دے۔ اور رادھا اس فکر میں تھی کہ جلد از جلد یہ شادی کا مرحلہ طے ہو تاکہ پھر زندگی کا مسئلہ طے کیا جائے۔ کرن سنگھ کو کسی پہلو قرار

نہیں تھا، کبھی ادھر آتا تھا کبھی اُدھر جاتا تھا۔ یہی حال گوبند پرشاد کا تھا۔ رادھا اپنے کام میں لگی ہوئی تھی، اور دیول دیوی پوری سنجیدگی اور وقار کے ساتھ دُلہن بن رہی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا اس سہرے کو نوچ کر پھینک دے، ٹھوکر سے پامال کر دے، وہ بار بار سوچتی تھی مسرت کے ان شادیانوں کو نوحۂ غم سے بدل دے ـــــــ لیکن شاید ابھی وقت نہیں آیا تھا ـــــــ!

ساری رات اسی گہما گہمی اور ہنگامہ آرائی میں بسر ہو گئی اور صبح ٹھیک سات بجے دیول دیوی اور گوبند پرشاد کی شادی پنڈت جی نے کر دی۔ اس وقت گوبند پرشاد کی مسرت بے حساب کا کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کرن سنگھ بھی خوش تھا اور برملا اپنی مسرت کا اظہار کر رہا تھا۔ رادھا اگرچہ دل میں ملول و افسردہ تھی، لیکن بظاہر بہت خوش تھی، اور دیول دیوی دل میں بھی مغموم تھی اور ظاہر تک بھی افسردہ! ـــــــ وہ اسے اپنی توہین سمجھتی تھی کہ چند دن کے لئے بھی گوبند شاہ جیسے شخص کی بیوی بنے۔ لیکن حالات کا تقاضا یہی تھا۔ باپ کی خود غرضی، کم ہمتی اور پستی اگرچہ اس پر آشکار ہو چکی تھی پھر بھی یہ منظور نہ تھا کہ اس کی جان لے۔ وہ گوبند پرشاد سے انتقام لینا چاہتی تھی اور پھر اس انتقام کی آگ میں خود اپنے آپ کو بھی جھونک دینا چاہتی تھی۔ ـــــــ

شادی کے مراسم انجام پانے کے بعد کرن سنگھ بیٹی کے پاس آیا تاکہ اسے تسلی دے۔ اس نے کہا:۔

"بیٹی! آج تم مجھ سے چھٹ رہی ہو، آج سے تم نئی زندگی شروع کر رہی ہو۔ اب تک تم میری تھیں، آج سے اپنے شوہر کی ہو۔ اگر تم بگلانہ میں ہوتیں تو آج کی دھوم دھام ہی کچھ اور ہوتی۔ لیکن یہاں کی دھوم دھام کیا کچھ کم ہے؟"

اگرچہ دیول دیوی دُلہن بنی بیٹھی تھی لیکن یہ باتیں سُن کر ضبط نہ کر سکی۔ اس نے پوچھا:۔

"پتاجی! اگر آج میں بگلانہ میں ہوتی کیا جب بھی گوبند پرشاد ہی سے میرا بیاہ ہوتا؟"

کرن سنگھ طنز سے بھرے ہوئے ان الفاظ کا جواب نہ دے سکا، وہ بھی بڑا شاطر تھا، مسکرا

مسکرا کر اس وار کو اس نے سہہ لیا تھا!

"نہیں بیٹی، گوبند پرشاد سے تمہ ہوتی، لیکن کسی نہ کسی راجکمار سے ہوتی ضرور، ——— خیر، اب بیکار باتوں سے کیا حاصل؛ قسمت کا بدل انسان کے ہاتھ میں نہیں ہوتا۔ بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں ہم پسند نہیں کرتے لیکن حالات مجبور کر دیتے ہیں۔ بیٹی میرا مطلب یہ ہے: جو کچھ ہوا بہت بُرا ہوا، لیکن ہو چکا؛ اب اسے کوئی نہیں مٹا سکتا۔ بھگوان بھی نہیں، اب عقل اور دانش کا تقاضا یہ ہے کہ اسے بھگوان کی مرضی سمجھ کر برداشت کر لیا جائے، چاہے ہنسی خوشی، چاہے رو رو کر۔ میری رائے یہ ہے کہ بہادری اسی میں ہے کہ حالات کا مقابلہ ہنس ہنس کر کیا جائے۔ تو مجھے مسکراتے ہوئے دیکھ رہی ہے، لیکن کاش تو میرا دِل دیکھ سکتی۔ اس میں غم ہے، اس میں داغ ہیں، اس میں چوٹیں ہیں۔ لیکن تو بھی بے بس ہے، میں بھی بے بس ہوں، انسان جب بے بس ہوتا ہے تو کچھ نہیں کر سکتا۔ آج تو جا رہی ہے، اب میں آزاد ہوں، تیری وجہ سے میرے پاؤں میں بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں، کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ آج وہ بیڑیاں کھل گئیں اب میں اپنے راج پاٹ کے لئے میدان میں اُتروں گا۔ اگر گوبند پرشاد نے مدد نہ کی تو بھی میدان میں اُتروں گا، اس وقت تک چین نہ لوں گا، جب تک خلجی کو ناکوں چنے نہ چبوا دوں، انتظار صرف چبار پرشاد کا ہے، جسے سفیر بنا کر میں نے راجکمار سے چھپا کر قتلغ خواجہ کے پاس بھیجا ہے۔ وہ آیا اور میں چلا۔ بیٹی اپنے باپ کے لئے بھگوان سے پرارتھنا (دعا) کرتی رہنا کہ وہ کامیاب ہو!"

دیول دیوی چُپ چاپ یہ باتیں سنتی رہی۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اتنے میں گوبند پرشاد گھبرایا ہوا آیا، اس نے کرن سنگھ سے کہا:۔

"پتا جی! سمے (وقت) گزرا جا رہا ہے۔ جوتشی جی کی بتائی ہوئی گھڑی (ساعت) بالکل قریب آگئی ہے، ہمیں چلنا چاہئے!"

کرن سنگھ نے بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھا اور اُٹھ کھڑا ہُوا۔

"ہاں بیٹا وقت گزرا جا رہا ہے۔ جوتشی جی کی بتائی ہوئی گھڑی نکلنی نہیں چاہیے۔ جاؤ، سدھارو، بھگوان تم دونوں کو سُکھی رکھیں!"

گوبند پرشاد نے سر جھکا کر یہ بزرگانہ کلمات سُنے، پھر کہا:۔

"لیکن پتاجی، کیا آپ نہیں چلیں گے ہمارے ساتھ پالم پور؟"

کرن سنگھ:۔ "میں جا کر کیا کروں گا، مجھے تو یہیں پڑا رہنے دو ایک گوشہ میں!"

گوبند پرشاد:۔ "واہ کہیں ایسا ہو سکتا ہے؛ آپ کو بھی چلنا ہوگا ہمارے ساتھ، پتاجی نے بڑی تاکید لکھی ہے۔ اصل دھوم دھام تو وہیں ہوگی، اور آپ ہی نہ ہوئے تو پھر لطف کیا آئے گا!"

کرن سنگھ:۔ "کیا مہاراج نے بلایا ہے مجھے؛ اگر اُنہوں نے بلایا ہے تو جائے بغیر چارا نہیں!"

گوبند پرشاد:۔ "ہاں پتاجی اُنہوں نے تاکید کے ساتھ بُلایا ہے۔ آپ نہ گئے تو وہ مجھ پر خفا ہوں گے!"

کرن سنگھ:۔ "اگر یہ بات ہے تو پھر مجھے چلنا ہی پڑے گا!"

گوبند پرشاد:۔ "جی بس اب چلئے۔ وہ ڈولا رکھا ہے راجکماری کے لئے، سپاہی بھی کیل کانٹے سے لیس کھڑے ہیں۔ تین دن کا یہ سفر پلک جھپکاتے میں گزر جائے گا!"

کرن سنگھ:۔ "ہاں اَور کیا، ——— اچھا تو چلو!"

فوراً ہی ڈولا آ کر لگ گیا۔ رادھا کے ساتھ دُلہن بنی ہوئی دیول دیوی بڑے تجمّل اور شان سے اس میں آ کر بیٹھ گئی، کہاروں نے اسے اُٹھایا، اور دو ہزار سپاہیوں کے جلو میں یہ بارات روانہ ہو گئی۔

دن ابھی ختم نہیں ہُوا تھا لیکن دھوپ ٹھنڈی پڑ چکی تھی۔ راجکمار کی خواہش یہ تھی، کہ

چند میل کے فاصلہ پر ایک پُر فضا وادی تھی، اسی میں شب باشی کی جائے۔ اس نے کرن سنگھ سے کہا بڑی پُر فضا جگہ ہے۔ وہاں پہنچتے ہی ساری ماندگی اور تھکن دُور ہو جائے گی۔ کرن سنگھ نے اس رائے سے اتفاق کیا اور پھر دونوں خاموش ہو گئے۔

تھوڑی دیر میں گرد کا ایک طوفان سا اُٹھتا ہوا دکھائی دیا۔ کرن سنگھ اپنا گھوڑا گوبند پرشاد کے قریب لے آیا، اور حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا:۔

"یہ گرد کیسی اُڑ رہی ہے؟ ——— معلوم ہوتا ہے اس کے پیچھے کوئی فوج ہے! لیکن وہ کس کی ہو سکتی ہے؟"

گوبند پرشاد ہنس پڑا۔ اس نے کہا:۔

"پتاجی! یہاں فوج کس کی آسکتی ہے، یہ ہماری سرزمین ہے، ہمارے یہاں کوئی قدم نہیں رکھ سکتا بغیر ہماری اجازت کے؟"

کرن سنگھ:۔ "ممکن ہے مہاراج نے تمہیں بلانے کے لئے کچھ اور سپاہی بھیج دیئے ہوں!"

گوبند پرشاد:۔ "یہ بھی نہیں ہو سکتا ہمارے ساتھ پوری ایک فوج ہے، پھر کچھ اور سپاہیوں کو بھیجے کا مطلب؟"

کرن سنگھ:۔ "لیکن بیٹے دیکھو تو وہ گرد چھٹی، اور سواروں کا ایک دستہ صاف اسی طرف آتا نظر آ رہا ہے؟"

گوبند پرشاد نے دیکھا اور قدرے پریشان ہو کر کہا۔

"ہاں ہیں تو یہ سوار ہی۔ لیکن کہاں سے آ رہے ہیں ———!"

کرن سنگھ۔ "بیٹے یہ سوار دوست تو نہیں ہو سکتے کسی طرح ——— دیکھتے نہیں یہاں سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ مسلمان ہیں!"

گوبند پرشاد۔ (سہم کر) "مسلمان؟ ——— مسلمان یہاں کہاں سے آ گئے؟ ان سے تو ہماری کوئی لڑائی بھی نہیں ہے!"

کرن سنگھ۔ "ممکن ہے کہ راستہ بھٹک گئے ہوں اگر ایسا ہو تو ان میں سے ایک کو بھی بچ کر نہیں جانا چاہئے ——— !"

اب وہ سوار قریب آ چکے تھے، ان کی تعداد اندازاً تین سُو کے قریب ہوگی، سب کے آگے ایک بیس بائیس سال کا خوب صورت اور خوش اندام جوان تھا۔

مسلمان سواروں کے اس دستے کو دیکھ کر گوبند پرشاد کے سپاہی رُک گئے۔ ان سپاہیوں کا سردار گوبند پرشاد کے قریب آیا۔ اس نے کہا:۔

"یہ مسلمان ہیں کیا حکم ہوتا ہے، حملہ کر دیا جائے ان پر ——— ؟"

کرن سنگھ نے کہا:۔

"نیکی اور پوچھ پوچھ دیکھتے کیا ہو، مار لو، تم دو ہزار ہو یہ تین سو سے زیادہ نہیں!"

گوبند پرشاد نے اس فیصلے سے اتفاق نہیں کیا۔ اس نے کہا:۔

"پتاجی! ہم بے شک انہیں ماریں گے اور زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ لیکن معلوم تو ہو یہ کون لوگ ہیں؟ ممکن ہے کوئی پیام لے کر آئے ہوں کسی کا؟"

کرن سنگھ بادلِ نخواستہ رضامند ہو گیا گوبند پرشاد اور کرن سنگھ مسلمان دستے کے سامنے پہنچے، وہ نوجوان بھی بڑھ کر آگے آ چکا تھا!

گوبند۔ "یہ ہمارا دیس ہے، اور یہاں کوئی غیر شخص بلا اجازت نہیں آ سکتا، ——— "

وہ نوجوان مسکراتا ہوا بولا:۔

"مجھے یہ معلوم ہے، اور پھر بھی میں یہاں آیا ہوں!"

گوبند پرشاد ۔ (برہمی کے ساتھ) "لیکن کیوں، مقصد کیا ہے آپ کا؟"

وہ نوجوان کہنے لگا :۔

"میں سلطان علاءالدین خلجی کا ایک معمولی سپاہی ہوں، ———— کیا میں معلوم کر سکتا ہوں آپ کی تعریف کیا ہے؟ ———— یہ معلوم ہو جائے تو پھر زبان یا پھر دست و بازو سے گفتگو کا آغاز کیا جائے!"

کرن سنگھ تلملا گیا۔ اس نے غصہ کے ساتھ کہا :۔

"خاموش ———— او گستاخ انسان تو نہیں جانتا کہ تیرا مخاطب کون ہے؟"

خضر خاں ۔ "نہیں جانتا اور یہی جاننا چاہتا ہوں۔ تکلف نہ کیجئے، بتا دیجئے، شکرگزار ہوں گا!"

کرن سنگھ : "میں ہوں بگلانہ کا مہاراجہ کرن سنگھ، اور یہ ہے راجکمار گوبند پرشاد۔ اس دیس کا مالک، یہاں کا ولیعہد سلطنت! ———— اب تم یہاں سے بچ کر نہیں جا سکتے کسی طرح ————!"

خضر خاں : "میں جانا چاہتا بھی نہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ زیادہ زحمت اٹھائے بغیر آپ حضرات سے نیاز حاصل ہو گیا، اور یہی مقصد سفر تھا ———— شاید اس محافہ میں آپ کی صاحبزادی راجکماری دیول دیوی ہوں گی ————؟"

کرن سنگھ (مشتعل ہو کر) "ہاں، (تلوار نکال کر) تیرا مطلب؟"

خضر خاں ۔ (سنجیدگی اور متانت سے) "میں انہیں لینے آیا ہوں۔ ان کی ماتا جی رانی کنول دیوی نے انہیں یاد کیا ہے!"

دیول دیوی اور رادھا یہ باتیں تو نہیں سن پائیں کیونکہ ڈولا ذرا دور تھا۔ لیکن رادھا کی نظر جو خضر خاں پر پڑی تو جم کر رہ گئی۔

دیول دیوی نے اس کے ٹھوکا لگا کر کہا : "کیا دیکھ رہی ہے تو؟"

رادھا نے دعوتِ نظارہ دیتے ہوئے کہا :۔

"دیکھتی ہو کتنا خوبصورت جوان ہے، سچ، نگاہ نہیں ٹھہرتی چہرے پر حسین و جمیل بھی ہے اور وجیہ و باوقار بھی ۔ ایک یہ ہے موا نکھٹو گوبند پرشاد، کہاں آفتابِ عالمتاب کہاں ذرۂ بے مقدار !"

شاید ابھی وہ کچھ اور کہتی لیکن دیول دیوی نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا :۔

"اونہہ، تو نہ جانے کیا کہہ رہی ہے، میرا دل ہول رہا ہے، جانے یہ کون ہے اور کس قسم کی باتیں ہو رہی ہیں ۔ اگر کہیں لڑائی چھڑ گئی تو ؟"

رادھا بولی :۔

"ارے تم اتنی بہادر ہو کہ ڈر رہی ہو، لڑائی چھڑ گئی تو ہمارا کیا بگڑے گا ؛ مسلمان غالب آئیں یا راجکمار، کوئی بھی جیتے ہمیں نقصان نہیں پہنچا سکتا، لیکن نہ جانے کیوں میرا جی چاہتا ہے کہ یہ مسلمان نوجوان جیت جائے ——— !"

دیول دیوی نے کہا :۔

"اری پگلی ! دیکھتی نہیں گوبند پرشاد کے ساتھ دو ہزار مسلح سوار ہیں، اور اس نوجوان کے ساتھ مشکل سے دو ڈھائی سو سوار ہوں گے ۔ مجھے تو اب ان مسلمانوں کی خیریت نظر نہیں آتی !"

گوبند پرشاد اب تک خاموش تھا ۔ اس نے بادل کی طرح گرج کر کہا :۔

"تمہیں معلوم ہونا چاہئے، دیول دیوی سے میرا بیاہ ہو چکا ہے، اور میں اسے رخصت کرا کے اپنی راجدھانی لئے جا رہا ہوں ۔ اب وہ مہاراج کرن سنگھ کی بیٹی نہیں راج کمار گوبند پرشاد کی بیوی ہے تم نے بڑی گستاخانہ بات کی ہے، تمہاری سزا یہی ہے کہ تم سب کو ابھی قتل کر دیا جائے لیکن جاؤ میں معاف کرتا ہوں ۔ تم اپنی جان لے کر نکل جاؤ، ورنہ . . . . . ."

خضر خاں نے خاکسار ان گیدڑ بھبکیوں میں آنے والا نہیں ۔ مجھے اس سے کوئی بحث نہیں کہ

دیول دیوی کس کی بیوی ہے اور کس کی بیٹی، مَیں تو یہ جانتا ہوں کہ وہ دیول دیوی ہے، اور مَیں اس کام پر مامور ہوں کہ اپنی جان کی بازی لگا کر اُسے رانی کنول دیوی کے حضور میں پہنچادوں ——— بہتر یہ ہے کہ آپ ہٹ جائیں اور مَیں راجکماری کو لے جاؤں۔ ورنہ پھر لڑائی پر تیار ہو جائیے!"

گوبند پرشاد کو اس جرأت پر بڑی حیرت ہوئی۔ اس نے کہا:۔

"آپ لڑنا چاہتے ہیں؟ ——— کیا آپ دیکھ نہیں رہے ہیں کہ ہمارے پاس کتنے سپاہی ہیں اور آپ کے پاس کتنے؟"

خضر خاں:۔ "سپاہی کا کام افسر کے حکم کی تعمیل کرنا ہے، آپ کے ساتھ دو لاکھ سپاہی ہوتے تب بھی میں لڑنے میں تأمل نہ کرتا۔ یہ تو صرف دو ہزار ہیں، اور مجھے امید ہے جہاں ان پر حملہ ہوا، یہ تاب مقاومت نہ لاسکیں گے اور بھاگ کھڑے ہوں گے!"

کرن سنگھ:۔ "بیٹے گوبند پرشاد، کیا دیکھتے ہو۔ سپاہیوں کو حکم دو کہ حملہ کریں!"

گوبند پرشاد:۔ "ہاں پتا جی یہی کرنا پڑے گا۔ مَیں کشت و خون سے بچنا چاہتا تھا، لیکن یہ نوجوان اس پر تُلا ہوا ہے، کہ اپنی اور اپنے ساتھیوں کی گردن کٹائے تو مَیں کیا کرسکتا ہوں؟ ——— اب بھی موقع ہے، چلے جاؤ!"

خضر خاں:۔ "شکریہ! ——— مَیں ابھی چلا جاؤں گا اگر آپ دیول دیوی میرے حوالہ کردیں۔ لیکن بغیر اس کے نہیں!"

گوبند پرشاد:۔ "تم میری غیرت اور جواں مردی پر حملہ کر رہے ہو، اب معاملہ حد سے تجاوز کر چکا ہے ——— اگر لڑنا چاہتے ہو تو سامنے آجاؤ!"

خضر خاں:۔ "کیا لڑائی ہمارے سپاہیوں کے مابین ہوگی، یا صرف میرے اور آپ کے درمیان۔!

میں ہر طرح سے تیار ہوں!"

کرن سنگھ: "بکواس بند کرو، ہم سب لڑیں گے، ——— جوانو! ——— یہ مسلمان اس لئے آئے ہیں کہ تمہارے راجکمار گوبند پرشاد کو قتل کردیں اور اس کی لاڈلی اور نئی نویلی دلہن دیول دیوی کو چھین لے جائیں، کیا تم یہ بے غیرتی، یہ بے عزتی یہ بے شرمی برداشت کرسکتے ہو؟ جواب دو، بولو ———!"

یہ سنتے ہی تمام سپاہی ایک آواز ہو کر بولے:۔

"ہرگز نہیں، ہم خون کا دریا بہا دیں گے مگر یہ توہین نہیں برداشت کریں گے۔ یہ تو صرف تین سو ہیں، اگر تین لاکھ ہوتے تب بھی ہم انہیں یہیں جھونک دیتے، یہ اب بچ کر نہیں جا سکتے!"

کرن سنگھ: "تو پھر حکم کا انتظار نہ کرو، حملہ کردو ان کائروں (بزدلوں) پر!"

گوبند پرشاد: "ان میں سے ایک بھی زندہ بچ کر نہ جانے پائے!"

لڑائی شروع ہوگئی!

دیول دیوی سہمی ہوئی اپنے محافہ میں بیٹھی تھی۔ اس نے کانپتی ہوئی آواز میں رادھا سے کہا:

"اری سنتی ہے، یہ مسلمان مجھے لینے آئے ہیں، میرے لئے لڑائی ہو رہی ہے، ہائے بھگوان! اب کیا ہوگا؟ میری قسمت میں کیا لکھا ہے؟"

یہ کہتے کہتے دیول دیوی رونے لگی!

رادھا نے تسلی دی اور کہا:۔

"مہاراج کرن سنگھ اور راجکمار کی تقریروں سے تو یہی جان پڑتا ہے۔ لیکن یہ تمہیں لینے کیوں آئے ہیں؟ یہ بات کچھ سمجھ میں نہیں آتی! ——— کہیں سنجوگتا نے تو کوئی گل نہیں کھلایا؟"

دیول دیوی: "تو تو پاگل ہے اچھی خاصی! سنجوگتا غریب کیا کرسکتی ہے، نہ جانے وہ ماتاجی کے

پاس پہنچ بھی سکی یا نہیں ؛ نہ جانے ماتاجی زندہ بھی ہیں یا نہیں ؛ ضرور میرے رُوپ کا شہرہ پہنچا ہوگا، اور ــــــ ؟

رادھا ۔ "فکر نہ کرو، یہ مٹھی بھر مسلمان کچھ نہیں کر سکتے، دیکھ لینا!"

دیول دیوی ۔ (آنسو پونچھتے ہوئے) "یہ تُو نے کیسے جانا؟"

رادھا ۔ "یہ ہیں ہی کتنے ؛ ابھی مولی گاجر کی طرح کاٹ کر ڈال دیئے جائیں گے ۔ لڑائی شروع بھی ہو گئی ۔ بھگوان جو کچھ کرتا ہے اچھا کرتا ہے!"

فضا ہندوؤں کے جیکاروں اور مسلمانوں کے نعرۂ اللہ اکبر سے گونج رہی تھی ۔ وہ تین سو تھے اور یہ دو ہزار تھے ۔ لیکن صاف معلوم ہو رہا تھا وہ بڑھ رہے ہیں یہ ہٹ رہے ہیں ۔ اتنی ہی دیر میں گوبند پرشاد کے بہت سے سپاہی خاک و خون میں لوٹنے لگے!

اتنے میں گوبند پرشاد اور خضر خاں کا آمنا سامنا ہو گیا ۔ خضر خاں نے کہا:۔

"راجکمار! سپاہیوں کی جان کیوں لیتے ہو، آؤ ہمارے تمہارے دو دو ہاتھ ہو جائیں!"

گوبند پرشاد جان بچانا چاہتا تھا لیکن حریفِ مقابل کی للکار سُن کر اور اُسے اپنے سامنے دیکھ کر وہ جی نہ چرا سکا ۔ اس نے بڑا ہیاؤ کر کے تلوار کا ایک ہاتھ مارا، لیکن خضر خاں نے وار خالی دیا اور کہا:۔

"ہوشیار ــــــــ تُو ضربے زدی ضربِ من نوش کُن!"

یہ کہہ کر جو تلوار کا ایک جنچا تُلا ہاتھ مارا ہے کہ گوبند پرشاد اگر اپنے تئیں گھوڑے سے گرا نہ دے تو اس کے دو ٹکڑے ہو جائیں ۔ پھر بھی سر اور شانے پر کافی گہرا زخم آ گیا!

گوبند پرشاد کو گرتا دیکھ کر کرن سنگھ کی ہمّت بھی چھوٹ گئی اور وہ سامنے کی طرف سرپٹ بھاگا ۔ اسے بھاگتے اور گوبند پرشاد کو اپنے درمیان موجود نہ پا کر سپاہی بھی سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑے

ہوئے۔ خضر خاں دیول دیوی کے محافہ کے پاس آیا۔ اُس نے بڑی شائستگی اور اخلاق کے ساتھ کہا:

"راجکماری! میں بہت شرمندہ ہوں کہ لڑکر آپ کو لے جانا پڑ رہا ہے، لیکن شاید آپ یہ سُن کر خوش ہوں گی کہ آپ کی ماتاجی رانی کنول دیوی کے حکم سے میں آپ کو لینے آیا ہوں، اور کوئی مقصد نہیں ہے!"

یہ سنتے ہی دیول دیوی سارا غم بھول گئی، فرطِ مسرت سے چہرہ سُرخ ہوگیا اور بول پڑی:۔

"ماتاجی نے بلایا ہے مجھے؟ وہ زندہ ہیں؟"

خضر خاں: "ہاں وہ زندہ ہیں اور آپ کے لئے ماہیِ بے آب کی طرح تڑپ رہی ہیں! ——

کیا آپ گھوڑے پر چڑھ لیتی ہیں؟"

دیول دیوی نے محافہ سے اُترتے ہوئے کہا:۔

"بہت اچھی طرح —— !"

خضر خاں نے ایک اعلیٰ درجہ کا گھوڑا پیش کیا۔ راجکماری اس پر بیٹھ گئی، اور پھر تھوڑی دیر میں یہ قافلہ سبک سیر ہوا سے باتیں کرتا ہؤا دِلّی کی طرف روانہ ہوگیا!

رام دیو ــــــــ.....!

علاؤالدین کے دبدبہ اور طنطنہ سے بھارت ورش کا ایک ایک ذرہ بید لرزاں کی طرح کانپتا تھا۔ اس دیس کا وہ پہلا تاجدار تھا جس کا سکہ جنوب و مشرق اور شمال و مغرب میں چل رہا تھا، جس کا پرچم ہر قلعہ، ہر شہر اور ہر ریاست پر لہرا رہا تھا جس نے سرکشی کی وہ کہیں کا نہ رہا، جس نے سر اطاعت خم کر دیا، اسے دولت کونین مل گئی، دلی سے لے کر دکن کے آخری انتہائی حدود رامیشورم (پل آدم) تک خلجی کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ اور ہر طاقت اس کے سامنے ادب و احترام کے ساتھ خم ہونے پر مجبور تھی۔ لیکن کچھ جگہیں ابھی ایسی باقی تھیں جنہیں اب تک اپنی مایا پر، اپنے بل بوتے پر، اپنی دل بادل فوج پر بھروسہ تھا۔ اور انہوں نے خلجی کے سامنے سر اطاعت خم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ان میں ایک رنتھمبور تھا، ایک چتوڑ اور ایک دیوگری (دیوگڑھ)۔ ان تینوں میں سب سے زیادہ دور دست علاقہ دیوگری کا تھا، جو دکن کے دور دراز خطہ میں واقع تھا۔ خلجی نے یہ طے کر لیا تھا کہ وہ ان تینوں کو تسخیر کر کے رہے گا، اور جب تک یہ اس کی وفاداری کا دم نہ بھرنے لگیں، نہ خود چین سے بیٹھے گا نہ انہیں سکون و عافیت کی زندگی بسر کرنے کا موقع دے گا۔ رنتھمبور اور چتوڑ پر اگرچہ پوری تیزی اور

سرعت کے ساتھ حسب منشا حملہ ہو سکتا تھا، لیکن اس کی طبع دشوار پسند اس کی قائل ہی نہیں تھی کہ دشواری کو چھوڑ کر سہولت کا راستہ اختیار کیا جائے۔ اسے کانٹوں سے اُلجھنے میں جو مزہ آتا وہ پھولوں کی سیج پر نہیں آتا تھا۔ چنانچہ اس نے طے کر لیا کہ سب سے پہلے دیوگری کو فتح کیا جائے۔ چتوڑ اور رنتھمبور کی باری بعد میں آئے گی، اس کام کے لئے اس نے وسیع تر اختیارات دے کر اپنے چہیتے اور وفادار و جاں نثار غلام کافور کو ایک لشکر جرار کے ساتھ روانہ کیا۔ کافور شجاعت و شہامت کا پیکر تھا۔ دلیری اور جانبازی اس پر ختم تھی، اور حوصلہ اس کا جوہر تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ آقا کی نظر میں اتنا محبوب تھا۔ بڑے بڑے رؤسا اور امرا، اور خود خاندانِ شاہی کے بلند مرتبت اصحاب وہ منزلت خلجی کی نظر میں نہیں رکھتے تھے جو کافور کی تھی۔ آقا کے ادنیٰ اشارہ پر جان کی بازی لگا دینا اس کے لئے مایۂ فخر و سعادت تھا۔ بڑے سے بڑا خطرہ اور اندیشہ اس کی نظر میں کوئی وقعت نہیں رکھتا تھا۔ اسے نہ تو زندگی عزیز تھی نہ متاعِ دُنیا۔ فکر تھی تو صرف یہ کہ آقا کی مرضی پوری ہو۔ جو وہ چاہتا ہے وہ ہو جائے۔ خلجی نے کافور کی اس روح کو سمجھ لیا تھا اور پھر اس نے بھی اسے اپنے دل کا مکین بنا لیا تھا۔

راستہ دشوار گزار تھا، قدم قدم پر مشکلات حائل تھیں، مسافت دور دراز تھی۔ خطرہ اپنا بھیانک مُنہ کھولے ہر وقت سامنے موجود تھا، ہمراہانِ راہ پر بھی پورا اعتبار نہیں تھا۔ اس لئے کہ ان میں کافی وہ لوگ تھے جو اس کے عروج و ترقّی سے جلتے تھے۔ دل سے اس کی شکست و ہزیمت کے طالب تھے، خود ہار جانا منظور تھا اگر کافور کے حصّہ میں شکست آئے۔ خود مر جانا منظور تھا اگر کافور کی آنکھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کی جا سکیں۔ خود ذلّت اور ناکامی کی زندگی بسر کرنے پر تیار تھے اگر کافور کا عروج چھن جائے۔ اس کا وقار خاک میں مِل جائے۔ اس کی جاہ و منزلت کا خاتمہ ہو جائے، لیکن کچھ تو خلجی کی دہشت ــــ سب جانتے تھے اس کا انتقام

کتنا ہولناک ہوتا ہے ــــــــــ اور کچھ یہ بات کہ چلتے وقت خلجی نے جملہ اختیارات محرر کو تفویض کر دیئے تھے وہ سب کا حاکم تھا، سب اس کی اطاعت اور فرماں برداری پر مجبور تھے۔ کافور نے اس اقتدار سے پورا فائدہ اٹھایا، وہ دو دو منزلوں کی ایک ایک منزل کرتا، دونوں کی راہ گھنٹوں میں طے کرتا دیوگری کی طرف بڑھتا رہا۔ ندی نالے، دریا، پہاڑ، جنگل کوئی چیز بھی اس کے عزم صمیم میں تزلزل نہ پیدا کر سکی، اور بالآخر وہ راجہ رام دیو کے سر پر پہنچ گیا۔ یہ اتنی اچانک یورش تھی کہ ہر طرح کی تیاریوں کے باوجود راجہ گھبرا گیا۔ لیکن نہ اب سوچنے کا وقت تھا، نہ مشورہ کا۔ صرف دو باتیں اختیار میں تھیں، فرار یا جنگ۔ فرار پر اس کی خود دار طبیعت آمادہ نہ تھی، اور جنگ کے خواب تو وہ بہت دنوں سے دیکھ رہا تھا، اس نے جنگ کو اختیار کیا اور لڑائی شروع ہو گئی۔ ہولناک اور خوں ریز جنگ ــــــــــ لیکن جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ لڑائی کا فیصلہ مال و زر کی فراوانی اور سپاہ کی کثرت پر نہیں۔ صرف عزم و ہمت، جگرداری اور دلیری پر ہوتا ہے اور یہ جنس، رام دیو کے سپاہیوں کا کیا ذکر، خود رام دیو کے پاس ــــــــــ اب پتہ چلا ــــــــــ بہت کم تھی۔ آخر تاب مقاومت نہ دیکھ کر راجہ رام دیو نے عافیت اسی میں سمجھی کہ ہتھیار ڈال دے۔ حکومت اگر نہیں بچ سکتی تو کم از کم جان تو بچالے۔ کافور کو خلجی کی ہدایت کے ماتحت اس کی ذات سے کوئی کد نہ تھی، وہ صرف اکڑی ہوئی گردن میں خم دینے آیا تھا سو وہ مقصد پورا ہو گیا، پھر خلق خدا کا خون، ناحق وہ کیوں بہاتا؟ اور ہارے ہوئے دشمن کی جان لینے کا ارادہ کیوں کرتا؟ اس نے رام دیو کی استدعا منظور کر لی، اس کی جاں بخشی کی، اسے نوازش شاہانہ کا امیدوار بنایا اور کہا:۔

ملک کافور:" تمہاری باتوں سے خلوص کی بُو آتی ہے۔ تمہاری اطاعت میں سرکشی، بغاوت اور فریب کے جراثیم نظر نہیں آتے، ہم نے تمہاری جاں بخشی کی۔ لیکن ہم میں یہ قدرت نہیں کہ تمہارا راج بھی تمہیں واپس کر سکیں۔ یہ کام صرف بادشاہ عالی جاہ ہی کر سکتے ہیں۔ تم ہمارے ساتھ

دِلّی چلو، ہم بادشاہِ جمجاہ سے تمہاری سفارش کریں گے اور ہمیں اُمید ہے کہ وہ ضرور لطف و نوازش شاہانہ سے تمہیں شاد کام کریں گے!"

رام دیو۔ "فدوی کو معلوم ہے کہ جہاں پناہ آپ کا کتنا لحاظ اور خیال کرتے ہیں۔ مَیں آپ کے ساتھ دلّی چلنے پر تیار ہوں۔ مَیں نے دل سے اطاعت کی ہے اور قول دیتا ہوں کہ جب تک زندہ ہوں اطاعت سے مُنہ نہ موڑوں گا۔ اگر بادشاہ سلامت میرا راج پاٹ واپس کر دیں تو زہے قسمت، نہ واپس کریں تو شکایت کا کوئی موقع نہیں۔ مَیں ہار گیا، ہارے ہُوؤں کو تو موت ملتی ہے لیکن مجھے زندگی تو بہرحال بخش دی گئی، ــــــــ!"

کافور نے رام دیو کی دِل دہی کرتے ہوئے کہا:۔

"ہاں رام دیو! تم سچ کہتے ہو، لیکن ہم تمہیں پھر یقین دلاتے ہیں کہ جس طرح تمہاری زندگی تمہیں واپس ملی ہے، اسی طرح تمہارا راج پاٹ بھی ضرور واپس ملے گا۔ تم ہمارے بادشاہ سلامت کی اُفتادِ مزاج سے ناواقف ہو۔ بے شک، وہ اکڑی ہوئی گردن کو ایک ہی جھٹکے میں توڑ دیتے ہیں لیکن جھکی ہوئی گردن کو گرم جوشی اور شفقت کے ساتھ سینہ سے لگاتے ہیں، اور اسے وُہ سب کچھ دے دیتے ہیں جس کی وہ متمنّی ہوتی ہے، ــــــــ بلکہ اس سے بھی زیادہ! ــــــ

ہاں تو تم ہمارے ساتھ دلّی چلو گے؟ خوب سوچ لو ہم کسی طرح کا جبر و جور نہیں کرتے، تمہاری جاں بخشی ہو چکی ہے، تم جہاں چاہو جا سکتے ہو بلکہ حفاظت اور احتیاط کے ساتھ پہنچا دیئے جاؤ گے، لیکن اگر چلنا چاہتے ہو تو چلو، فائدہ اسی میں ہے!"

رام دیو۔ "مَیں چلوں گا، سر کے بل چلوں گا۔ اگر میرا راج پاٹ نہ ملا، تو بھی کوئی غم نہیں۔ جو چیز اپنی نہ رہے، پھر اس کے نہ ملنے کا غم نہیں ہوتا، لیکن کم از کم بادشاہ سلامت کے درشن تو ہو جائیں گے، فدوی اسی کو اپنی خوش قسمتی سمجھے گا!"

کافور نے واپسی کی تیاریاں شروع کردیں اور اس گفتگو کے تیسرے ہی دن دیوگڈھ (دولت آباد) کا انتظام درست کرکے اور یہاں احتیاطاً فوج کا ایک معقول حصّہ چھوڑ کر دلّی کی طرف روانہ ہوگیا ——— مالِ غنیمت سے لدے چھکڑے ساتھ تھے۔ سپاہیوں میں سے ہر شخص فخر و مسرت کے جذبے سے سرشار تھا، خود کافور بھی دل میں بہت خوش تھا: اسے بہت بڑی مہم سونپی گئی تھی بلکہ دراندازوں اور چھپے ہوئے دشمنوں نے صرف اس اُمید میں اس مہم پر اس کا جانا گوارا کرلیا تھا کہ اب وہ زندہ سلامت نہیں آئے گا۔ لیکن انسان اپنی ہی سوچتا رہ جاتا ہے، اور ہوتا وہ ہے جو خدا چاہتا ہے۔ دشمنوں اور دراندازوں نے جو سوچا تھا، جو چاہا تھا، وہ نہ ہُوا۔ خدا کی مشیت پوری ہو کر رہی۔ یہ کامیابی آئندہ کی کامرانیوں کا پیش خیمہ تھی۔ اپنا روشن اور تابناک مستقبل اس صفائی اور وضاحت کے ساتھ کافور کو نظر آرہا تھا جس طرح دن کی روشنی، جس طرح اپنے زندہ ہونے کا احساس، جتنا سورج کے وجود کا یقین۔ اسے یقین تھا اور بجا طور پر یقین تھا کہ اب اس کی ترقی اور عروج کا آفتاب نصف النّہار پر پہنچے گا، راستہ کی تمام رُکاوٹیں دُور ہوگئیں، اب وہ ہے اور کامیابی و کامرانی کے زینے، وہ ان زینوں پر چڑھے گا اور وہاں تک پہنچ جائے گا جہاں اب تک کوئی ——— غلام ——— نہ پہنچ سکا تھا ——— اور یہ بات کچھ غلط بھی نہ تھی۔ مستقبل نے اپنے دروازے اس کے لئے کھول دیئے اور وہ کامرانیوں کی انتہائی بلندیوں پر پہنچ گیا۔

رام دیو کو صرف یہ امید دلّی لئے جا رہی تھی کہ شاید خلجی کی نگاہِ کرم اسے خاک سے پاک کر دے، اسی اُمید نے اتنا بڑا خطرہ مُول لینے پر آمادہ کردیا تھا، کہ دلّی جائے اور اس بادشاہ کے سامنے پیش ہو جس کی نگاہِ غضب آتشِ جہنّم سے کم نہیں، اور جس کی نگاہِ کرم ذرّہ کو آفتاب بنا دینے کی طاقت بھی رکھتی ہے، ——— خود اس کے نصیب میں کیا ہے؟ ——— نگاہ

غضب یا نگاہِ کرم ؟ اس کا جواب دل کی دھڑکن کے پاس نہ تھا ! ـــــ

آخر کار کافور نے دلّی کی سرزمین پر قدم رکھا۔ یہاں اس کا شاہانہ استقبال کیا گیا خود علاء الدین خلجی نے اس استقبال میں شرکت کی، اپنے کارگزار اور وفادار غلام کو گلے سے لگایا، اس کا مرتبہ بڑھا، اسے انعام دیا، اس کے منصب میں اضافہ کر دیا۔ کافور نے رام دیو کا تعارف بھی کرایا۔ خلجی نے اس پر ایک نگاہ ڈالی اور کافور سے مخاطب ہو کر کہا :-

"کل اسے دربار میں ہمارے سامنے پیش کیا جائے !"

رام دیو کو ایک شاندار محل میں ٹھہرایا گیا۔ اس کے آرام و آسائش کا شاہانہ طور پر بندوبست کیا گیا، اس کے لئے کھانا رانی کنول دیوی کے محل سے پک کر آیا جس کی تیاری میں دیول دیوی بھی برابر کی شریک تھی، غرض بظاہر رام دیو کے اجلال و احترام میں کوئی کمی نہ تھی۔ پھر بھی کل کے خیال سے اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا، نیند آنکھوں سے غائب تھی۔ کروٹوں پر کروٹیں بدلتا تھا۔ بار بار آنکھیں بند کرتا تھا، خیالات کو یکسو کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ خوف اور دہشت کو دل سے دُور کرنے کی جدوجہد کرتا لیکن علاء الدین کا باجبروت اور بارعب چہرہ بار بار اس کی آنکھوں میں گھومنے لگتا تھا۔ یہ چہرہ اس کی نظروں میں بس گیا تھا۔ اس کا بس چلتا تو آنکھیں بند کر لیتا، لیکن تصوّر کی آنکھیں اندھا بھی بند کرنے کی قدرت نہیں رکھتا، نہ جانے کیا بات تھی، اس شاہانہ چہرہ میں ـــــ وہ سوچتا تو محسوس کرتا، غضب، نفرت اور انتقام کی شکنیں تو نہیں تھیں ؟ ـــــ دل کہتا، ـــــ نہیں، ـــــ ایسی کوئی بات نہ تھی۔ نہ آنکھوں میں بجلیاں کوند رہی تھیں، نہ رخسار و پیشانی پر برہمی کے آثار تھے ! ـــــ اور شفقت اور عنایت ؟ ـــــ نہیں وہ بھی نہیں، شفقت کی نگاہ اور عنایت کے انداز چھپائے نہیں چھپتے ـــ

کہیں چھپتی ہے محبت کی نظر، پیار کی آنکھ؛

شفقت و عنایت کا سیلِ رواں نہ وقت دیکھتا ہے نہ مصلحت، اگر بادشاہ سلامت مہربان ہوتے تو کچھ کلمات تو ارشاد فرماتے؛ لیکن اُنہوں نے کچھ نہ کہا، چپ رہے، صرف اتنا فرمایا — "کل دربار میں پیش کرو!"

ہے بھگوان، دربار میں کیا پیش آئے گا؛

اسی قسم کے خیالاتِ پریشان میں ساری رات گزر گئی۔ سپیدۂ صبح نمودار ہوا۔ مسجدوں سے اذانوں کی دلکش آوازیں آنے لگیں۔ رام دیو بستر سے اُٹھ بیٹھا۔ جلدی جلدی اس نے پوجا پاٹ سے فراغت کی اور کافور کا انتظار کرنے لگا، کہ دیکھئے وہ کب آتا ہے؛ اور کب بادشاہ سلامت کے دربار میں پیش کرتا ہے اور وہاں کیا گزرتی ہے؟

انتظار کی گھڑیاں واقعی بڑی سخت ہوتی ہیں۔ کافور جلد ہی آ گیا۔ لیکن رام دیو کو ایسا معلوم ہوا جیسے وہ صدیوں بعد آیا ہے۔ اسے دیکھ کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور اس نے پریشان لب و لہجہ میں کہا:۔

"دیر سے آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔ بڑی دیر کر دی آپ نے تشریف لانے میں۔ کہیں اس تاخیر پر بادشاہ سلامت خفا نہ ہو جائیں۔ ان کی برہمی کی کون تاب لا سکتا ہے بھلا؟"

کافور ہنسنے لگا۔ اس نے کہا:۔

"راجہ صاحب! آپ بہت پریشان نظر آتے ہیں، آخر کیا بات ہے؟ میں ٹھیک وقت پر آیا ہوں۔ آپ ذرا بھی تاخیر سے دربارِ شاہی میں نہیں پہنچیں گے۔ ٹھیک وقت پر اعلیٰ حضرت کے سامنے پیش کر دیئے جائیں گے!"

رام دیو نے ان باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا، وہ چپ چاپ کافور کی باتیں سنتا رہا۔ پھر اس نے کہا:— "تو چلئے یہاں بیٹھے رہنے سے کیا حاصل؟"

کافور نے مسکراتے ہوئے کہا:۔

"ہاں چلتے ہیں، لیکن پہلے دربارِ شاہی کے آداب تو سیکھ لیجئے! آپ دُنیا کے سب سے بڑے شہنشاہ کی خدمت میں جا رہے ہیں۔ اس کے سامنے آپ تو کیا، بڑے بڑے کشور کشا اور تاجدار لرزتے اور کانپتے ہوئے حاضر ہوتے ہیں۔ کیا مجال جو آدابِ شاہی کے خلاف یا آدابِ دربار کے خلاف کوئی بات سرزد ہو جائے!"

رام دیو۔ "ہاں مجھے اس کا احساس ہے! ـــــ لیکن اگر بدحواسی کے عالم میں کوئی غلطی ہو جائے کیا جب بھی معافی نہیں ملتی؟"

ملک کافور:۔ "ہمارے بادشاہ سلامت غلطی ہمیشہ معاف کر دیتے ہیں، ناقابلِ معافی جرم صرف ایک ہے ـــــ بغاوت، سرکشی، فریب ـــــ بالکل مطمئن رہئے، آپ کو کسی طرح کا گزند نہیں پہنچ سکتا، ـــــ!"

دلدہی کی ان باتوں سے بیچارے رام دیو کی جان میں جان آئی، اس کے پژمردہ چہرہ پر شگفتگی کے آثار نمودار ہوئے۔ اس نے سکون اور اطمینان کے ساتھ کہا:۔

"بادشاہ کی یہی شان ہے۔ بادشاہ کو ایسا ہی ہونا چاہئے، آپ نے میرے مضطرب دل کو مطمئن کر دیا، اب میرے دل میں کوئی اندیشہ نہیں، اب میں مطمئن ہوں، ہاں بتائیے، دربار میں حاضر ہونے کے آداب کیا ہیں؟ ـــــ لیکن آپ بھی تو میرے ساتھ چلیں گے؟"

کافور ہنس پڑا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا:۔

"راجہ صاحب! آپ پر دہشت پھر طاری ہونے لگی۔ میں آپ کا میزبان ہوں، آپ میرے مہمان ہیں، آپ نے میرے دامن میں پناہ لی ہے۔ میں نے آپ کے کچھ وعدے کئے ہیں۔ کیونکر ممکن ہے کہ آپ کو یکہ و تنہا بے یار و مددگار چھوڑ دوں؟ ـــــ سچ بتائیے، آپ مطمئن ہیں

یا اب بھی پریشان ہیں ؟"

رام دیو نے مطمئن لہجہ میں جواب دیا:۔

"آپ کی باتوں سے میری دہشت دُور ہو چکی ہے، لیکن بادشاہ کی دہشت اتنی ہمہ گیر اور عالمگیر ہے کہ جا جا کر لوٹ آتی ہے، اور کوئی بات نہیں!"

کافور اور رام دیو دونوں ہنسنے لگے۔ پھر کافور نے رام دیو کو شاہی دربار کے جملہ آداب و رسوم سکھائے اور وقتِ مقررہ پر وہ اسے لے کر قصرِ شاہی کی طرف روانہ ہو گیا۔

علاء الدین کا دربار علاء الدین کا دربار تھا۔ اس دربار کی ہیبت اور جلالت کا واقعی یہ عالم تھا کہ جو آتا تصویرِ حیرت بن کر رہ جاتا۔ کسی میں مجال نہ تھی کہ گفتگو کا آغاز کر سکے۔ کسی میں یارانہ تھا کہ بادشاہ کو نظر بھر کر دیکھ سکے۔ کسی میں یہ تاب نہ تھی کہ بادشاہ کی بات دکھل سکے۔ دربار سرداروں، امیروں اور وزیروں سے بھرا ہوا تھا۔ تختِ حکومت پر شکوہ و عظمت کا پیکر بنا علاء الدین متمکن تھا۔ حاضرین کے سر جھکے تھے، اور سارے دربار پر مرگ سا سنّاٹا چھایا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، یہ جو لوگ دربار میں حاضر ہیں، جاندار انسان نہیں، بے جان مجسمے ہیں، نہ نقل و حرکت کر سکتے ہیں، نہ آنکھ سے کام لے سکتے ہیں، نہ زبان سے۔

رام دیو، علاء الدین کے سامنے خاموش کھڑا تھا، دربار کی عام فضا نے پھر اس پر دہشت اور سراسیمگی کی کیفیت طاری کر دی تھی، چہرہ ستا ہوا تھا، بالکل سفید پڑ گیا تھا جیسے خون کا ایک قطرہ بھی نہ ہو!

علاء الدین نے آنکھ اٹھا کر کافور کی طرف دیکھا، کافور آگے بڑھا، اور اس نے دست بستہ عرض کیا:۔

"ظلّ اللہ! یہ رام دیو ہے، دیوگڑھ (دولت آباد) کا راجہ، اسے غرور تھا کہ خوف وطاقت میں

اس کا کوئی حریف نہیں، اسے ناز تھا، اس کی فوج سے کوئی بڑی سے بڑی فوج بھی لڑ کر جیت نہیں سکتی۔ اسے دعویٰ تھا کہ اس کا خاندان ہمیشہ سے حکومت کرتا آیا ہے اور ہمیشہ حکومت کرتا رہے گا اس کا خیال تھا کہ اس کی دولت ہر چیز کو خرید سکتی ہے حتیٰ کہ قسمت کو بھی ——"

دفعتہً علاء الدین خلجی کی آواز فضا میں گونجی :-

"لیکن ہُوا کیا؟ —— کیا واقعی وہی جو اس نے سوچا تھا؟"

ملک کافور :- "نہیں ظلِ اللہ —— !"

علاء الدین خلجی :- "تو ہم تفصیل سُننا چاہتے ہیں !"

ملک کافور :- "سلطانِ دوران شہنشاہِ عالم ظلِ اللہ علاء الدین خلجی نے اپنے ایک حقیر غلام کافور کو سرکوبی کی خدمت پر مامور کیا۔ وہ گیا، اور اس نے اپنے آقائے نامدار کے طفیل میں یہ مہم بڑی آسانی سے سر کر لی، اس وقت جہاں پناہ کے سامنے جو شخص کھڑا ہے یہ وہی راجہ ہے !"

علاء الدین خلجی :- "جنگ ہوئی ؟"

ملک کافور :- "ظلِ اللہ جنگ ہوئی اور زور شور سے ہوئی !"

علاء الدین خلجی :- "پھر کیا نتیجہ رہا ؟"

ملک کافور :- "جنگ اگر جاری رہتی تو راجہ رام دیو شکست کھاتا، لیکن اس نے عقلمندی سے کام لیا۔ شکست کے آثار دیکھ کر شکست تسلیم کر لی۔ زندگی بھر جاں نثار اور وفادار رہنے کا عہد کیا، اور خود اصرار کر کے جمالِ جہاں آرا کے درشن کرنے یہاں حاضر ہو گیا !"

علاء الدین خلجی :- "گویا رام دیو نے ہتھیار ڈال دیئے اور اطاعت قبول کر لی !"

ملک کافور :- "ظلِ اللہ! ایسا ہی ہُوا —— غلام نے نہ صرف اس کی جاں بخشی کی بلکہ اسے یہ امید بھی دلائی کہ اگر وہ دلّی چلے گا تو ضرور بادشاہِ عالم پناہ کی بندہ پروری اور ذرہ نوازی سے

بہرہ ور ہوگا !"

علاء الدین خلجی :- "رام دیو تم کیا چاہتے ہو؟ ——— ہم سے کس سلوک کے متوقع ہو؟ تمہاری تمنا کیا ہے؟ بتاؤ وہ پوری ہوگی !"

رام دیو :- "جس طرح ملک کافور جہاں پناہ کے غلاموں کے زمرہ میں شامل ہیں، بڑی عزت افزائی ہوگی اگر فدوی کو بھی اس زمرہ میں شریک کر لیا جائے، اس کے لئے اس سے بڑھ کر فخر و سعادت کی کوئی بات نہیں ہو سکتی کہ حلقۂ غلامی گلے میں ڈالے، اور ساری زندگی اپنے آقا کی خدمت میں گزار دے !"

ان الفاظ نے علاء الدین خلجی کے دل پر اثر کیا۔ اس نے شفقت بھری نظروں سے رام دیو کو دیکھا، اور اثر انگیز لہجہ میں کہا :-

"نہیں رام دیو! ایسا نہ کہو، تم غلام نہیں ہمارے بھائی ہو! ہم جنگ اس سے کرتے ہیں جو لڑنا چاہے۔ قوت اسی کی توڑتے ہیں جو ٹکرانے کا جذبہ رکھتا ہو۔ سرکوبی اسی کی کرتے ہیں، جس سے خطرہ ہو، تم نے اطاعت قبول کر کے اپنے آپ کو بے ضرر بنا لیا ہے۔ تمہارے ساتھ کوئی ناروا برتاؤ نہیں کیا جا سکتا، وہی برتاؤ کیا جائے گا جس کے تم مستحق ہو !"

رام دیو :- "جہاں پناہ! فدوی نے اپنے آپ کو جس کا مستحق سمجھا وہ عرض کر دیا۔ باقی رہی مرضئِ ہمایونی، سو جہاں پناہ جو فیصلہ بھی فرما دیں گے وہ دل و جان سے قبول ہوگا !"

علاء الدین خلجی :- "تم اب کہاں رہنا چاہتے ہو؟"

رام دیو :- "دلّی میں ——— بادشاہ سلامت کے زیر سایہ !"

علاء الدین خلجی :- "نہیں، تم دیوگڑھ (دولت آباد) واپس جاؤ وہاں بھی ہمارے زیر سایہ ہی رہو گے !"

رام دیو :- "فدوی عرض کر چکا، جہاں پناہ کے حکم کی تعمیل اس کا سب سے بڑا فریضہ ہے لیکن ——— !"

علاءالدین خلجی: "ہاں کہو، جو کچھ کہنا چاہتے ہو کہہ ڈالو، دیوگڑھ جانے میں تمہیں تأمل ہے کچھ؟"

رام دیو: "اگر جہاں پناہ فدوی کو دلّی میں رہنے کی اجازت نہیں دینا چاہتے، تو کسی اور شہر میں بھیج دیں، ——— میں دیوگڑھ جانا نہیں چاہتا!"

علاءالدین خلجی: "آخر کیوں؟ ——— تم دیوگڑھ سے اتنے بیزار اور بددل اور شکستہ خاطر کیوں نظر آتے ہو؟"

رام دیو: "کل تک جس دیس پر فدوی نے حکمرانی کی، اب وہاں ایک عام شہری کی طرح جاتے اور رہتے ہوئے لاج آتی ہے، ان داتا ——— بس اور کوئی بات نہیں!"

علاءالدین خلجی: "عام شہری کی طرح؟ ——— تم کیا کہہ رہے ہو رام دیو، ہم تمہیں ایک عام شہری کی طرح تو واپس نہیں بھیج رہے ہیں، وہاں کا راج پاٹ ہم پھر تمہیں عطا کرتے ہیں، (مسکرا کر) کیا اب بھی تمہیں جانے میں تأمل ہے؟"

رام دیو: (بے حد متاثر ہو کر) "جہاں پناہ ——— اَن داتا! ——— یہ میں کیا سُن رہا ہوں؟"

علاءالدین خلجی: "وہی جو ہم کہہ رہے ہیں؟"

رام دیو: "یہ بات تو فدوی نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچی تھی کہ ہاری ہوئی بازی پھر بھی جیتی جا سکتی ہے!"

علاءالدین خلجی: "کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے، ——— جب تک تم ہمارے دشمن تھے ہم نے بھی کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی، لیکن جب تم نے دوستی، خلوص اور اطاعت کا پیمان باندھ لیا، تو کیونکر ممکن تھا کہ ہم تمہارے ساتھ فیاضانہ اور روادارانہ برتاؤ نہ کرتے؟ ——— پھر یہ بھی تو سوچو تمہارا معاملہ ایک مسلمان بادشاہ سے پڑا ہے!"

رام دیو: "جہاں پناہ! اَن داتا!"

علاء الدین خلجی ۔ "اور ہمارا اسلام ہرگز اس کی اجازت نہیں دیتا کہ کسی پر ظلم کیا جائے بلکہ وہ تاکید کرتا ہے کہ کمزور، ناتواں اور شکست خوردہ حریف کے ساتھ اچھے سے اچھا برتاؤ کیا جائے، اتنی بڑی سعادت ہم اپنے ہاتھ سے کیسے جانے دیتے کہ اسلام کے ایک فرمان پر عمل کرنے کا موقع ہاتھ آئے اور ہم اسے رائیگاں کردیں!"

رام دیو "بے شک، بے شک ۔۔۔۔۔ فدوی کے پاس اُیسے الفاظ نہیں ہیں جو اس کے جذبات کی ترجمانی کرسکیں۔ لیکن اگر اجازت ہو تو ایک مرتبہ فدوی پھر عرض کرنا چاہتا ہے، ۔۔۔"

علاء الدین خلجی ۔ "ہم بڑی توجہ سے سُن رہے ہیں۔ شوق سے کہو جو کچھ کہنا چاہتے ہو!"

رام دیو "یہ کہ فدوی جب تک زندہ ہے اپنے آقا کے پسینہ پر خون بہانا اپنا سب سے بڑا کارنامہ سمجھیگا!"

علاء الدین خلجی ۔ "ہمیں تم سے یہی امید ہے!"

رام دیو "غلام کی تمنا ہے کہ جس طرح دوسرے جاں نثاروں کو خدمت کا موقع دیا جاتا ہے، اسے بھی کبھی کوئی مُہم سونپی جائے!"

علاء الدین خلجی "ممکن ہے ایسا موقع بھی کبھی آئے! ۔۔۔۔۔ اور ہمیں یقین ہے جیسا ہم نے تمہیں سمجھا ہے ویسے ہی تم ثابت ہوگے!"

پھر علاء الدین خلجی ملک کافور کی طرف متوجہ ہوا اور کہا :۔

"ہم چاہتے ہیں شکست اور ذلت کا داغ رام دیو کے ماتھے سے دُھل جائے!"

ملک کافور "جہاں پناہ کی ہر خواہش اس لئے ہے کہ پوری ہو، جہاں پناہ کے لب تک وہی بات آتی ہے، جو خدا کی مشیت ہو!"

علاء الدین خلجی "ایک ہفتہ تک رام دیو کی شاہی پیمانہ پر دعوت کی جائے!"

ملک کافور "ارشادِ ہمایونی کی تعمیل ہوگی!"

علاء الدین خلجی ،" ہم نے رام دیو کو رائے رایاںؒ کا خطاب مرحمت فرمایا!"

ملک کافور ،" رام دیو کی اس سے بڑھ کر عزت افزائی نہیں ہو سکتی!"

علاء الدین خلجی ،" یہی نہیں، ہم اسے چترِ سفید سے بھی سرفراز فرماتے ہیں، یہ وہ اعزاز ہے جو صرف خاندانِ شاہی کے لوگوں کو حاصل ہوتا ہے، وہ بھی ہماری اجازت سے!"

ملک کافور ،" اس سارے دربار میں آج رام دیو سے بڑھ کر محسود کوئی نہیں۔ یہ اتنا بڑا اعزاز ہے جس پر وہ تا زندگی فخر کرے گا!"

رام دیو ،" ہاں ——— صرف رام دیو ہی نہیں، اس کی آنے والی نسلیں بھی، رام دیو کا سارا خاندان اسے طغرائے فخر و امتیاز سمجھے گا!"

علاء الدین خلجی ،" گجرات کا علاقہ تو سارا ہی ہم رام دیو کو عطا کرتے ہیں۔ آئندہ سے وہ دیوگڑھ کا ایک حصّہ ہو گا ——— کیوں رام دیو تم خوش ہو؟ اب تمہارے دل میں کسی طرح کی خلش تو نہیں؟"

رام دیو ،" اَن داتا خلش تو پہلے بھی نہیں تھی۔ میں نے جو کچھ کیا تھا اس کا پھل پایا تھا۔ نہ لڑتا، نہ ہارتا۔ دُنیا کا قاعدہ یہی ہے کہ ہارے ہوئے کو کچل دیتے ہیں، تباہ کر دیتے ہیں، برباد کر ڈالتے ہیں، زندہ رہنے کا حق اس سے چھین لیتے ہیں۔ لیکن اس دربار میں آ کر معلوم ہوا کہ نہیں ایک دُنیا اَور بھی ہے جہاں ایسا نہیں ہوتا، جہاں ٹوٹے ہوئے دل جوڑے جاتے ہیں، جہاں ناکامی کے زخموں پر کامرانی کا مرہم لگایا جاتا ہے، جہاں مایوسوں کو آس عطا کی جاتی ہے، جہاں کمزوروں اور ناتوانوں کو کس اور بل بخشا جاتا ہے، جہاں ہارے ہوؤں کی جھولی میں صرف وہی نہیں ڈال دیا جاتا جسے وہ ہار چکتے ہیں بلکہ جیتنے والا اپنی طرف سے بھی پُن اور دان کے طور پر بہت کچھ ڈال دیتا ہے، ——— اَن داتا آپ آدمی نہیں اوتار ہیں، بھگوان ہیں، یہ کام آدمی کا نہیں

بھگوان ہی کا ہوسکتا ہے !"

علاء الدین خلجی : " نہیں ایسا نہ کہو ، رام دیو یہ تمہاری غلطی ہے بھول ہے ، ہم بھی تمہاری طرح ایک آدمی ہیں ، نہ اوتار ہیں نہ بھگوان ۔ ہم میں اور دوسرے بادشاہوں میں فرق جو کچھ ہے وہ یہ ہے کہ وہ نفس کے محکوم ہیں ، ہماری گردن خدا کے سامنے جھکی ہوئی ہے ۔ ہم جانتے ہیں ، دولت آنی جانی چیز ہے ، حکومت آج ہمارے پاس ہے کل کسی اور کے پاس ہوگی ۔ اقتدار و اختیار کی باگ کسی اور کے ہاتھ سے ہمارے ہاتھ میں آئی ہے اور ہمارے ہاتھ سے کسی اور کے ہاتھ میں جائے گی " تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ " اس عالم رنگ و بو کا کارخانہ اسی طرح چلتا ہے ، اور تاقیام قیامت چلتا رہے گا ۔ یہ زمین ، یہ حکومت ، یہ بادشاہت ، یہ سب کچھ خدا کے لئے ہے اور خدا کی ہے ۔ ہم خدا کے حقیر اور گنہگار بندے ہیں ، اور خدا کا حکم یہ ہے کہ جو عزت والے ہوں انہیں ذلیل نہ کیا جائے ، جو ہار چکے ہوں ان کا دل نہ توڑا جائے ، جن سے مذہب اور دین کا اختلاف ہو ان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ رواداری اور فیاضانہ برتاؤ کیا جائے ، ہم اگر مسلمان ہیں تو یہ سب کچھ کرنے پر مجبور ہیں ، ——— اچھا اب تم جا سکتے ہو ! "

رام دیو ادب کے جانے کے لئے مڑا[1] اور آہستہ آہستہ دربار سے باہر چلا گیا ۔ اس کے جانے کے بعد علاء الدین نے ملک کافور سے کہا :۔

" رام دیو کی مہمانداری میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا جائے ! ——— اور ہاں زاد سفر کے طور پر ایک لاکھ تنکہ بھی دے دیا جائے تاکہ وہ اطمینان سے اپنی راجدھانی تک پہنچ جائے ! "

[1] اس راجہ نے تمام عمر علاء الدین کی اطاعت اور وفاداری سے گردن وفا سے قدم باہر نہ نکالا (تاریخ فرشتہ ۳۹۰)

وہ کتنے اچھے ہیں!

رام دیو بڑی شان وشوکت کے ساتھ رخصت ہُوا۔ چترِ سفید اور سراپردہ کی جنبش نے اس کی منزلت عوام کی نظروں میں بڑھا دی تھی، اور خود اس کا بھی حوصلہ بلند ہو گیا تھا۔ وہ اب ایک شکست خوردہ تاجدار نہیں تھا، بلکہ شہنشاہِ ہندوستان کا رفیق و دمساز تھا۔ دِلّی والوں نے اس کی آمد سے اتنی دلچسپی نہیں لی تھی جتنی اس کے رخصت ہونے سے۔ آیا اس طرح تھا کہ چہرہ فق، حواس منتشر، امید و بیم کا عالم، ماضی کی یاد، مستقبل سے یاس، اور جا اس طرح رہا تھا کہ چہرے پر تازگی اور بشاشت، دل نئی نئی امنگوں اور آرزوؤں سے معمور، ماضی فراموش، حال پُر امید، مستقبل درخشاں، پہلے ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا تھا دیکھئے اب پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟ اور اب ہراس کا دَور ختم ہو چکا تھا، نئے نئے ولولے دل کے نہاں خانہ میں انگڑائیاں لے رہے تھے!

—— رام دیو نے جب دِلّی کی سرزمین پر قدم رکھا تھا تو لوگوں نے اسے نگاہِ عبرت سے دیکھا تھا اور اب جب وہ شاہانہ تزک و احتشام کے ساتھ اپنی راجدھانی کی طرف واپس جا رہا تھا، تو رشک و حسد کی نگاہیں اس کا تعاقب کر رہی تھیں!

دیول دیوی دِلّی پہنچ چکی تھی۔ ماں کی آغوش میں پہنچ کر وہ اپنی ساری کلفتیں بھول چکی تھی۔

؎ ملتے ہی ان کے بھول گئیں کلفتیں تمام
گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا

کرن سنگھ کی خود غرضیاں اور نام نہاد شوہر کی ہوس پرستیاں اِس گہوارۂ عیش وعشرت میں وُہ یکسر فراموش کر چکی تھی۔ ماں سے جُدائی کا یہ سارا زمانہ اس نے دل ہی دل میں رہتے روتے گزارا تھا کبھی زندگی سے نفرت، کبھی خود کشی کی اسکیمیں لیکن اب زندگی اسے محبوب تھی۔ وہ زندہ رہنا چاہتی تھی۔ نشاط ومسرّت کی زندگی بسر کرنا چاہتی تھی، اب اسے کوئی فکر نہیں تھی۔ کوئی اندیشہ نہیں تھا کسی طرح کا خوف نہیں تھا، اب وہ ہر بندے سے آزاد تھی۔ نہ کرن سنگھ کی خود غرضیاں اس کا کچھ بگاڑ سکتی تھیں، نہ ہوس پرست شوہر کی ہوس پرستیوں کا کوئی اسے خوف تھا، دونوں کی دسترس سے وہ بلند تھی ——— بے پروا تھی!

دیول دیوی اطمینان سے محل کے جھروکے میں بیٹھی آیند وروند کا نظارہ کر رہی تھی۔ رادھا اور سنجوگتا بھی پاس ہی موجود تھیں۔ سامنے میں رام دیو کی سواری شاہانہ شان وشوکت کے ساتھ ادھر گزری۔ رادھا نے اسے توجہ دلاتے ہوئے کہا:۔

"دیکھئے راجکماری یہ ہے رام دیو۔ آپ کا بڑا جی چاہ رہا تھا نا اسے دیکھنے کا؟"

دیول دیوی اشتیاق کی نظروں سے رام دیو کی طرف دیکھنے لگی:۔

"ارے یہ ہے رام دیو، یہ تو بڑا خوش نظر آتا ہے جیسے کوئی بہت بڑی دولت مل گئی ہو اسے! سنجوگتا کہنے لگی:۔

"مل تو گئی ہے دولت، چھنا ہوا راج پاٹ واپس مل گیا۔ اس سے بڑی دولت کیا ہوگی، بلکہ میں نے تو سُنا ہے، ایک اَور نیا علاقہ بھی خود شہنشاہ نے اسے عطا کیا ہے۔ کیوں رادھا؟"

رادھا نے جلوس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:۔

"ہاں سُنا تو میں نے بھی ہے۔ دیکھو تو کتنا خوش ہے۔ چہرہ بتلائے دے رہا ہے سب کچھ،— اور ہمارے ایک مہاراج تھے، اگر اُنھوں نے بھی شہنشاہ سے دوستی کر لی ہوتی تو آج وہ اور ہم سب کتنے مزے میں رہتے! نہ ذلتیں اُٹھانا پڑتیں، نہ پریشان ہونا پڑتا، نہ در در کی خاک چھاننا پڑتی۔ نہ دوسروں کے ہاں پناہ گزین ہونا پڑتا، وہی راج پاٹ ہوتا، وہی دولت کی ریل پیل ہوتی، وہی اقتدار، اختیار رہتا، وہی شان و شوکت ہوتی!"

سنجوگتا نے بھی گرہ لگائی:۔

"ہمارے مہاراج اگر دلی آتے تو بات ہی اور ہوتی۔ یہ رام دیو اُن کے سامنے کیا ہے؟ کہاں وہ، کہاں یہ، ان کی ٹکر کا تھا کون ہمارے دیس میں؟ اور رام دیو جیسے راجہ مہاراجہ تو نجانے کتنے پڑے ہوں گے؟"

جلوس اب تک نکل رہا تھا اور دیول دیوی ٹکٹکی لگائے اس کو دیکھ رہی تھی۔ لیکن وہ رادھا اور سنجوگتا کی باتیں بھی سُن رہی تھی، اور یہ باتیں دل پر اثر انداز بھی ہو رہی تھیں۔ آخر وہ خاموش نہ رہ سکی۔ کہنے لگی:۔

"یہ باتیں نہ کرو بہن، جو کچھ ہونا تھا ہو چکا، اب اسے یاد کر کے دل کڑھانے سے کیا حاصل؟ نصیب کا لکھا بھی کوئی میٹ سکا ہے آج تک!"

سنجوگتا فوراً تائید پر آمادہ ہو گئی۔

"نصیب کا لکھا، بھگوان کے سوا اور کون میٹ سکتا ہے، وہی میٹیں تو میٹیں!"

رادھا ہنس پڑی، شاخِ گُل کی طرح اس کی کمر لچک رہی تھی۔ اس نے سنجوگتا کو بناتے ہوئے کہا:۔

"پگلی کہیں کی! نصیب کی تختی پر بھگوان خود ہی تو لکھتے ہیں، وہ بھلا اپنا لکھا ہوا کیوں میٹنے لگے — وہ لکھتے وہی کچھ ہیں جو ہونے والا ہوتا ہے، پھر اسے کوئی نہیں بدل سکتا، وہ ہو کر رہتا ہے!"

سنجوگتا چڑ سی گئی۔ اُس نے ماتھے پر شکن ڈال کر کہا :۔

"بس رہنے دو ——— بڑی بھگوان کی بھگت بنی ہیں! میری نظر میں تو تم بگلا بھگت ہو ——— ہاں!"

دیول دیوی اب تک اِن دونوں کی باتیں بے تعلقی کے ساتھ سُن رہی تھی، کہنے لگی :۔

"یہ باتیں نہ کرو، دِل دُکھتا ہے اِن باتوں سے، جو کچھ ہونا تھا ہو گیا۔ اب لکیر پیٹنے سے کیا حاصل ؟"

یہ کہہ کر دیول دیوی خاموش ہو گئی، اسے خاموش دیکھ کر رادھا اور سنجوگتا نے بھی اپنی نوک جھونک بند کر دی۔ رام دیو کا جلوس نکل گیا اور سڑک پر وہی روز کی طرح عام آمد و رفت شروع ہو گئی دیول دیوی اس وقت کسی گہری سوچ میں تھی۔ سوچتے سوچتے اس نے اپنی ہنس کی سی گردن اُٹھائی، اور رادھا سے مخاطب ہوتی ہوئی بولی :۔

"تُو نے دیکھا رادھا، رام دیو کی کتنی عزّت ہوئی یہاں ؟ کس طرح اس کے جلوس نکلے اور دعوتیں ہوئیں ؟ کس طرح اس کا راج پاٹ واپس کیا گیا ؟ کس طرح ایک اور نیا علاقہ اسے بخش دیا گیا ؟ کس طرح وہ لرزتا کانپتا آیا تھا، اور کس طرح خوش خوش ہشاش بشاش کامیاب اور کامران واپس گیا ؟"

رادھا نے رندھے ہوئے لہجہ میں جواب دیا :۔

"ہاں راجکماری دیکھا، اچھی طرح دیکھ لیا ——— وہی نصیب اور مقدر کی بات، اسی کا چرچا ہم اور سنجوگتا کر رہے تھے !"

دیول دیوی نے ایک ٹھنڈی سانس لی، اور بھرّائے ہوئے لہجہ میں کہا :۔

"ہاں وہ تو میں سُن رہی تھی، لیکن میں کچھ اور سوچ رہی ہوں، تمہارا دھیان بھی اس طرف نہیں گیا ؟"

سنجوگتا نے اشتیاق کے ساتھ پُوچھا :۔

"وہ کون سی بات سوچ رہی تھیں راجکماری؟ ـــــــ ذرا ہم بھی تو سُنیں!"

دُور خلا کو گھورتے ہوئے دیول دیوی نے کہا:۔

"میں یہ سوچ رہی تھی کہ یہ بیچارے مسلمان کتنے بدنام ہیں؛ ان کی کیسی کیسی بُرائیاں کی جاتی ہیں۔ خود ہم انہیں کتنا خراب اور ذلیل سمجھا کرتے تھے ـــــــ جب سے یہاں آئی ہوں دشمن کی نظر سے نہیں دیکھا کی ہوں، ان کی اچھائیوں میں بھی بُرائی کے پہلو ڈھونڈتی رہی ہوں۔ ان کی نیکیوں میں بھی بدی تلاش کرتی رہی ہوں۔ ان کی خوبیوں کو بھی اچھی نظر سے نہ دیکھنے کی کوشش کرتی رہی ہوں، لیکن اب محسوس کر رہی ہوں کہ میرا حوصلہ جواب دے رہا ہے۔ نہیں یہ حوصلہ نہیں ڈھٹائی۔ میں اب تک ڈھٹائی کے ساتھ مسلمانوں کی اچھائی کو بُرائی سمجھا کرتی تھی۔ لیکن اب ایسا کرنے پر مجبور ہوں، آخر کب تک؟ ـــــــ کہاں تک؟ ـــــــ انسان لاکھ ڈھٹائی پر کمر باندھ لے لیکن وہ سفید کو سیاہ اور سیاہ کو سفید نہیں کر سکتا، ـــــــ میں غلط تو نہیں کہتی رادھا؟"

یہ باتیں دیول دیوی نے کچھ ایسے اثر انگیز انداز میں کہیں کہ سنجوگتا اور رادھا بہت متأثر ہوئیں سنجوگتا تو چُپ تھی لیکن رادھا نے زبان کھولی:۔

"ہاں راجکماری! کہتی تو سچ ہو۔ میرا بھی بالکل یہی حال تھا لیکن میں تو اب اس کی قائل ہو گئی ہوں کہ مسلمان سے اچھا اس دُنیا میں کوئی نہیں۔ وہ صرف دشمن کے ساتھ سخت ہیں۔ ورنہ ان سے بڑھ کر رحم کرنے والا، کام آنے والا، ساتھ دینے والا کوئی نہیں! رام دیو پر اگر ہم نے فتح پائی ہوتی تو یا وہ مارا جا چکا ہوتا، یا کسی جنگل میں، کھوہ میں، غار میں زندگی کے دن کاٹ رہا ہوتا۔ کم از کم اسے یہ عزت تو نہ ملتی جو اس نے یہاں پائی، ـــــــ!"

اب سنجوگتا کے لئے خاموش رہنا ناممکن ہو گیا، آخر وہ کب تک دوسروں کی سُنے جاتی، اور خود اپنے ہونٹ سیئے رہتی۔ اس نے کہا:۔

"بات تو یہی ہے اور سچ پوچھو تو انہی خوبیوں کی وجہ سے مسلمان سارے بھارت ورش پر چھائے جا رہے ہیں!"

دیول دیوی نے جیسے سنجوگتا کی بات سُنی ہی نہیں، وہ اپنی دھن میں مست تھی، اپنے خیال میں غرق تھی، اپنی ہی کہے جا رہی تھی،۔

"ماتا جی کی مجھے کتنی فکر تھی؟ ان کے غم میں میری جان نکلی جا رہی تھی، نہ دن کو چین تھا، نہ رات کو آرام، نہ کھانے میں مزہ تھا نہ پینے میں لطف، نہ گانا سننے کو دل چاہتا تھا نہ قصے کہانی میں جی لگتا تھا۔ دُنیا کی ہر لذّت ہیچ معلوم ہوتی تھی، دنیا کی ہر لذّت سے جی بھر گیا تھا، بلکہ نفرت سی ہونے لگی تھی!"

رادھا۔ "ہاں مَیں جانتی ہوں، میرے سامنے ہی تو یہ سب کچھ گزرا۔ راجکماری کی حالت دیکھ دیکھ کر گھنٹوں اور پہروں کسی کونہ میں پہنچ کر رو یا کرتی تھی، اور اس طرح دل کی بھڑاس نکال لیا کرتی تھی، ــــــــ مجھ سے کیا کچھ چھپا ہے!"

دیول دیوی۔ "لیکن یہاں آ کر جب مَیں نے سُنا کہ وہ شہنشاہ خلجی کے حرم میں داخل ہو گئی ہیں۔ میرے باپ سے ناتہ توڑ کر وہ شہنشاہ ہند کی بیوی بن گئی ہیں، تو مجھے ان سے نفرت ہو گئی۔ میرا جی چاہا ان کا اپنے ہاتھوں سے گلا گھونٹ دوں جو عورت اپنے شوہر کو چھوڑ کر اپنی اکلوتی بیٹی کو بھول کر اپنے دھرم کو ستیاناس کر کے ایک مُسلمان کی بیوی بن جائے، وہ کسی عزّت کی کسی احترام کی مستحق ہو سکتی ہے؛ تجھے یاد ہو گا، رادھا! ماتا جی جب آنکھوں میں آنسو بھرے ہاتھ پھیلائے مجھے اپنے ماتا بھرے سینہ سے چپٹانے کے لئے کانپتے ہوئے قدموں کے ساتھ آگے بڑھی ہیں تو مَیں رکھائی سے پرنام (سلام) کر کے پیچھے ہٹ گئی۔ مَیں ان کے سینہ سے نہیں لگی۔ مَیں نے ان کی محبّت سے بھری ہوئی گود ٹھکرا دی، وہ بے چاری سمجھیں راستہ کی تکان اور صدموں کے باعث

میری یہ کیفیت ہے۔ بیتابی کے ساتھ میرے قریب آئیں، میری آنکھوں کو، میری پیشانی کو، میرے گالوں کو اُنہوں نے چُوما۔ مجھے کلیجہ سے لگایا، پیار کیا، مجھے بھینچ بھینچ کر چمٹایا اور پھُوٹ پھُوٹ کر روئیں۔ لیکن کیا تو نے میری آنکھوں میں بھی آنسُو دیکھے تھے؛ میرے چہرے پر بھی تجھے پریم اور محبّت کا جلوہ دکھلائی دیا تھا؛ میرے انداز میں بھی تجھے بے قراری اور بیتابی نظر آئی تھی ___؟

رادھا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا:۔

"ٹھیک ___ اور مجھے اس پر بڑا تعجب بھی ہُوا تھا۔ لیکن مَیں بھی وہی سمجھی تھی جو مہارانی نے سمجھا تھا، یعنی سفر کی تکان اور صدموں کے باعث راجکماری کا یہ رنگ ہے!"

دیول دیوی: "بات وہی تھی جو مَیں نے ابھی کہی مجھے ماتا جی سے نفرت ہو رہی تھی۔ ان کی صُورت دیکھنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ مَیں ان کے سامنے سے ہٹ جانا چاہتی تھی، مجھے اپنے وجود پر رام نگر میں اس لئے شرم آتی تھی کہ مَیں کرن سنگھ جیسے ظالم، خود غرض، سفّاک اور بدخو شخص کی بیٹی ہوں، اور دلّی پہنچ کر اپنے وجود سے میں اس لئے شرمانے لگی کہ کنول دیوی جیسی عورت کے پیٹ سے پیدا ہوئی!"

رادھا نے کوئی جواب نہ دیا۔ وفورِ حیرت سے دانتوں تلے انگلی داب لی، البتہ سنجوگتا نے کہا۔

"شاباش ہے راجکماری ___ تمہارے یہ خیالات مہارانی کنول دیوی کے لئے ہیں، جن سے بڑھ کر پاک اور پوتر عورت مَیں نے اس دُنیا میں نہیں دیکھی، جن کے دل میں تمہاری محبّت کے سوا کوئی جذبہ ہی نہیں پیدا ہوتا، جنہوں نے رو رو کر تمہارے فراق میں آنکھیں سُجالی تھیں، جن کے ٹوٹے ہوئے دل کو جوڑنے کے لئے شہنشاہِ ہند نے کسی سپاہی کو نہیں، کسی افسر کو نہیں، کسی سردار کو نہیں، کسی سپہ سالار کو نہیں، اپنے لختِ جگر، نورِ نظر، ولی عہدِ سلطنت، خضر خاں کو تمہیں لینے بھیجا تھا اور تاکید کر دی تھی کہ ناکامی کی صورت میں زندہ واپس نہ آنا اور جب

نے باپ کے الفاظ کو پورا کیا! اور جان پر کھیل کر تمہاری راجدھانی سے تمہارے خود غرض باپ اور ہوس پرست شوہر اور بزدل بادل فوج سے چھین لایا! ـــــــــ اسی ماں کی برائی کر رہی ہو؟ اس شہنشاہ کو برا سمجھ رہی ہو؟ اسی ولی عہدِ سلطنت پر طعن کر رہی ہو؟ اسی قوم کو حقارت اور ذلت کی نظر سے دیکھ رہی ہو؟ ـــــــــ حیرت ہے راجکماری! میں تمہیں ایسا نہ سمجھتی تھی، تمہاری محبت میں ہر خطرہ کا مقابلہ کرتی، ہر دکھ کو جھیلتی، ہر مصیبت کے سامنے سینہ سپر ہوتی، اپنی لاج، جان، سکھ ہر چیز سے بے پروا ہو کر وہاں سے یہاں آئی ـــــــــ اتنی محبت تھی مجھے تم سے۔ جو کام میں نے کیا وہ لالچ سے نہیں ہو سکتا تھا، صرف محبت ہی کرا سکتی تھی، لیکن راجکماری صاف صاف کہتی ہوں، وہ محبت کھرچ کر پھینک دی تم نے!"

اور یہ کہہ کر سنجوگتا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اسے روتا دیکھ کر دیول دیوی تیزی سے اٹھی اور اسے گلے سے لگا لیا۔ اس وقت دیول دیوی کی آنکھوں میں بھی آنسو بھرے ہوئے تھے، اس نے اسے گلے سے لگائے لگائے کہا:۔

"واقعی تو دیوانی ہے، اری پوری بات تو سن لی ہوتی، پھر جتنا جی چاہتا ملامت کر لیتی!"

سنجوگتا نے ساری کے پلو سے آنسو پونچھ لئے، اور منتظر نگاہوں سے دیول دیوی کی طرف دیکھنے لگی۔ دیول دیوی نے شفقت اور محبت کے ساتھ کہا:۔

"نہیں، جب تک تو ہنس نہیں دے گی، میرا دل کڑھتا رہے گا میں بات نہ کر سکوں گی!"

رادھا نے سنجوگتا کو گدگدانا شروع کر دیا، اور وہ بے تاب ہو کر یک بیک ہنس دی۔ رادھا نے کہا:

"راجکماری کی شرط پوری ہو گئی۔ میں نے سنجوگتا کو ہنسا دیا، اب کہیے، کیا کہہ رہی تھیں آپ؟"

دیول دیوی نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا:۔

"تو میں جب یہاں پہنچی تو یہ کیفیت تھی۔ لیکن میں نے یہاں آ کر دیکھا کیا؟ میں نے دیکھا ماتا جی

کے ساتھ وہ سلوک ہو رہا تھا جو مہاراجہ کرن سنگھ کے رنواس میں بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ کرن سنگھ چاہتا تھا کہ وہ واپس نہ آئیں۔ وہ انہیں اچھوت سمجھنے لگا تھا، انہیں ناپاک سمجھنے لگا تھا۔ انہیں ذلیل سمجھنے لگا تھا۔ اور یہاں ان کے ساتھ وہ برتاؤ ہو رہا تھا، جو ایک شہزادی کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ یہ پہلا نقش تھا مسلمانوں کی عظمت کا میرے دل پر، پھر بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ ماتاجی کو شہنشاہ واپس بھیج رہا تھا کہ وہ اپنے شوہر کے پاس جائیں، اور وہاں رہیں۔ ماتاجی مجھ سے زیادہ کرن سنگھ کو جانتی تھیں، لہٰذا انہوں نے بالکل صحیح طور پر واپس جانے سے انکار کر دیا پھر شہنشاہ نے انہیں آزاد کر دینے کا اعلان کر دیا۔ لیکن ماتاجی نے اس سے بھی انکار کر دیا۔ پھر شہنشاہ نے بہت بڑی رقم پیش کی، اسے لیں جہاں چاہیں چلی جائیں، اور عزت آبرو سے زندگی بسر کریں۔ لیکن ماتاجی نے یہ بھی نہ کیا، وہ جانتی تھیں ہندو دنیا میں اب ان کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ ماتاجی نے خود کہا کہ مجھے لونڈی بنا کر کسی امیر کو بخش دو، میں اس کی چاکری میں زندگی بسر کر لوں گی۔ لیکن اپنوں میں ذلیل ہو کر نہیں رہوں گی۔ تب شہنشاہ نے کنیز بنانے کے بجائے انہیں اپنے دل کی ملکہ بنا لیا۔ میرا خیال تھا وہ زبردستی حرم میں داخل کی گئی ہیں، لیکن جب اصل حقیقت معلوم ہوئی تو میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی مسلمان کتنے عالی ظرف ہوتے ہیں؟ اور اب میں نے رام دیو کو دیکھا، —— پہلے اس کی شکست کا افسانہ سنا، پھر ہارے ہوئے جواری کا دلی میں شاہانہ جاہ و جلال کے ساتھ استقبال دیکھا اور پھر یہ معلوم ہوا کہ اس کا راج پاٹ اسے واپس دے دیا گیا، تو مجھے ماننا پڑا، مسلمانوں سے اچھی، شریف اور روادار قوم اس پردۂ دنیا پر کوئی نہیں، وہ اس کے مستحق ہیں کہ ساری دنیا پر حکومت کریں اور دنیا کا فرض ہے، کہ ان کی حکومت تسلیم کر لے، ان کے آگے سر جھکا دے، عقیدت کا سر —— میری گردن کسی کے سامنے خم نہیں ہوئی، لیکن اس قوم کے سامنے سر عقیدت خم کرنے پر مجبور ہوں، —— او

شہنشاہ مجھ سے بھی کتنی محبت سے پیش آتے ہیں۔ ابھی کل ہی کا تو واقعہ ہے، کہہ رہے تھے، دیول دیوی ہماری لڑکی ہے! ——— جس لڑکی کو سگے باپ کرن سنگھ نے ایک بزدل کے ہاتھ بیچ دیا تھا اسی لڑکی کو ایک منہ بولے باپ نے زمین سے آسمان پر پہنچا دیا، اب مجھے اپنے وجود سے شرم نہیں آتی، فخر ہوتا ہے اپنے وجود پر!"

رادھا: "ہاں راجکماری بات تو ایسی ہی ہے۔ تمہارا ایک ایک حرف سچائی کی منہ بولتی تصویر ہے میرے دل میں تو ان لوگوں کی محبت پیدا ہو گئی ہے!"

سنجوگتا: "راجکماری ایک بات پوچھوں ——— ؟ دل نہیں مانتا اس لئے پوچھ رہی ہوں، خفا تو نہ ہو جاؤ گی ——— ؟"

دیول دیوی "خفا کیوں ہونے لگی۔ اتنی مشکل سے تو ابھی تجھے منایا ہے، اب خود الٹی تجھ سے خفا ہو جاؤں گی ؟"

سنجوگتا: "تم نے شہنشاہ کا ذکر بڑی محبت کے ساتھ کیا، تم نے مسلمانوں کا ذکر بڑی عزت کے ساتھ کیا لیکن خضر خاں کا نام بھی تمہاری زبان تک نہ آیا حالانکہ وہی ہے جس نے شیر کے منہ میں پنجہ ڈالا اور تمہیں جھپٹ لایا، وہ بیچارہ اس قابل بھی نہیں کہ دو چار اچھے لفظ ہی اس کے لئے استعمال کر دو۔ ایسی سنگ دلی بھی اچھی نہیں ہوتی راجکماری ؟"

سنجوگت کے یہ الفاظ سن کر دیول دیوی کا چہرہ سفید پڑ گیا جیسے بھرے مجمع میں کسی کی چوری پکڑ لی گئی ہو۔ لیکن جلد ہی اس نے اپنے اوپر قابو پا لیا اور کہا:

"نہیں سنجوگتا، یہ بات تو نہیں، میرے دل میں خضر خاں کی جتنی عظمت اور وقعت ہے، نہ کسی کی ہے نہ ہو سکتی ہے۔ وہ آدمی نہیں، آدمی کے روپ میں اوتار ہیں۔ ان کی سب سے بڑی تعریف یہ ہے کہ ان کے بارے میں کچھ نہ کہوں، وہ الفاظ نہیں ملتے، جو میری ترجمانی کر سکیں، انہوں نے

مجھے شیر کے مُنہ سے نکالا۔ وہ راستہ بھر اس طرح مجھ ابھاگنی (بدقسمت) کی حفاظت کرتے آئے، جیسے کوئی کنجوس خزانہ کی حفاظت کرتا ہے۔ یہ کڑی منزلیں جو خطروں سے بھری ہوئی تھیں، انہوں نے اس طرح طے کیں کہ پل بھر سوئے نہ آرام کیا۔ ہر ہر لمحہ اور ہر ہر پل میری راحت اور آسائش کا خیال رکھا۔ میرے سونے جاگنے، اُٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے ہر چیز کا دھیان رکھا، پھر شریف اتنے کہ مَیں تو فرطِ حیرت سے مجبور ہو کر کبھی کبھی ان کو تکنے لگتی تھی، مگر کیا مجال ہے جو انہوں نے نظر بھر کر بھی مجھے دیکھا ہو!"

سنجوگتا۔ (حیرت کا اظہار کرتے ہوئے) "سچ راجکماری؟ ——— واقعی؟ ——— مَیں تو انہیں اتنا پاکباز اور نیک، نہ سمجھتی تھی!"

دیول دیوی۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) "تُو انہیں جان ہی نہیں سکتی، سمجھ ہی نہیں سکتی، سچ کہتی ہوں سنجوگتا، وہ آدمی نہیں اوتار ہیں۔ ——— نیک، بہادر، دلیر، جیالے، خوبصورت، بانکے پاک، شریف، کون سی خوبی ہے جو اُن میں نہیں۔ وہ سر سے پاؤں تک اچھائی ہی اچھائی ہیں۔ کوئی بدترین دشمن ہی ان میں عیب نکال سکتا ہے، اس باپ سے زیادہ کون خوش قسمت ہو سکتا ہے جس کا ایسا بیٹا ہو۔ اس ماں پر کون عورت رشک نہ کرے گی جس کے پیٹ سے ایسا بیٹا پیدا ہُوا ہو۔ لیکن مَیں تو کہتی ہوں بھگوان بھی کبھی کبھی سوچنے لگتے ہوں گے کہ میری قدرت سے کتنا اچھا آدمی پیدا ہو گیا۔ ان کے گُن گانے بیٹھوں تو صبح سے شام اور شام سے صبح ہو جائے لیکن داستان تمام نہ ہو۔ وہ بڑے اچھے ہیں۔ بس اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے بعد زبان بند ہو جاتی ہے کہ کیا کہئے؟"

سنجوگتا: "اوہو راجکماری مَیں سمجھ گئی۔ کیا بات ہے؟ ——— مجھے تو کچھ دال میں کالا نظر آتا ہے۔ بھگوان خیر کرے، آخر یہ بیل کیسے منڈھے چڑھے گی؟"

رادھا بیچ میں بول پڑی :-

"تو ہماری راجکماری کب کسی سے کم ہیں ؟ اگر خضر خاں ہر اعتبار سے لاجواب ہیں، تو اس دنیا میں دیول دیوی کا بھی جواب کوئی ؟ وہ کونسی خوبی ہے جو ہماری راجکماری میں نہیں : رُوپ گُن سبھاؤ۔ اگر خضر خاں جیسے مرد اس دُنیا میں نایاب ہیں تو دیول دیوی جیسی استری بھی کوئی چراغ لے کر ڈھونڈھے تب بھی نہ ملے گی!"

دیول دیوی کو اپنی یہ تعریف پسند نہ آئی۔ اس نے رادھا کے مُنہ پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا :-

"نہیں رادھا، ایسی باتیں مجھے اچھی نہیں لگتیں۔ میرے مُنہ پر جھوٹ نہ بولو۔ میں اپنی تعریف سُن کر خوش نہیں ہوتی۔ اور تعریف بھی کس کے مقابلہ میں ؟ کہاں ذرّہ کہاں آفتاب ؟ میں تو ان کے بارے میں زیادہ سوچتی بھی نہیں، حالانکہ ان کی باتیں، ان کا سبھاؤ، ان کا برتاؤ ہر آن یاد آتا رہتا ہے۔ میں سوچتی ہوں مجھ جیسی نیچ کو اُن جیسے اُونچے آدمی کے بارے میں زیادہ سوچنے کا حق ہی نہیں ہے، یہ ان کی توہین ہے!"

رادھا ہنس پڑی۔ پھر اس نے ہنسی روکتے ہوئے کہا :-

"اوہ راجکماری، تو یہ سنجوگتا سچ کہہ رہی تھی ؟ ——— واقعی دال میں کچھ کالا نظر آتا ہے!"

دیول دیوی کے ہونٹوں پر افسردہ سا تبسّم نمایاں ہُوا۔ پھر اس نے کہا :-

"میں سمجھ رہی ہوں سنجوگتا کیا کہہ رہی تھی اور تم کیا کہنا چاہتی ہو : تم دونوں کا خیال ہے میں ولی عہد سے محبت کرنے لگی ہوں۔ لیکن اس میں میری ہی تخصیص کیا ہے ؟ ان جیسے آدمی سے کون محبت نہیں کرتا ؟ کیا تم نہیں کرتیں ؟ سنجوگتا نہیں کرتی ؟ کون نہیں کرتا ؟ جس نے اس دیس کا ذرّہ ذرّہ پریم کرتا ہو جس کی بہادری کے چرچوں سے ہر ہر گھر گونج رہا ہو، جس کے جیالے پن کی داستانیں بڑے بڑے قلعوں، شہروں اور ریاستوں کے در و دیوار پر مرقوم ہوں۔ اس سے محبت نہ

کرنا جرم ہے رادھا!"

رادھا۔ "تو میں کب منع کرتی ہوں۔ میری تو بھگوان سے پرارتھنا (دعا) ہے کہ یہ پریم بڑھے، پھلے پھُولے، پروان چڑھے اور . . . . . ؟

دیول دیوی۔ "ہاں یہ پریم بڑھے گا، بڑھتا رہے گا، لیکن پھل پھُول نہیں سکتا، ——— میں وہ خواب نہیں دیکھتی جو پُورا نہ ہو سکے!"

رادھا۔ "واہ راجکماری، یہ تم کیسی باتیں کرنے لگی ہو اب؟ ——— بلکہ نہ تک تو تمہارا یہ حال تھا کہ کسی کو خاطر ہی میں نہیں لاتی تھیں، کیسے کیسے رجواڑوں کے شہزادے اور راجکمار آتے تھے، لیکن تم انہیں خاطر میں ہی نہیں لاتی تھیں، اور اب یہ حال ہے کہ ایک آدمی ایسا نظر چڑھا کہ اپنے آپ کو بھول گئیں، اپنی شان اور اپنا مقام بھُول گئیں؛ یہ کیسا اندھیر ہے، یہ باتیں مجھے ذرا بھی پسند نہیں!"

دیول دیوی ہنسنے لگی۔ اس نے کہا:۔

"تو تیری خاطر سے اپنے آپ کو بدل دوں؟"

رادھا۔ "ہاں بدلنا پڑے گا تمہیں، یہ بھی بھلا کوئی بات ہوئی؛ یا تو احساس برتری کا یہ عالم تھا کہ ہر شخص حقیر اور ہیچ نظر آتا تھا، یا احساس کمتری کی یہ کیفیت ہے کہ اپنے آپ کو کچھ سمجھنا ہی چھوڑ دیا ہے؛ یا اُس سرے پر تھیں یا اس سرے پر آ گئیں؟"

دیول دیوی۔ "تُو تو نادان ہے رادھا، تُو نے خضر خاں کا وہ جلوہ نہیں دیکھا ہے جو میں نے دیکھا ہے!"

رادھا۔ "خوب دیکھا ہے راجکماری ——— مانتی ہوں وہ سب گُنوں کے پورے ہیں، ان میں ہر خوبی ہے، ہر سلیقہ ہے، ہر سبھاؤ ہے، لیکن تم کیا کم ہو کسی سے ؎

دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے!"

مجھے تو یقین ہے کہ اگر تم نظر بھر کر اسے دیکھ لو تو وہ کلمہ پڑھنے لگے گا تمہارا، بھلا تمہارے نینوں کی تاب لا سکتا ہے کوئی؛ تمہاری آنکھ کا تیر کھا کر بچ سکتا ہے کوئی؛ تم جسے محبت کی نظر سے دیکھ لو، وہ بسمل ہوئے بغیر رہ سکتا ہے؛"

سنجوگتا: "اور اگر ایسا ہو چکا ہو تو؟"

رادھا۔ (مسکرا کر) "یعنی تمہارا مطلب ہے کہ ولی عہدِ سلطنت خضر خاں . . . . . ."

سنجوگتا: "ہاں بظاہر تو میرا مطلب یہی ہے۔ —— اعتراض ہے تمہیں کچھ؟"

رادھا: "اعتراض تو کیا ہو سکتا ہے، خوشی کی بات ہے —— لیکن حیرت ضرور ہے!"

سنجوگتا: "حیرت بھی کیوں؟ —— تمہی کہہ چکی ہو ہماری راجکماری لاکھوں میں ایک ہیں؟"

رادھا: "یہ تو اب بھی کہتی ہوں —— کچھ جھوٹ ہے یہ؟"

سنجوگتا: "بس تو پھر اگر خضر خاں کو ہماری راجکماری سے پریم ہو جائے تو کیا قباحت ہے؟"

رادھا: "قباحت؟ —— میں تو دل سے چاہتی ہوں لیکن تیری بات کا اعتبار نہیں ہوتا!"

سنجوگتا: "وہی تو پوچھتی ہوں آخر میں اتنی بے اعتبار کیوں ہوں؟ تم نے کبھی مجھے جھوٹ بولتے یا بے سر پاؤں کی باتیں کرتے دیکھا ہے؟"

دیول دیوی۔ (قدرے خنگی کے ساتھ) "بہت غلط قسم کی باتیں ہونے لگیں —— خاموش ہو جاؤ یا کسی اور طرح کی باتیں کرو، ——!"

دیول دیوی راجکماری تھی۔ اس کے دبدبہ اور طنطنہ میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ یہ حکم اس نے کچھ ایسے تیکھے انداز میں جواب دیا کہ اب رادھا یا سنجوگتا کے لئے مجالِ دم زدن نہ تھی۔ بیچاری دونوں خاموش ہو گئیں!

شہزادہ خضر خاں!

مجلس پر ایک عجیب سکوت سا چھایا تھا۔ دیول دیوی بھی خاموش تھی، اور رادھا سنجوگتا بھی۔ اتنے میں شہزادہ خضر خاں اس طرف آتا ہوا دکھائی دیا۔ خضر خاں کی آمد نے اس مختصر مجمع میں ہلچل سی پیدا کر دی۔ وہ اس وقت فوجی لباس میں ملبوس تھا۔ یوں بھی کم وجیہہ اور باوقار نہ تھا لیکن اس سج دھج نے اس کی شان اور آن بہت زیادہ بڑھا دی تھی۔ دیول دیوی نے اسے سب سے پہلے اسی وضع قطع میں دیکھا تھا۔ انسان کی پہلی ہی نظر محبت یا نفرت، التفات یا بیزاری کا فیصلہ کر دیتی ہے، اور اس پہلی نظر میں نہ جانے کیا بات تھی کہ دل اس کی طرف کھنچا تو کھنچتا ہی چلا گیا۔ دل اپنی ایک الگ زبان رکھتا ہے، اور یہ زبان صرف دل ہی سن بھی سکتا ہے۔ دیول دیوی نے خود ہی کہا، خود ہی سنا۔ وہ ایک قیدی کی حیثیت سے خضر خاں کے قبضہ میں آئی تھی۔ باپ جو مسلمانوں کے خون کا پیاسا تھا لوک دم بھاگ کھڑا ہوا۔ شوہر ——— گوبند پرشاد ——— جو ہزار جان سے فریفتہ تھا اپے دلی کے ساتھ لڑنے کی کوشش میں زخمی ہوا اور پھر اس نے مڑ کر نہ دیکھا کہ اس کی متاع زندگی کا انجام کیا ہوا؟ وہ فوج جو اس کی جان اور ناموس کی حفاظت کے لئے ساتھ تھی، اور جس کا ہر فرد بہادری اور دلاوری میں اپنے آپ کو یکتا اور منفرد سمجھتا تھا اس طرح بکٹٹ بھاگی

کہ کسی نے پیچھے مُڑ کر دیکھنے کی ہمّت نہ کی کہ کیا ہو رہا ہے؛ پھر وہ خضر خاں کے قبضے میں تھی، اور وہ جس طرح کا سلوک چاہتا کر سکتا تھا۔ لیکن جو لوگ اونچی سطح کے ہوتے ہیں، ان کی زندگی کا ہر روپ سندر ہوتا ہے۔ صلح میں، جنگ میں، دوستی میں، دشمنی میں، رحم و مروّت کے عالم میں، غصّہ و برہمی کی کیفیت میں، ان کی شرافت، عالی ظرفی اور کردار و سیرت کی بلندی یکساں رہتی ہے جس زاویہ سے بھی انہیں دیکھا جائے ان کی بڑائی میں فرق نہیں آتا جس شخص کو میدانِ جنگ میں اس نے تلوار چلاتے، دشمن کو ہلاک کرتے، اس کی گردن کاٹتے، اس کا تعاقب کرتے دیکھا تھا، جنگ ختم ہونے کے بعد اس کی انسانیت، شگفتگی، احسان، مروّت اور لطف و عنایت کا جلوہ دیکھ کر وہ حیران رہ گئی، اور پھر وہ خضر خاں کی حراست میں دلّی کی طرف روانہ ہوئی۔ یہ سفر چند فرلانگ کا نہ تھا، چند میل کا نہ تھا، چند گھنٹوں کا نہ تھا، منزلوں کا تھا، دنوں کا تھا بلکہ ہفتوں کا تھا۔ وہ شہزادہ تھا، ولی عہدِ سلطنت تھا اس کے ہمرکاب جاں نثار دل اور وفا کاروں کا دستہ تھا۔ یہ سب اس لئے تھے کہ اس کی راحت و آسائش کا خیال رکھیں۔ اسے کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے دیں۔ لیکن یہی فرائض جہاں تک دیول دیوی کی ذات کا تعلق تھا اس نے اپنے ذمّے لے لئے تھے۔ اس کے لشکر میں کوئی ہندو نہیں تھا، رکابدار، باورچی اعلیٰ سے اعلیٰ تھے لیکن کوئی رسوئیا نہیں تھا۔ اس نے کوچ کرنے سے پہلے، سب سے پہلے اسی کا بندوبست کیا۔ ڈاک بٹھا دی اور جب تک زیادہ سے زیادہ معاوضہ دے کر اور مزید شاہانہ نوازشوں کی اُمید دلا کر اس نے ایک فن کار رسوئیا ڈھونڈ نہ لیا، چین سے نہ بیٹھا، اور جب وہ مل گیا تو اُسے لے کر خوش خوش دیول دیوی کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا:۔

"مجھے سب سے زیادہ فکر اس کی تھی کہ آخر رستہ میں آپ کے کھانے پینے کا انتظام کیا ہو گا؛ ہم مسلمان آپ ہندو، ہم تو اس معاملہ میں انسانیت کے قائل ہیں، ہر انسان کے ہاتھ کا پکایا ہوا کھا سکتے ہیں، بشرطیکہ وہ میلا کچیلا نہ ہو، پاک صاف ہو، آپ کے ہاں معیار دوسرا ہے، خالی دودھ پر

کیسے گزارا ہوتا، لیکن اب یہ مل گیا ہے۔ اچھے، اچھے کھانے پکا کر کھلائے گا آپ کو ـــــــ !"

دیول دیوی حسن اخلاق دیکھ کر دنگ رہ گئی، دل ہی دل میں کچھ لجائی، کچھ شرمائی۔ پھر اپنے تئیں سنبھالتے ہوئے بولی :۔

" خواہ مخواہ آپ نے اتنی تکلیف کی۔ کھانے کا مجھے کچھ ایسا زیادہ شوق بھی نہیں! اور پھر یہ رادھا تو اچھا خاصہ پکا لیتی ہے ــــــ !"

خضر خاں نے مسکراتے ہوئے کہا :۔

" نہیں، ہم مہمانوں کو تکلیف نہیں دیتے، آپ ہماری مہمان ہیں ــــــ یہ رادھا کون ہیں آپ کی ؟"

رادھا بول پڑی :۔

" باندی کہہ لیجئے، کنیز کہہ لیجئے، لونڈی کہہ لیجئے، داسی کہہ لیجئے، میرا کام بس سیوا ہی ہے !"

دیول دیوی نے رادھا کو گھور کر دیکھا اور خضر خاں سے مخاطب ہو کر کہا :۔

" جی نہیں، یہ داسی اور باندی نہیں، میری بچپن کی سہیلی ہے، میرے دُکھ سُکھ کی شریک ــــ میں اسے اتنا ہی چاہتی ہوں جتنا ایک بہن، بہن کو چاہ سکتی ہے !"

خضر خاں نے ایک چھچھلتی سی نظر رادھا پر ڈالی اور کہا :۔

" آپ کی بات اَور ہے ــــــ لیکن اگر یہ رادھا واقعی ایسی ہیں تو خود کچھ پکائیں، یا رسوئیا سے پکوائیں، اس میں ہمیں بھی شریک کیجئے، اگر کچھ حرج نہ ہو !"

دیول دیوی کا دل اس عزّت افزائی، اس سادگی اور اس معصومانہ بے تکلفی پر بلّیوں اُچھلنے لگا۔ وہ دل ہی دل میں اپنی قسمت پر ناز کرنے لگی۔ اس نے کہا :۔

" بڑے شوق سے ــــــ لیکن آپ ہمارا کھانا کھا لیں گے ؟"

خضر خاں نے تبسّم کناں جواب دیا :۔

"کیوں نہیں، کہہ تو چکا ہوں، مسلمانوں کا نقطۂ نظر تو صرف انسانیت پر ہے، ہر انسان، انسان کی حیثیت سے برابر ہے۔ نہ کوئی نیچا ہے نہ اونچا، نہ ادنیٰ ہے نہ اعلےٰ، نہ اچھوت نہ برہمن —— لیکن خیر، یہ تو دوسری طرح کی باتیں چھڑ گئیں۔ ہاں صاحب کھاؤں گا اور بڑے شوق سے کھاؤں گا!"

دیول دیوی نے خوشی کا جھولا جھولتے ہوئے ایک اندازِ خاص سے اس پر نظر ڈالی اور پھر فوراً ہی ہٹالی، اور کہا :۔

"تو آج دوپہر کا کھانا یہیں ہمارے خیمہ میں کھایئے! —— میں انتظار کروں گی!"

خضر خاں نے پہلو بدلتے ہوئے کہا :۔

"دوپہر کے بجائے شام کو رکھئے، اس وقت ذرا اطمینان سے کھایا جائے گا۔ دن میں مصروفیت زیادہ ہوتی ہے، اس لئے پیٹ بھر کر نہیں کھا سکوں گا۔ اور آپ بھی اطمینان سے انتظام نہ کر سکیں گی!"

رادھا جیسے موقع ہی کی منتظر تھی۔ کہنے لگی :۔

"شہزادہ صاحب، اگر واقعی کھانا ہے تو ہماری راجکماری کے ہاتھ کا پکا ہوا کھایئے!"

دیول دیوی نے رادھا کو تیکھی نظروں سے دیکھا اور کہا :۔

"چل ہٹ، —— میں کیا جانوں کھانا پکانا، کیا تو چاہتی ہے کہ وہ آج کھانے کے بعد پھر ہمارے ہاں نہ کھانے کی قسم کھالیں!"

خضر خاں :۔ "یہ بات آپ نے کیوں کہی؟ —— بھلا قسم کیوں کھالوں گا، پھر نہ کھانے کی؟ —— کہیں ایسا بھی ہو سکتا ہے؟"

دیول دیوی :۔ "بدمزہ کھانے کے بعد یہی حالت ہوتی ہے۔ میرا پکایا ہوا بالکل پسند نہیں آئے گا، —— میں خود پسند نہیں کرتی!"

خضر خاں:۔ "اچھا تو ایک بات سُن لیجئے، ـــــ کھائیں گے تو آپ ہی کا پکایا، ورنہ در گزر دیئے۔ چاہے وہ بدمزہ ہو یا مزے دار اسے ہماری قسمت پر چھوڑ دیجئے!"

بڑے شرمائے ہوئے انداز میں دیول دیوی نے کہا:۔

"آپ کی مرضی یہی ہے تو پھر مجھے کوئی عذر نہیں!"

بات ختم ہو گئی، اور دیول دیوی کھانے کے اہتمام میں مصروف ہو گئی۔ واقعی وہ بہت اچھا پکا لیتی تھی، اور جب اس نے خضر خاں کو دعوت دی تھی تو دل میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ کچھ چیزیں ضرور اپنے ہاتھ سے پکائے گی، لیکن دل ہی دل میں یہ بھی سوچ لیا تھا کہ ظاہر نہیں کرے گی۔ جب شہزادہ کھا لے گا۔ اور اس کی پسندیدگی ظاہر ہو جائے گی، تب دبی زبان سے اقرار کرے گی، یہ چیز تو میری پکائی ہوئی ہے۔ لیکن یہ رادھا بڑی چنچل تھی اس نے سارا پروگرام غارت کر کے رکھ دیا۔ خضر خاں تو چلا گیا لیکن دیول دیوی تن من سے اس کام میں لگ گئی۔ اس نے رادھا اور نئے رسوئیا سے کوئی کام نہیں لیا سب چیزیں اپنے ہاتھ سے تیار کیں، پوری، کچوری، پراٹھے، کئی قسم کی ترکاریاں، کئی طرح کی مٹھائیاں حلوے۔ دعوت ایک آدمی کی تھی لیکن اہتمام دس آدمیوں کا تھا۔ سارا دن اس کام میں بسر ہو گیا، پیٹھ ٹیکنے تک کا وقت نہیں ملا۔ ناز و نعم کی گود میں پلی ہوئی یہ راجکماری پوری محویت اور انہماک کے ساتھ اپنے کام میں لگی رہی۔ جیسے اس کی سب سے بڑی خوشی اسی میں ہے کہ کام کرتی رہے۔ جیسے اب تک وہ کام ہی تو کرتی چلی آئی ہے۔ ناز و نعم سے کوئی واسطہ ہی نہیں رہا۔ رادھا بڑے غور سے اس کی کیفیت دیکھ رہی تھی، کبھی کبھی مسکرانے لگتی تھی۔ پھر انجان بن کر بظاہر ادھر اُدھر حقیقتاً دزدیدہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگتی تھی۔ بڑی دیر تک یہی کیفیت رہی جب ضبط بالکل بس سے باہر ہو گیا تو کہنے لگی:۔

"راجکماری کیا ہو گیا ہے تمہیں؟"

دیول دیوی کام کرتے کرتے یہ سُن کر چونک پڑی۔ اپنی مصروفیت جاری رکھتے ہوئے اس نے کہا:۔

"کچھ نہیں؛ —— کچھ کیا کہنا چاہتی ہے تو؟"

رادھا نے سوچا، جو کچھ دل میں ہے وہ زبان پر آجائے تو اچھا ہی ہے۔ کہنے لگی:۔
"کہہ یہ رہی ہوں کہ آخر میں کس مرض کی دوا ہوں؛ رسوئیا کس لئے آیا ہے؟ ہر کام اپنے ہاتھ سے کیوں کر رہی ہو؟ ایک آدھ چیز خود پکا لو، باقی کام ہم لوگ کریں گے!"

دیول دیوی مسکرائی۔ اس کے موتی سے دانت چمکنے لگے۔

"کام لے تو رہی ہوں تم دونوں سے: —— برتن رسوئیا سے منجھوائے، آگ تم سے جلوائی۔"

رادھا اس وقت نجانے کس کیفیت میں تھی، بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا:۔
"ہاں آگ جلائی بے شک میں نے تھی، لیکن دہکائی تو نہیں تھی۔ مجھے تو یہ آگ لگتی ہوئی معلوم ہوتی ہے!"

دیول دیوی کا رنگ سرخ ہو گیا۔ لیکن بہت جلد اپنی اس کیفیت پر وہ غالب آگئی۔ اس نے تبسم کرتے ہوئے کہا:۔

"اپنی بات دوسروں پر ڈالنا خوب آتا ہے تجھے! —— جب خضر خاں اور گوبند پرشاد میں تلوار چلنے سے پہلے بات چیت ہو رہی تھی، تو وہ کون تھا جو بار بار خضر خاں کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا رہا تھا۔ اس کے حسنِ مردانہ اور جمالِ ترکانہ کی تعریفیں کر رہا تھا۔ اس کی سج دھج پر مٹا جا رہا تھا، اس کے بانکپن پر قربان ہوا جا رہا تھا، اس کے رعب و وجاہت کی داستانیں بیان کر رہا تھا، ندیدوں کی طرح نظر جمائے، بیتابانہ اور مشتاقانہ اس کو تکے جا رہا تھا —— دیکھے جا رہا تھا۔ میرا خیال ہے، وہ کوئی اور نہیں ہماری رادھا دیوی تھیں!"

رادھا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس نے کہا:۔

"ہاں راجکماری یہ سچ ہے، لیکن میں پیچھے رہ گئی، تم آگے بڑھ گئیں۔ میں نے نشانہ کو تاکا اور

تم نے اسے صید بنا لیا۔ مَیں مُنہ دیکھتی رہ گئی تم بازی لے گئیں، مَیں ہار گئی تم جیت گئیں مَیں بھول گئی تم نے یاد رکھا۔ مَیں کسی قابل نہ تھی، رہ گئی۔ تم سب کچھ بن کر نکل گئیں، ——— اب مَیں بہت دُور ہوں، اور تم بہت نزدیک، اپنا اپنا نصیب ہے راجکماری!"

دیول دیوی نے رادھا کو محبّت بھری نظروں سے دیکھا اور شکایت آمیز لہجہ میں کہا:۔

"تو مجھے کام نہیں کرنے دو گی، ——— وہ آلیں، کھانا کھالیں، چلے جائیں، تب پھر اپنے درد دل کی کتھا ساری رات سناتی رہنا!"

وہ مُسکراتی ہوئی بولی:۔

"جو کچھ سنانا تھا سُنا چکی، تم کام کرو، مَیں چلی!"

وہ خیمہ کے دوسرے حِصّے میں چلی گئی، اور دیول دیوی بدستور اپنے کام میں منہمک ہو گئی۔ خدا خدا کر کے دن تمام ہُوا اور شام نمودار ہوئی۔ ہر طرح کے الوانِ نعمت تیار ہو چکے تھے۔ دیول دیوی کام سے فارغ ہو کر، نہا دھو کر، زرکار اور زرنگار ملبوس سے آراستہ ہو کر اب انتظار میں بیٹھی تھی کہ مہمانِ عزیز آئے اور وہ اس کی خاطر داشت میں مصروف ہو جائے، یہاں تک کہ اندھیرا پھیلنے لگا۔ وقت گزرتا جا رہا تھا اور وقت کے ساتھ ساتھ نا اُمیدی اور یاس میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ دل میں بار بار یہ خیال آتا تھا، کہیں ایسا نہ ہو، نہ آئیں، ممکن ہے بھُول گئے ہوں، ممکن ہے کسی کام میں مصروف ہو گئے ہوں، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ ساری باتیں اُنہوں نے خوش فعلی سے کی ہوں اور پہلے ہی سے طے کر لیا ہو کہ نہیں آئیں گے، ——— اگر وہ نہ آئے تو کیا ہو گا؟ کیا واقعی وہ نہیں آئیں گے؟ ایسا ہُوا تو؟ ——— یہ سوچتے سوچتے اس کے دل پر غم کی گھٹا چھا جاتی۔ بظاہر وہ گاؤ تکیہ سے ٹیک لگائے مسند پر اطمینان سے بیٹھی تھی، لیکن دل میں کیسا طوفان اُمڈ رہا تھا، کیسی ہلچل برپا تھی، کیا کچھ گزر رہی تھی، اسے کوئی نہیں جانتا تھا صرف رادھا کسی حد تک اپنی ذہانت اور فراست کے باعث سمجھ رہی تھی۔

جب بہت دیر گزر گئی اور خضر خاں کسی طرح آتا نظر نہ آیا، تو دیول دیوی کی کیفیتِ نہاں کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے رادھا نے کہا :-

"شہزادہ صاحب ابھی تک نہیں آئے ؟"

دیول دیوی نے رادھا کی طرف دیکھے بغیر زمین پر نظر جماتے ہوئے کہا :-

"ہاں ـــــ بہت دیر ہوگئی ـــــ نہ جانے کیا بات ہے ؟"

اب رادھا کو شرارت سُوجھی، اس نے کہا :-

"ممکن ہے بھُول گئے ہوں، آخر بندہ بشر ہیں !"

دیول دیوی نے جواب دیا :-

"ہاں یہ بھی ہوسکتا ہے، بہرحال تھوڑی دیر اور انتظار کرلینا چاہئے !"

رادھا نے ہنستے ہوئے کہا :-

"تھوڑی دیر کے بعد کیا ہوگا؟ ـــــــ کیا انتظار ختم ہوجائے گا ؟"

دیول دیوی :- "اور کیا رات بھر انتظار کرتے رہیں گے ؟"

رادھا :- "تو یہ کیوں نہ کریں کہ کسی کو بھیج کر یاددہانی کرادیں، شاید واقعی بھُول گئے ہوں، فوراً آجائیں گے !"

اب دیول دیوی دل ہی دل میں خضر خاں کے اس تغافل پر پیچ وتاب کھاتے کھاتے چڑنے لگی تھی۔ اس نے تیوریاں چڑھا کر کہا :-

"نہیں، یاددہانی کی کوئی ضرورت نہیں، یہ ان کا فرض تھا کہ یاد رکھیں۔ لیکن اگر وہ بھُول گئے ہیں تو ہم کیوں یاد دلائیں ؟"

رادھا :- "مجھے تو بڑی بھُوک لگ رہی ہے ـــــ اب صبر نہیں ہوتا، میں تو کھائے لیتی ہوں جا کر !"

دیول دیوی :- "تھوڑی دیر اور صبر کرلو، پھر ہم تم ساتھ ہی کھائیں گے، بھُوک تو مجھے بھی خوب لگ رہی

ہے۔ تم نے تو دن کو کھایا بھی تھا۔ مَیں تو پکانے میں ایسی لگی رہی کہ بس دو گلاس پانی پر رہی ایک لقمہ بھی نہ کھا سکی!"

رادھا: "وہ تو معلوم ہے، مَیں نے اصرار بھی کیا تھا، لیکن تم اپنے آگے سنتی کس کی ہو؟ —— بس بہت ہو چکا انتظار، آؤ چلیں!"

دیول دیوی: "نہیں، ابھی نہیں، —— شاید آ جائیں، یہ بھی تو بُری بات ہے کہ کسی کو پہلے دعوت دی جائے، پھر اس کی راہ بھی نہ دیکھی جائے!"

رادھا خاموش ہو گئی۔ اتنے میں معلوم ہوا شہزادہ والا جاہ خضر خاں تشریف لا رہے ہیں۔ یہ مژدہ سنتے ہی دیول دیوی کا غنچۂ دل شگفتہ ہو گیا، اس کے چہرے پر نشاط و مسرت کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اس نے دفورِ طرب سے بے قابو ہو کر رادھا سے کہا:-

"دیکھ مَیں نہ کہتی تھی وہ ضرور آئیں گے، آ گئے نا؟"

رادھا نے منہ بناتے ہوئے کہا:-

"اب آئے تو کیا؛ ہماری تو بھوک بھی مر گئی، دیکھنا کیسے لتے لیتی ہوں، تم بھی میرا ساتھ دینا!"

دیول دیوی نے اس کام سے باز رکھتے ہوئے کہا:-

"نہیں نہیں، خبردار! —— بُری بات! ایسا نہ کرنا، ان سے کچھ نہ کہنا، بُرا مان جائیں گے، بھلا کوئی مہمان کا دل دُکھاتا ہے، —— چھی!"

اتنے میں شہزادہ آ گیا، آتے ہی اس نے معذرت کرتے ہوئے کہا:-

"راج کماری معاف کیجئے گا، دیر ہو گئی، کچھ ایسا ہی ضروری کام پیش آ گیا تھا، لیکن کوئی حرج بھی نہیں، زیادہ بھوک میں کھایا بھی خوب جاتا ہے! —— مَیں نے آج دن میں کھانا بھی نہیں کھایا اسی لئے!"

دیول دیوی بے چین ہوگئی۔ اس نے پوچھا :۔

"ارے! تو آپ دن بھر کے بھوکے ہیں ؟"

شہزادہ نے بے پروائی سے جواب دیا :۔

"ہاں، ــــــــــــ ورنہ اس وقت جی بھر کے کھا نہ سکتا، یہ بڑا اچھا اصول ہے۔ اچھا اور زیادہ کھانے کے لئے ایک وقت کا فاقہ ضرور کرلینا چاہئے!"

دیول دیوی ہنسنے لگی، اس نے کہا :۔

"اب تو مجھے بڑی شرم آرہی ہے آپ کو کھلاتے ہوئے، آپ نے اتنی اچھی رائے قائم کرلی ہے ابھی سے، اور اگر کہیں اچھا نہ ہوا یا آپ کو پسند نہ آیا تو پھر اس وقت کی بھوک مزہ دے جائے گی!"

شہزادہ نے ہنستے ہنستے جواب دیا :۔

"نہیں ایسا نہیں ہوگا، مطمئن رہئے لیکن اب زیادہ انتظار نہ کرائیے!"

فوراً ہی سونے چاندی کے تھالوں میں کھانا چن کر لایا جانے لگا۔ راجکماری دیول دیوی خود ایک ایک چیز لاکر شہزادے کے حضور میں پیش کر رہی تھی، اور رادھا بتاتی جاتی، یہ وہ چیز ہے، اور اس طرح تیار ہوئی ہے اور اسے خود راجکماری نے اپنے دستِ نازک سے تیار کیا ہے، ــــــ بار بار یہی بات سننے کے بعد خضر خاں نے لقمہ ہاتھ میں لیتے لیتے پوچھا :۔

"تمہاری باتوں سے تو یہ معلوم ہوتا ہے جیسے یہ سارا کھانا راجکماری ہی نے اپنے ہاتھ سے پکایا ہے!"

رادھا نے کہا :۔

"تو کچھ جھوٹ ہے؟ ــــــــ سچ، سب راجکماری کے ہاتھ کا پکا ہوا ہے۔ بیچاری دن بھر تو کام میں لگی رہیں، دوپہر کا کھانا تک اسی مصروفیت میں نہیں کھایا!"

دیول دیوی بول پڑی :۔

"چپ بھی رہے گی یا نہیں؛ کیوں خواہ مخواہ کی باتیں بنائے جا رہی ہے، (پھر شہزادے سے مخاطب ہو کر) یہ یونہی باتیں کیا کرتی ہے، آپ کھائیے!"

شہزادے نے جواب دیا:-

"رادھا دیوی کی باتوں میں سچائی جھلک رہی ہے۔ رادھا کی باتوں کی تصدیق آپ کے جھکے اور اُترے ہوئے چہرے سے بھی ہو رہی ہے۔ واقعی یہی بات ہے، آپ دن بھر ملکان رہیں، فاقہ سے رہیں اور اب بھی یونہی بھوکی بیٹھی ہیں! ——— جب تک آپ نہیں کھائیں گی میں بھی نہیں کھاؤں گا!"

یہ کہہ کر شہزادہ خضر خاں نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ دیول دیوی نے ذرا بُرا مانتے ہوئے کہا:-

"آپ رادھا کی بات کا تو اعتبار کر لیتے ہیں، لیکن میری بات نہیں مانتے ———!"

خضر خاں:- "اس میں اعتبار اور عدمِ اعتبار کا کوئی سوال نہیں، اچھا مانے لیتا ہوں، رادھا جھوٹی ہے اور آپ سچ کہہ رہی ہیں لیکن یہ بھی تو غور کیجئے مہمان کی خاطریں تو نہیں کی جاتی، کہ اس کے آگے کھانا لاکر رکھ دیا جائے، اور خود میزبان دُور بیٹھا اس کے لقمے گنتا ہے!"

دیول دیوی ہنس پڑی، کہنے لگی:-

"آپ کھائیے' میں بھی کھالوں گی!"

خضر خاں۔ "یہ تو مجھے یقین ہے کہ آپ کھالیں گی لیکن میرے ساتھ کیوں نہ کھائیے، آخر اس میں کیا قباحت ہے؟"

دیول دیوی: "قباحت تو کوئی نہیں لیکن آپ تو ضد کرتے ہیں!"

خضر خاں:- "ہاں، یہ آپ نے ٹھیک کہا، ——— یہ میری بچپن کی عادت ہے، اب تک نہیں گئی۔ اب کیا جائے گی بھلا بڑھاپے میں؟"

دیول دیوی اپنے آپ کو بہت لئے دیئے تھی، لیکن خضر خاں کے اس فقرہ نے اسے بے ساختہ

ہنسنے پر مجبور کردیا۔ ساری کا پلّو حجاب کے طور پر اس نے مُنہ پر ڈال لیا اور کہا:۔

"آپ بوڑھے ہیں! ——— دیکھئے کھانا ٹھنڈا ہوا جا رہا ہے، ویسے ہی کچھ مزے کا نہیں۔ ٹھنڈا ہونے کے بعد اَور کسی کام کا نہیں رہ جائے گا!"

خضر خاں نے لقمہ ہاتھ سے رکھ دیا اور کہا:۔

"اگر آپ نہیں کھاتیں پھر اکیلا تو میں کھانے کا نہیں، معاف کیجئے گا!"

آخر جب کوئی چارۂ کار باقی نہ رہ گیا تو دیول دیوی دسترخوان کے دوسرے کونے پر شرمائی لجائی آ کر بیٹھ گئی، بڑے ناز سے کھانے کا تھال اپنی طرف کھینچا اور کہا:۔

"آپ مانتے ہی نہیں کسی طرح!"

خضر خاں نے کھانے کا سلسلہ شروع کرتے ہوئے کہا:۔

"لیجئے مان گیا، اب ہوئیں آپ خوش!"

دیول دیوی مسکرادی اور وہ بھی کھانے میں لگ گئی۔ دونوں کھانا کھاتے جاتے تھے اور باتیں کرتے جاتے تھے۔ دیول دیوی پرسش کر رہی تھی، چیزیں بڑھا بڑھا کر پیش کر رہی تھی، ایک ایک چیز کا تعارف کرا رہی تھی، اور خضر خاں شوق کے ساتھ کھا رہا تھا، تعریف کر رہا تھا، ثنا خوانی میں رطب اللّسان تھا۔

کھانے کے بعد خضر خاں سے رادھا نے پوچھا:۔

"سچ کہئیے گا شہزادہ صاحب، کھانا کیسا تھا؟"

خضر خاں نے خالی برتنوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:۔

"ان سے پوچھ لو۔ ان کی شہادت سب سے معتبر ہے، لیکن ہاں ایک کمی ضرور بُری طرح محسوس ہوئی!"

رادھا نے چونک کر دریافت کیا:۔

کمی ؛ بتلایئے کس چیز کی کمی محسوس کی آپ نے ؟"

بڑی سادگی اور بے ساختگی کے ساتھ خضر خاں نے کہا :۔

"چُورن کی ———— اتنے کھانے کو ہضم کرنے کے لئے چورن کی ضرورت شدت سے محسوس ہورہی ہے، واقعی بہت زیادہ کھا گیا ہوں !"

دیول دیوی نے ہنستے ہوئے کہا :۔

"اتنا بھی نہ بنایئے ہمیں ———— بھلا کھایا کیا ہے آپ نے ؟"

دلی تک کا سفر تقریباً ڈھائی ہفتہ میں طے ہوا، اور اس مدت میں کوئی دن ایسا نہیں گزرا کہ شہزادہ خضر خاں کے حسنِ اخلاق، کرم گستری، انسانیت، شرافت اور لطف و عنایت کی وہ قائل نہ ہوتی گئی ہو۔

ایک مرتبہ دلی پہنچنے سے کوئی دو دن پہلے حسبِ معمول یہ قافلہ سرگرم سفر تھا۔ داہنے بائیں آگے پیچھے مسلح سپاہیوں کی قطاریں تھیں، ایک سفید براق گھوڑے پر خضر خاں بصد شان و شکوہ سوار تھا ایک پرماجکماری دیول دیوی پیکر رعنائی بنی متمکن تھی، رادھا بھی پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ لیکن ان دونوں سے کافی فاصلہ پر۔ اتنے میں خضر خاں سے دیول دیوی نے کہا :۔

"یہ سامنے جو پہاڑ سا نظر آرہا ہے کتنا سرسبز ہے۔ ہر طرف گل بوٹے دکھائی دے رہے ہیں بادل چھائے ہوئے ہیں، اور بوندا باندی بھی ہو رہی ہے، یہ منظر تو آنکھوں میں کُھبا جارہا ہے —— کیا ایسا نہیں ہوسکتا آج ہمارا پڑاؤ یہیں ہو۔ پھر کل یہاں سے آگے بڑھیں ؟"

خضر خاں نے بڑی مستعدی کے ساتھ جواب دیا :۔

"کیوں نہیں ہوسکتا ——— اگر آپ کہیں تو ہم ایک دن کیا دو تین دن ٹھہر جائیں گے"

مقصد تو آپ کو آرام پہنچانا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، آپ تھک گئی ہیں؟"

ہوا زور زور سے چل رہی تھی، دیول دیوی کی بڑی بڑی زلفیں بار بار مُنہ پر چھا جاتی تھیں، آ آ کر۔ وہ تمکنت اور کسی قدر برہمی کے ساتھ ہر بار انہیں جھٹک دیتی تھی، ایک مرتبہ بڑے اندازِ دلربائی سے زلفوں کی یورش سے اپنے آپ کو بچاتے ہوئے کہا:۔

"آرام تو اس سفر میں مجھے وہ مل رہا ہے جو کسی کو گھر پر بھی نہیں مل سکتا۔ لیکن یہ منظر کچھ ایسا بھا رہا ہے کہ سفر جاری رکھنے کا جی نہیں چاہتا بشرطیکہ آپ کے پروگرام میں خلل نہ پڑے، ورنہ کوئی بات نہیں!"

خضر خاں نے فوراً حکم دے دیا کہ سامنے کی پہاڑی پر آج پڑاؤ ہوگا۔ حکم کی دیر تھی۔ فوراً اس چھوٹی سی پہاڑی پر چھولداریاں نصب کر دی گئیں۔ خیمے ایستادہ ہو گئے۔ ریل پیل اور چہل پہل کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ یہی مقام جو اب تک بالکل ویران اور سنسان تھا، دیکھتے دیکھتے ایک چھوٹا سا شہر بن گیا اور وہی گہما گہمی قائم ہو گئی جو ایک آباد اور پُر رونق شہر میں ہوتی ہے!

دیول دیوی بہت خوش تھی۔ کچھ اس منظر کی رومان انگیزی نے، کچھ روح کی بشاشت نے اسے غیر معمولی طور پر مسرور و متبسم بنا رکھا تھا۔ جب وہ اپنے خیمہ کی طرف جانے لگی، تو اس نے خضر خاں سے کہا:

"آج میرا جی چاہ رہا ہے کہ پکوان پکاؤں، کیا آپ تھوڑی دیر میں اس طرف تشریف لانے کی زحمت گوارا کریں گے؟"

خضر خاں نے آمادگی کے ساتھ کہا:۔

"کیوں نہیں؟ ——— انتظامات درست کرا کے ابھی آتا ہوں۔ لیکن پکوان کیا چیز ہوتی ہے؟ میں نے تو یہ نام پہلی مرتبہ سُنا ہے!"

دیول دیوی ایک جانستاں انداز سے مسکرائی، پھر بولی:۔

"بڑی اچھی چیز ہوتی ہے اور وہ اس موسم میں اور ایسے ہی موقع پر پکائی جاتی ہے جب رم جھم بارش ہو رہی ہو، پھواریں پڑ رہی ہوں، آسمان پر کالے کالے بادل چھائے ہوں!"

بڑے اشتیاق اور تعجب کے ساتھ خضر خاں یہ باتیں سنتا رہا۔ پھر اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی، اور جاتے جاتے کہا:۔

"آپ تیاریاں کیجئے، میں ابھی آیا!"

دیول دیوی اپنے خیمہ میں پہنچی اور اس نے رادھا سے کہا:۔

"اری سنتی ہے نہ ابھی آئیں گے، میں نے ان سے پکوان کو کہہ دیا ہے!"

رادھا مسکرائی۔ پھر اس نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا:۔

"بھگوان خیر کریں، ——— آخر یہ پکوان کا معاملہ کب طے ہو گیا؛ ہم نے تو ذکر ہی نہیں سنا؛ ——— اچھا بھئی، ہم تو حکم کے بندے ہیں!"

اور پھر وہ رسوئیا کی مدد سے پکوان کی تیاریوں میں لگ گئی۔ جب سب سامان تیار ہو گیا۔ انگیٹھی میں آگ دہک گئی، کڑھائی رکھ دی گئی اور گھی کڑکڑانے لگا، تو دیول دیوی بہ نفسِ نفیس آ کر بیٹھی، اور مختلف و متنوع چیزیں آن کی آن میں تیار ہونے لگیں، اتنے میں خضر خاں آ گیا، وہ سراپا اشتیاق تجسس بنا ہوا تھا، اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ یہ پکوان آخر ہے کیا بلا! اسے آتے دیکھ کر دیول دیوی نے رادھا سے کہا:

"لو وہ آ گئے ——— میں کڑھائی سے گرم گرم پکوان اتارتی جاتی ہوں، تم ان کے سامنے پروستی (چنتی) جاؤ!"

رادھا نے تعمیلِ حکم کی اور شہزادہ خضر خاں نے خوب شکم سیر ہو کر کھایا اور بہت لطف لیا۔ رادھا اب خضر خاں کے سامنے ذرا شوخ ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے کچھ چیزیں اور لا کر شہزادے کے سامنے رکھیں، اور بڑے منت بھرے لہجہ میں کہا:۔

"یہ اَور کھا لیجئے!"

خضر خاں نے معذرت کرتے ہوئے جواب دیا:۔

"نہیں بھئی، اب ذرا بھی گنجائش نہیں ہے، معافی چاہتا ہوں!"

رادھا بولی:۔

"اچھا نہ کھلیئے، کہے دیتی ہوں جا کر راجکماری سے۔ اُنہوں نے تو بڑے داعیہ سے کہا تھا شہزادہ صاحب اسے کھائیں گے تو اُنگلیاں چاٹیں گے، بہت دنوں تک یاد رہے گی اس کی لذّت!"

خضر خاں سٹ پٹا گیا، اس نے سونے کے تھال کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا:۔

"نہیں راجکماری سے کچھ نہ کہو، کھائے لیتا ہوں!"

رادھا مسکرانے لگی، بلکہ دانتوں تلے اُنگلی داب کر ہنسی روکنے کی کوشش کرنے لگی، اور پھر خالی تھال لے جا کر راجکماری کو یہ ساری کتھا بڑے مزے لے لے کر سنا دی۔ راجکماری توجّہ سے یہ باتیں سنتی رہی پھر مُسکرا دی۔

سارا راستا اسی طرح کٹا۔ ہر روز دونوں ایک دوسرے سے قریب تر ہوتے گئے۔ ایک دوسرے کے دل کی دھڑکنیں سُنتے رہے، یہاں تک کہ دلی پہنچ گئے، دلی آئے ہوئے سات دن ہو چکے تھے مگر نہ خضر خاں محل آیا، نہ راجکماری سے ملا۔ دیول دیوی کو بڑی سخت حیرت تھی کہ یہ ماجرا کیا ہے، آج جب وہ آتا نظر آیا تو اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا، وہ اضطراب و بیتابی کے ساتھ پیشوائی کے لئے بڑھی، اور اسے لا کر مسند پر بٹھا دیا۔ رادھا اور سنجوگتا کھسک گئیں، یہ دونوں تنہا رہ گئے!

زہر کی پُڑیا!

دونوں گم صم آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ ایک دوسرے کے قریب لیکن ایک دوسرے سے دُور، دونوں کے رنگِ رخ سے فکر و اضطراب اور افسردگی و اضمحلال کا اندازہ ہو رہا تھا۔ دونوں دل ہی دل میں کسی گتھی کو حل کرنے میں مصروف تھے لیکن وہ گتھی حل ہوتی نظر نہیں آتی تھی!

بڑی دیر کے بعد شہزادہ خضر خاں نے کہا:۔

"راجکماری! آپ کا مزاج کیسا ہے؟ کچھ پریشان اور افسردہ سی نظر آ رہی ہیں آپ، کوئی خاص بات تو نہیں؟"

وہ پھیکے تبسم کے ساتھ گویا ہوئی:۔

"نہیں شہزادے، اس کے سوا کوئی خاص بات نہیں کہ آپ یہاں تشریف فرما ہیں!"

خضر خاں شرمندہ سا ہو گیا۔ اس نے کہا:۔

"یہ آپ نے طنز کیا ہے لیکن آپ کو کیا معلوم، مجھ پر کیا گزرتی رہی؛ مَیں کس مصیبت میں مبتلا رہا؛ میرے دل و دماغ پر کیسے کیسے ستم ٹوٹتے رہے؟"

یہ باتیں سُن کر راجکماری دیول دیوی پریشان ہو گئی۔ شکوہ و شکایت کا دفتر بند کر کے اُس نے

پرسش احوال شروع کردی۔

"بھگوان کے لئے زیادہ پریشان نہ کیجئے۔ ——— ہاں میں بھی دیکھ رہی ہوں آپ کا چہرہ اُترا ہوا ہے، آپ ہر وقت مسکراتے رہتے تھے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آپ کے ہونٹ مسکرانا بھول چکے ہیں"

خضر خاں نے پہلو بدلتے ہوئے جواب دیا:۔

"ہاں راجکماری یہی بات ہے، میرا چہرہ اُترا ہوا ہے، میرا دل پریشان ہے، میرا دماغ جواب دیتا جا رہا ہے اور میرے ہونٹ مسکرانا بھول چکے ہیں، شاید وہ بھی نہ مسکرا سکیں گے!"

دیول دیوی کی پریشانی اور زیادہ بڑھ گئی۔ اس نے ہمہ تن اضطراب بن کر سوال کیا:۔

"وہی تو پوچھ رہی ہوں آخر یہ حالت کیوں ہوگئی ہے؛ پہلے تو میں یہ سمجھی تھی کہ شاید آپ کے ماتھے کا زخم جو ڈاکوؤں سے لڑتے ہوئے لگا تھا کچھ بگڑ گیا ہے، اس لئے آپ نہیں آئے لیکن وہ تو اچھا دکھائی دے رہا ہے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا، کیوں اتنے بیکل اور دُکھی نظر آرہے ہیں؟"

خضر خاں کی اضطراری کیفیت بدستور قائم تھی۔ اس نے آہ کو روکتے لیکن تقریباً کراہتے ہوئے کہا

"کیا کہوں راجکماری؟ ——— ہاں یہ سچ ہے کہ ماتھے کا زخم اچھا ہوگیا۔ یہ تو راستے ہی میں اچھا ہو چکا تھا، لیکن ایک اور زخم ہے جو اس سے کہیں زیادہ کاری ہے، اور اس کے اچھے ہونے کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی، شاید وہ زندگی بھر یونہی رہے گا!"

دیول دیوی اپنی ساری شکایت آمیز باتیں بھول چکی تھی۔ اسے اب صرف خضر خاں کی خیریت مطلوب تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے اپنے لرزتے ہوئے ہونٹوں پر قابو پاتے ہوئے کہا:

"شہزادے! اب میں ضبط نہ کرسکوں گی۔ مجھ پر رحم کیجئے، آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؛ صاف صاف کہہ دیجئے، آپ کی یہ حالت دیکھ کر میرا دل خون کے آنسو رو رہا ہے!"

خضر خاں کے دل نے تسلی کی ان باتوں سے اپنائیت کے اس سلوک سے سکون سا محسوس کیا،

اس نے کہا:۔

"بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں، جن کا کہنا مشکل ہوتا ہے، وہ صرف دیکھی جا سکتی ہیں، سمجھی جا سکتی ہیں ــــــ کیا آپ اب تک کچھ بھی نہ سمجھ سکیں، کچھ بھی نہ دیکھ سکیں۔ کیا آپ سے بھی کہنے کی، سمجھانے کی ضرورت ہے؟ کیا یہ جھوٹ ہے کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے؟ کیا یہ غلط ہے کہ دل جس طرف کھنچتا ہے اُسے اپنی طرف کھینچتا بھی ہے؟"

یہ کہتے کہتے خضر خاں کی آواز لرزنے لگی، اس کے ہونٹ کانپنے لگے، اس کی آنکھیں رازِ نہاں کی چغلی کھانے لگیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا آج وہ دل کی کوئی بات چھپائے گا نہیں، سب کچھ کہہ ڈالے گا۔ اس نے اپنی حالت پر قابو پاتے ہوئے کہا:۔

"مَیں دُنیا کی دلچسپیوں میں حصّہ لیتا تھا، بزم آرائیوں میں شریک ہوتا تھا، سیر و شکار میرا مرغوب ترین مشغلہ تھا، شعر و شاعری کی انجمنیں میرے دم سے آباد تھیں، رعنائیاں اور زیبائیاں میرے جلو میں چلتی تھیں، جو چاہتا پا لیتا تھا، جو کہہ دیتا ہو جاتا تھا۔ لیکن اب وہی مَیں ہوں جس کے لئے یہ دُنیا سُونی ہے، جو بزم و انجمن سے اپنا رشتہ منقطع کر چکا ہے جسے سیر و شکار سے کوئی دلچسپی نہیں، جو شعر و سخن کی انجمن میں قدم نہیں رکھتا، جس کی نظر میں ہر رعنائی قبیح اور ہر زیبائی بدمنظر بن چکی ہے، جب سے آنکھوں میں کسی کا جلوہ بسا ہے، ہر جلوہ بے رنگ ہو چکا ہے۔ جب سے دل میں کسی کا تیر چبھا ہے ہر کلفت معدوم ہو چکی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے ایک بہت بڑی نعمت مِل گئی ہے لیکن یہ بھی محسوس ہو رہا ہے، جیسے وہ نعمت چھن بھی گئی ہے۔ جب سے آیا ہوں مَیں ہوں اور میرا گوشۂ تنہائی۔ والدِ نامدار کی خدمت میں سلام کے لئے حاضر ہونے کا ضرور گنہگار ہوں لیکن ــــــــ"

دیول دیوی بڑے صبر و سکون سے شہزادے کی یہ باتیں سُن رہی تھی۔ اس کا ایک رنگ آ رہا تھا ایک جا رہا تھا۔ کبھی چہرہ دمک اُٹھتا، کبھی تمتما جاتا، کبھی شگفتگی سی نمودار ہوتی، کبھی فکر و اضطراب کی گھٹائیں

چھا جاتیں، کبھی ہونٹ مسکرانے کی کوشش کرنے لگتے۔ کبھی بے کلی کی کیفیت نمایاں ہو جاتی، کبھی ایک پہلو پر بیٹھتی، کبھی دوسرے پر، کئی دفعہ ایسا معلوم ہوا جیسے وہ قطع کلام کر کے کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن وہ ایسا نہ کر سکی۔ اب خاموش رہنا ناممکن ہو گیا تو اُس نے نظریں جھکائے جھکائے کہا:۔

"شہزادہ صاحب! یہ تو تصویر کا ایک ہی رُخ ہے جو آپ نے پیش کیا۔ کبھی دوسرا رُخ دیکھنے کی بھی زحمت گوارا کی ہوتی، تو شاید آپ کی یہ کیفیت نہ ہوتی!"

اندھیرے میں روشنی کی کرن پھوٹی۔ خضر خاں کو راستہ مل گیا۔ اُس نے بیقراری کے ساتھ پوچھا:۔
"کیا آپ سچ کہتی ہیں؟ کیا میں یقین کر لوں؟ کیا واقعی میں دُنیا کا سب سے زیادہ خوش نصیب انسان ہوں؟"

راجکماری دیول دیوی کی آنکھیں زمین پر گڑی ہوئی تھیں۔ لیکن وہ کہہ رہی تھی:۔
"یہ میں کچھ نہیں جانتی۔ اگر آپ خاموشی کی زبان نہیں سمجھ سکتے تو پھر گویائی کی زبان بھی کام نہیں دے سکتی۔ بہتر ہے کہ مجھ سے کچھ کہلانے کی کوشش نہ کیجئے!"

خضر خاں کی مُردہ اُمیدوں میں زندگی کی لہر پیدا ہو گئی۔ لیکن مشکلاتِ راہ اور موانع کا دھڑکا بھی لگا تھا۔ اس نے کہا:۔

"لیکن راجکماری سب سے زیادہ جس چیز نے مجھے فکر مند کر رکھا ہے، وہ یہ ہے کہ ہماری یہ معصوم، پاک اور بے داغ محبت پروان کس طرح چڑھے گی؟ ——— کیا دُنیا والے اسے پروان چڑھنے دیں گے؟"

خضر خاں کی طرف دیول دیوی نے تیوری چڑھا کر دیکھا اور ذرا تیکھے لہجہ میں کہا:۔
"میں عورت ہوں، آپ مرد ہیں، جن مشکلات اور موانع کے خوف سے آپ اتنے پریشان ہیں، میں تو اُنہیں خاطر میں بھی نہیں لاتی ——— !"

خضر خاں چونک پڑا۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا، اس نے سوال کیا :۔

"کیا کہہ رہی ہو راجکماری ؟ کیا تم نے اپنی بات کے نتائج اور عواقب پر بھی غور کیا ہے ؟"

وہ عزم و آہنی کا پیکر بنی بیٹھی تھی۔ اس نے بڑی استقامت کے ساتھ کہا :۔

"بے شک، محبت کوئی گناہ نہیں اگر وہ پاک ہو، برائی نہیں اگر وہ بے داغ ہو، پاپ نہیں میرا جسم ہتھکڑی اور بیڑی میں قید رکھا جا سکتا ہے اسے لوہے کی سلاخوں میں بند کیا جا سکتا ہے لیکن کیا دُنیا میں کوئی طاقت ایسی بھی ہے جو دل کو قید کر سکے ؟ اسے ہتھکڑی اور بیڑی میں مقید کر سکے ؟ اسے لوہے کی سلاخوں میں جکڑ دے ؟ نہیں شہزادے صاحب ایسی کوئی طاقت نہیں ہے میرا دل ہمیشہ میرے قبضہ میں رہے گا، آپ اپنے بارے میں سوچئے میرے بارے میں بےفکر رہئے !"

یہ باتیں دیول دیوی نے کچھ ایسے طنطنہ کے ساتھ کہیں کہ خضر خاں مرعوب سا نظر آنے لگا۔

دیول دیوی کا سلسلۂ کلام ابھی جاری تھا، وہ کہہ رہی تھی :۔

"میرے باپ کرن سنگھ نے خلجی کی فوجوں سے شکست کھائی۔ اس نے پالم پور کی پناہ قبول کی اور مجھے ولی عہد پالم پور گوبند پرشاد کی ہوس پر قربان کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے گوبند پرشاد سے میری شادی کر دی۔ حالانکہ وہ جانتا تھا، میں اس سے نفرت کرتی ہوں۔ میں نے یہ شادی قبول کر لی، حالانکہ اس وقت تک میں محبت کے معنی نہیں جانتی تھی۔ کوئی انسان میری زندگی میں داخل نہیں ہوا تھا۔ نفرت کے جذبہ سے واقف تھی، محبت کے جذبہ سے ناآشنا، سارا ماحول میرا مخالف تھا، سارا محل میرا عزم توڑنے پر تُلا ہُوا تھا۔ روپیہ، فوج، پولیس ہر چیز میرے خلاف استعمال ہو سکتی تھی لیکن آپ جانتے ہیں میں نے کیا کیا ؟"

خضر خاں بڑے انہماک اور استغراق کے عالم میں دیول دیوی کی باتیں سن رہا تھا۔ اس سوال پر چونک پڑا، اس نے کہا :۔

"نہیں میں نہیں جانتا تم نے کیا کیا؛ لیکن معلوم کرنا چاہتا ہوں، یقیناً کوئی بہت عجیب بات ہوگی!"

دیول دیوی مسکرانے لگی۔ اُس نے زلفوں کے بیچ سے کاغذ کی ایک پڑیا نکال کر خضر خاں کے سامنے رکھ دی۔ خضر خاں نے پوچھا:۔

"یہ کیا ہے راجکماری؟"

دیول دیوی کا تبسم اور نمایاں ہوگیا، اس نے بڑے ناز اور بڑے تیور کے ساتھ کہا:۔

"یہ زہر ہلاہل ہے شہزادے! ——— میں نے یہ طے کر لیا تھا کہ پالم پور پہنچنے کے بعد عین اس وقت جب اس شادی کی رنگ رلیاں جاری ہوں گی، سارے شہر میں دھوم دھام ہو رہی ہوگی۔ چراغاں نے ایک سماں پیدا کر دیا ہوگا۔ محل کے رہنے والے لوگ خوشی سے سرمست ہوں گے، گوبند پرشاد کا باپ بیٹے کو دولھا بنا دیکھ رہا ہوگا، خود گوبند پرشاد نشاط و طرب کا مجسمہ بنا ہوا سیراہا بن کر میرے پاس آئے گا، تب یہ زہر شربت میں آمیز کر کے خود پیوں گی اور اسے پلا دوں گی۔ خود مروں گی اور اس کی جان بھی لے لوں گی، اور اس طرح پالم پور کو ماتم کدہ بنا دوں گی کہ دل کو خریدنے کی کوشش کا انجام یہ ہوتا ہے! وہ تو خیریت گزری کہ راستہ میں آپ سے مڈبھیڑ ہوگئی اور میں پالم پور جانے کے بجائے دلّی چلی آئی!"

یہ باتیں سن کر خضر خاں ششدر رہ گیا۔ وہ دل ہی دل میں حیران ہو رہا تھا کہ یہ نازک اندام راجکماری کتنے قوی اور مضبوط دل کی مالک ہے۔ اس کا عزم واقعی ٹکر لے سکتا ہے ہر قوت سے۔ اس نے عقیدت، محبت اور یگانگت کی نظروں سے دیول دیوی کو دیکھتے ہوئے کہا:۔

"لیکن اب تو آپ محفوظ جگہ پہنچ چکی ہیں۔ اب تو کوئی خطرہ آپ کو لاحق نہیں رہا۔ پھر یہ زہر کی پڑیا اب تک آپ کے پاس کیوں ہے؟"

دیول دیوی نے اسی عزم اور طنطنہ کے ساتھ جواب دیا:۔

"جب تک میری زندگی کا راستہ متعین نہ ہو جائے، اس وقت تک اس کی ضرورت باقی رہے گی ——— میں اب بھی بے بس ہوں، بے کس ہوں، بے سہارا ہوں، زندگی کا راستہ متعین کر سکتی ہوں، لیکن اس پر قدم نہیں رکھ سکتی۔ راستہ کا فیصلہ ماتاجی کے ہاتھ میں ہے شہنشاہِ ہند کے ہاتھ میں ہے ہو سکتا ہے، ان کا فیصلہ وہ ہو جو میرے لئے قابلِ قبول ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ میں اسے قبول نہ کر سکوں، ——— کیا ایسے موقع پر اس پڑیا سے زیادہ بھی کوئی میرا رفیق اور مشکل کشا ہو سکتا ہے؟"

یہ باتیں سُن کر خضر خاں کانپ گیا۔ اس نے تھرّاتی ہوئی آواز میں کہا۔

"راجکماری! اس طرح کا خیال دل سے نکال ڈالو، جب تک میں زندہ ہوں اس پڑیا کی ضرورت تمہیں نہیں پیش آئے گی۔ کیا تم مجھے اتنا بے حمیت سمجھتی ہو، کیا اپنی آنکھوں کے سامنے تمہارا خون ہوتے دیکھوں گا اور چُپ چاپ بیٹھا رہوں گا!"

دیول دیوی: "اب کہ یہ سلسلہ شروع ہو ہی گیا ہے، بہتر یہ ہے کہ صاف صاف باتیں ہو جائیں۔ آپ نے محبت کا اظہار آج کیا ہے اور میں شاید اس سلسلہ میں کبھی بھی لب کشائی نہ کر سکتی لیکن جب آپ اپنا دل کھول کر میرے سامنے رکھ چکے ہیں تو میں بھی اپنی اس کمزوری کو چھپا نہیں سکتی کہ اس دل کا مالک صرف ایک ہی شخص ہے اور وہ وہی ہے جو اس وقت میرے سامنے بیٹھا ہے!"

خضر خاں کا دل یہ الفاظ سُن کر زور زور سے دھڑکنے لگا، اسے دل کی مراد مل گئی۔ اس نے دیول دیوی کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ پھول کی طرح شگفتہ تھا۔ اس کا رُوپ چاند اور ستاروں کو شرما رہا تھا۔ اس کی کنول سی بڑی بڑی آنکھیں بدستور زمین کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھیں۔ شرم اور معصومیت کا اتنا لطیف اور نازک امتزاج آج تک خضر خاں کی نظروں سے نہیں گزرا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ اُٹھے اور راجکماری کے قدموں پر اپنا سر رکھ دے۔ اس کا دل مچل رہا تھا کہ اُٹھے اور اسے آغوشِ شوق میں لے لے۔ اس کے دل میں اُمنگ پیدا ہو رہی تھی کہ حسن و جمال، رعنائی و زیبائی،

خوبی اور پاکیزگی کے اس پیکر کو آنکھوں میں رکھ لے، دل میں بٹھا لے۔ لیکن محبت کے آداب اپنا ایک مستقل مقام رکھتے ہیں، وہ یہ کچھ نہ کر سکا، صرف ایک حسرت بھری نگاہ ڈال کر رہ گیا۔ وہ جو بڑے بڑے ساونتوں اور سورماؤں، بہادروں اور دلیروں کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ جو بڑی سے بڑی مخالف فوج میں مردانہ وار کود پڑنا ایک کھیل سمجھتا تھا، جواب تک کسی قوت اور طاقت سے مرعوب نہیں ہُوا تھا جو برسرِ اور طاقتور دشمن سے پنجہ لڑانے میں ایک کیف محسوس کرتا تھا، اس وقت بے بس تھا، ایک نازک اندام لڑکی میں اتنی بڑی قوت تھی کہ وہ اس کے سامنے سر جُھکانے، اس کا احترام کرنے اور اس کی خوشنودی کا خیال رکھنے پر مجبور تھا، اس نے بڑی مشکل سے اپنے منتشر اور پراگندہ حواس پر قابو پایا اور کہا:۔

"راجکماری! تمہارے یہ الفاظ ہمیشہ میرے کانوں میں گونجتے رہیں گے۔ میرا حوصلہ بڑھاتے رہیں گے، میرے دل میں ایک نیا ولولہ اور جوش پیدا کرتے رہیں گے، مجھے کبھی مایوس اور دل گرفتہ نہیں ہونے دیں گے۔ یہ میرا سہارا ہیں، میری طاقت ہیں، میری پونجی ہیں، میرا سرمایہ بلکہ میری زندگی ہیں، تم نے مجھے نئی زندگی بخشی ہے اور اس زندگی کا اس سے بڑھ کر کوئی مصرف نہیں ہو سکتا کہ تمہارے لئے وقف ہو جائے!"

راجکماری خاموشی سے خضر خاں کی یہ باتیں سنتی رہی، خضر خاں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا:۔

"مَیں یہاں ڈرتا ہُوا، جھجکتا ہُوا آیا تھا! ——"

دیول دیوی بیچ میں بول پڑی:۔

"کیوں؟ —— کس سے ڈر رہے تھے آپ؟"

خضر خاں نے بڑی سادگی اور بے ساختگی کے ساتھ کہا:۔

"تم سے —— سوچ رہا تھا، دل کا حال کہہ بھی سکوں گا، یا نہیں؟ اور اگر کسی طرح کہہ بھی

یا، تو نتیجہ نہ جانے کیا نکلے ؟ کہیں خفا نہ ہو جاؤ، کہیں تمہاری برہمی نہ مول لے بیٹھوں ؟ کہیں لُٹے لیٹے کے دینے نہ پڑ جائیں ؟ کئی دن سے ارادہ کر رہا تھا کہ تمہارے پاس آؤں اور دل کی کتھا بیان کروں، لیکن جب ارادہ کرتا تھا، کوئی میرے قدم پکڑ لیتا تھا، بندھی ہوئی ہمت ٹوٹ جاتی تھی۔ آج آ ہی گیا اور جو کچھ کہنا تھا کہہ ڈالا!"

دیول دیوی کا پھول سا چہرہ بے حد شگفتہ اور ہشاش بشاش نظر آ رہا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے اور پہلی مرتبہ آنکھ سے آنکھ ملا کر کہا:۔

"آپ نے صرف اتنا ہی یاد رکھا کہ جو کچھ کہنا تھا کہہ ڈالا۔ یہ بھی تو یاد رکھا ہوتا، اس کے جواب میں کسی اور نے بھی تو کچھ کہا تھا!"

خضر خاں نے والہانہ سرگشتگی کے ساتھ جواب دیا:۔

"راجکماری! وہ بھی یاد ہے بلکہ لوحِ دل پر نقش ہے اسے میں کبھی نہیں بھول سکتا میں نے دل کی مراد پالی، میں نے وہ سب کچھ پالیا، جس کی مجھے ضرورت تھی، جو میں چاہتا تھا، جو میری تمنا اور آرزو تھی!"

دیول دیوی کا تبسم اب تک برقرار تھا۔ اس نے شہزادے کو چھیڑتے ہوئے کہا:۔

"گویا آپ کو اب میری ضرورت نہیں رہی، کیوں یہی بات ہے نا؟ ——— وہ سب کچھ تو آپ نے پالیا، جس کی آپ کو ضرورت تھی، جو آپ چاہتے تھے، جس کی تمنا اور آرزو تھی۔ میں ایک بیکار سی شے تھی، مجھے آپ نے چھوڑ دیا!"

خضر خاں بھی مسکرانے لگا:۔

"نہیں راجکماری! یہ جو کچھ ملا ہے تمہارے طفیل میں ملا ہے۔ تم سے ملا ہے، تم ہی نے دیا ہے اگر تمہیں چھوڑ دوں تو یہ سب کچھ بھی چھن جائے گا، پھر ویسا ہی کنگال ہو جاؤں گا جیسا یہاں آیا

تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے!"

کنگال کا لفظ راجکماری کو پسند نہ آیا، اس نے ذرا بُرا مانتے ہوئے کہا:۔

"ایسی باتیں نہ کیجئے، کنگال ہوں گے آپ کے دشمن، آپ کو کون کنگال کہہ سکتا ہے، جس کے سینہ میں اتنا شریف، پاک اور نیک دل ہو، جو دوسروں کی بپتا پر موم ہو جاتا ہو، جس کی بہادری اور شجاعت کا دشمن بھی لوہا مانتے ہوں، جس کی داد و دہش کا پرجا کے دل پر نقش بیٹھا ہو، وہ کنگال ہو سکتا ہے کہیں، اس دفعہ آپ نے کہا تو کہا، اب یہ لفظ کبھی نہ سنوں، ورنہ خفا ہو جاؤں گی!"

یہ الفاظ دیول دیوی نے کچھ ایسی سادگی اور معصومیت کے ساتھ کہے کہ خضر خاں بیتاب ہو گیا۔ اس نے کہا:۔

"نہیں، میں تمہیں کبھی خفا نہیں ہونے دوں گا۔ تمہارے خفا ہونے کے معنی یہ ہیں کہ زندگی رُوٹھ گئی، بھلا کوئی ایسا بیوقوف بھی ہو سکتا ہے جو اپنی زندگی کو خفا کر لے؟ اپنی زندگی کو روٹھ جانے دے؟"

دیول دیوی:۔ "آج تو آپ بڑی لچھے دار باتیں کر رہے ہیں، اس سے پہلے تو کبھی آپ نے اس طرح کی باتیں نہیں کی تھیں!"

خضر خاں:۔ "ہاں راجکماری! اب مَیں مایوسی کی تاریکی سے نکل چکا ہوں۔ اُمید کی دُنیا میرا نشیمن ہے، اب تک کہنے سے پہلے سوچتا تھا کہوں یا نہ کہوں؟ اب محسوس کرتا ہوں جب تک تم سامنے بیٹھی ہو مجھے خاموش نہ ہونا چاہئے، جو جی میں آئے کہتا رہوں یہاں تک کہ تم سنتے سنتے اُکتا جاؤ —— میرا خیال ہے اب تم اکتا چلی ہو، لہٰذا اب خاموش ہوا جاتا ہوں!"

دیول دیوی:۔ "آپ اپنی مرضی کو میرے اوپر نہ ڈھالئے —— مَیں تو ذرا بھی نہیں اُکتائی، مجھے تو آپ کی باتیں بڑی اچھی لگتی ہیں۔ جی چاہتا ہے آپ باتیں کرتے رہیں مَیں سنتی رہوں!"

یہ محبت بھرے بول راجکماری کی زبان سے اتنے بھولے پن کے ساتھ ادا ہوئے کہ ان میں ارادہ کو دخل تھا، نہ تصنع کو، شاید ان کے مفہوم کی گیرائی اور گہرائی تک بھی اس کا طائرِ خیال نہیں پہنچا تھا۔ جیسے ایک بچہ، وہ اپنے دل کی بات بے تامّل کہہ دیتا ہے، چاہے کسی کو بُری لگے یا بھلی، کوئی اس سے خوش ہو یا ناخوش، کوئی اسے محبت پر مبنی سمجھے یا نفرت پر، بالکل اسی جذبہ اور اسی لہجہ میں راجکماری نے یہ الفاظ ادا کیئے تھے۔ خضر خاں نے ان الفاظ کو محسوس کیا، اور یہ جا کر اس کے دِل پر نقش ہو گئے، اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی، اور محبّت بھری نظروں سے راجکماری کو دیکھنے لگا۔ لب گویا خاموش تھے، لیکن دل کی زبان نہ جانے کیا کیا کچھ کہہ رہی تھی۔ راجکماری نے خضر خاں کی محبت بھری آنکھوں کو اپنی طرف نگراں پایا، تو وہ شرما گئی، خود بخود اس کی آنکھیں جُھک گئیں، ——— جیسے چھوئی موئی کی پتیاں، کہ ہاتھ لگا اور وہ شرما کر سمٹ گئیں۔!

باپ کا دل!

راجکماری دیول دیوی اور شہزادہ خضرخاں کی محبت پروان چڑھنے لگی، دونوں ایک دوسرے کو دل وجان سے چاہتے تھے، دونوں کی یہ حالت تھی کہ جب تک حسرتِ دید نہ پوری کرلیں، دل کو چین نہیں ملتا تھا۔ دونوں کا یہ عالم تھا کہ جب ایک دوسرے سے دل کی داستان کہہ لیتے تھے تو کچھ سکون محسوس کرتے تھے، ورنہ پھر وہی بیقراری، وہی اشکباری، وہی سرد سرد آہیں، وہی گرم گرم آنسو۔ وہی اختر شماری اور شب بیداری، وہی بزم و انجمن سے بیزاری اور گوشۂ خلوت کی گلکاری، وہی عقلِ مصلحت اندیش کی زبوں کاری اور وہی عشقِ جنوں پیشہ کی فریاد و زاری، دن ہو یا رات، کوئی وقت ہو، کوئی موقع ہو، دونوں اپنے اپنے رنگ میں مست، نہ ماضی کی یاد اور نہ مستقبل کی فکر۔ حال کی فکر نہ اندیشہ۔ دیول دیوی لڑکی تھی، پردہ نشین تھی، ایک بلند و بالا اور رفیع المرتبت محل کی مکین تھی۔ اس کے حال سے رادھا اور سنجوگتا کے سوا کوئی واقف نہ تھا۔ خود کنول دیوی پر بھی یہ راز اب تک منکشف نہ ہو پایا تھا، وہ یہی سوچ کر اپنے دل کو تسلی دے لیتی تھی، کہ لڑکی ذات ہے، مصائب کے ہجوم سے نکل کر اب ذرا اطمینان سے زندگی بسر کرنے کا موقع ملا ہے۔ کچھ پچھلی باتیں یاد میں آتی ہوں گی، کچھ باپ کی محبت ستاتی ہوگی۔ کچھ گزشتہ شوکت و عظمت اور راحت و آسائش

کے نقوش اُجاگر ہو ہو کر زندگی کو تلخ بنا دیتے ہوں گے۔ لہٰذا یہ اضطراب، اضطرار، یہ خاموشی اور خلوت پسندی ایک حد تک بجا ہے۔ البتہ یہ صورتِ حال ہمیشہ باقی رہنے والی نہیں۔ رفتہ رفتہ وہ ماضی کو بھول جائے گی، اور حال کے ماحول میں زندگی کا نیا نقشہ بنالے گی، اور پھر اس کی شادی کسی اچھے حسب نسب کے راجکمار کے ساتھ کر دی جائے گی' یہ سوچ کر کنول دیوی اپنے دل کو تسلی دے لیتی تھی، اور معمولی پوچھ گچھ کے بعد خاموش ہو جاتی تھی۔ لیکن خضر خاں کا معاملہ بالکل برعکس تھا۔ وہ شہزادہ تھا، وہ شہزادہ ہی نہیں' ولی عہدِ سلطنت بھی تھا۔ علاؤالدین خلجی کی ساری اُمیدیں اسی کی ذات سے وابستہ تھیں، وہ بہادر تھا، اسے اَور زیادہ بہادر بننا تھا، وہ شجاع تھا، اسے اور زیادہ اپنی شجاعت کا سکّہ بٹھانا تھا، وہ دلیر تھا، اسے اَور زیادہ اپنی دلیری کا پرچم لہرانا تھا۔ وہ مہم جُو تھا اُسے اَور زیادہ معرکہ آرا، خوں ریز اور قیامت خیز مہمیں سر کرنا تھیں، جب ہی تو وہ علاؤالدین خلجی جیسے بادشاہ کی جگہ لے سکتا تھا' تب ہی تو وہ ہندوستان جیسے وسیع ملک پر بے غل وغش حکومت کر سکتا تھا، ورنہ ہندوستان کی مسندِ حکومت پر کوئی کمزور، عیش پرست اور کم حوصلہ بادشاہ حکومت نہیں کر سکتا' علاؤالدین خلجی خضر خاں کی حالت پر غور کرتا تھا اور غرقِ تحیّر ہو جاتا تھا۔ وہ دل ہی دل میں سوچا کرتا' اس ہونہار، اولوالعزم، جواں عمر، جواں سال اور جواں ہمّت شہزادہ کو کیا ہو گیا ہے؟ کتنی اُمیدیں تھیں اس کی ذات سے، کیا وہ مایوسیوں سے بدل جائیں گی؟ کتنی توقعات تھیں اس کے وجود سے' کیا ان سب پر پانی پھر جائے گا؟ اپنی اولاد میں سب سے زیادہ جس پر مجھے فخر تھا، کیا وہی لڑکا ناکارہ اور نکمّا نکلے گا؟ شعلۂ مستعجل کی طرح طلوع ہو گا اور فوراً غروب ہو جائے گا ——— ؟'

نہیں ایسا نہیں ہو گا، میں ایسا نہیں ہونے دوں گا، ! لیکن ایسا ہے کیوں؟ — خضر خاں بدل کیوں گیا ہے؟ اسے سیر و شکار کا کتنا شوق تھا' اب وہ نام بھی نہیں لیتا سیر و شکار کا، آخر کیوں؟ انجمن آرائی اس کا کتنا محبوب مشغلہ تھا، لیکن میں نے سنا ہے اب خلوت ہی اس کا محبوب

مشغلہ ہے، شعروسخن کے نغموں اور ترانوں سے اس کا ایوان ہمہ وقت گونجا کرتا تھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس نے شاعری کی بساط بھی اُلٹ کر رکھ دی ہے، ایسا کیوں ہے؛ علم وادب کی محفلوں کی وہ رونق بھی ہندو پنڈتوں اور مسلمان عالموں سے علمی بحث مباحثے کرتا تھا، اُن کے بحث مباحثے سنتا تھا، میں خود جاہل ہوں، لیکن اسے تو میں نے اچھی سے اچھی اور زیادہ سے زیادہ تعلیم دلائی ہے۔ پر اب میرے کانوں تک جو صدا آتی ہے، وہ یہ ہے کہ علم وادب کی محفلیں بھی سُونی پڑی ہیں۔ نہ شریک ہوتا ہے نہ کسی قسم کی دلچسپی لیتا ہے، یہ کیا ہو گیا ہے اسے؛ آخر وہ زندگی سے، زندگی کی امنگوں اور حوصلوں سے اتنا بے بہرہ کیوں ہو گیا ہے؛ میرا بیٹا اور ایسا بجھا بجھا، جب میری زندگی میں یہ حالت ہے تو میرے مرنے کے بعد کیا ہوگا؛ خود بھی ڈوبے گا اور اس حکومت کو بھی جسے میں نے خون پانی ایک کرکے کڑیاں جھیل کے، مصیبتیں اُٹھا کے، دُکھ برداشت کرکے، خطرات مُول لے کے، اور جان کی بازی لگا کر حاصل کیا ہے، ——— لے ڈوبے گا، کیا میری کوششوں کا، میرے مجاہدات کا، میری جانبازیوں کا، میری قربانیوں کا، میری اولوالعزمیوں کا، میری جگر کاویوں کا، میری تمناؤں اور حسرتوں کا یہی انجام ہونے والا تھا؛ کیا میں اتنا بدقسمت ہوں کہ جس پودے کو میں نے خود سینچا، بارآور کیا، اسے اپنی آنکھوں سے نذرِ خزاں ہوتے دیکھوں گا، اپنے سامنے اسے مٹتے اور تباہ ہوتے دیکھوں گا؛ ——— یہ سوچتے سوچتے زندگی میں پہلی مرتبہ علاءالدین خلجی کی آنکھیں آبگوں ہو گئیں۔ اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو ٹپکنے لگے۔ اگر وہ بہت زیادہ ضابط اور متحمل مزاج نہ ہوتا تو شاید اس وقت وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا۔

پھر اس کے دل میں خیال آیا۔ میں شہنشاہِ ہند ہوں، جو چاہتا ہوں وہ کرتا ہوں، میری بات رد نہیں کی جا سکتی۔ میرا نظامِ جاسوسی ساری دنیا میں اپنی نظیر آپ ہے۔ صرف پایۂ تخت ہی کی نہیں ملک کے دور دراز گوشوں کی ایک ایک جزو پوری تفصیل کے ساتھ مجھے ہر روز اور ہر آن ملتی رہتی ہے۔ پتہ بھی ہلتا ہے تو مجھے معلوم ہو جاتا ہے۔ گھروں کے اندر لوگ کیا باتیں کرتے ہیں؛ مجلس برخاست

ہونے سے قبل وہ باتیں میرے کانوں تک پہنچ جاتی ہیں۔ بازاروں میں اور گلیوں میں، دوکانوں میں اور خلوتکدوں میں، زنانِ بازاری کے بالاخانوں پر، اور امراء کے تہ خانوں میں جو بات ہوتی ہے، جو اسکیم زیرِبحث آتی ہے، جو سازش کی جاتی ہے، تمام جزئیات کے ساتھ مجھے ایک ایک بات کی خبر ہو جاتی ہے۔ اس طویل و عریض مُلک کا چپّہ چپّہ اور گوشہ گوشہ میری نظر میں ہے۔ اس وسیع اور فراخ ملک کا ایک ایک باشندہ میری نگاہ میں ہے۔ دُنیا کے اس بہت بڑے ملک میں کوئی بات ایسی نہیں ہوتی، جس سے مَیں ناواقف رہوں، میری تعذیب کا شکنجہ جس طرح دلّی میں اپنا کام کرتا ہے، اسی طرح دُور دست علاقوں پر بھی اس کی ہیبت چھائی ہوئی ہے۔ لیکن کس قدر حیرت کا مقام ہے کہ میرا اپنا بیٹا میرے لئے معمّا بنا ہُوا ہے، میرا لختِ جگر اور نُورِ نظر ایسی چیستان ہے جسے مَیں حل نہیں کرسکتا۔ خود میرے دارالسّلطنت میں، میری محلسرائے شاہی میں، میرے زیرِ سایہ رہنے والا، کوئی غیر نہیں میرا لڑکا ایک معمّا بن جائے اور مَیں اسے حل نہ کرسکوں، کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی شرمناک بات ہو سکتی ہے میرے لئے؛

یہ خیال آتے ہی علاء الدین خلجی اُٹھ کھڑا ہُوا ؎

جیسے کوئی چونک اُٹھے خوابِ پریشاں دیکھ کر!

اس نے محکمۂ جاسوسی کے افسرِ اعلیٰ کو اسی عالم میں طلب کیا۔ وہ لرزتا کانپتا در دولت پر حاضر ہُوا، اور ہاتھ باندھ کر مؤدّب کھڑا ہو گیا۔ علاء الدین نے رازدارانہ لب و لہجہ میں کہا:۔

"مَیں خضر خاں کی خاموشی، خلوت پسندی اور مردم بیزاری کا راز معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ وہ میرا بیٹا ہے، مجھے محبوب ہے، دلیر ہے، دلاور ہے، بہادر ہے، شجاع ہے، لیکن اسے کیا ہو گیا ہے؟ وہ کیوں سُوکھتا چلا جا رہا ہے؟ کس غم میں گھل رہا ہے؟ کون سی فکر ہے، جو اسے کھائے جا رہی ہے؟ کیا بات ہے کہ وہ بزم و انجمن سے دُور ہو گیا ہے، شعر و سخن کے چرچے اس کے سازِ دل پر کوئی اثر نہیں

کرتے۔ وہ محل میں رہتا ہے لیکن بیگانوں کی طرح وہ میرے سامنے آتا ہے میں اسے دیکھ کر کانپ جاتا ہوں، اس میں زندگی کی رمق نظر نہیں آتی۔ موت کا بھیانک اور ڈراؤنا پنجہ اس کی طرف بڑھتا اور لپکتا آتا ہے۔ میں اس کی یہ کیفیت نہیں دیکھ سکتا۔ مجھ سے اس کی یہ حالت نہیں دیکھی جاتی میں صرف علاء الدین خلجی نہیں ہوں، صرف شہنشاہِ ہندوستان نہیں ہوں، صرف سپہ سالار اور سپاہی نہیں ہوں، انسان بھی ہوں، باپ بھی ہوں، میرے سینہ میں بھی دل ہے اور وہ دل دھڑکتا بھی ہے، تڑپتا بھی ہے، سلگتا بھی ہے، میں خضر خاں کو چاہتا ہوں اور اسے زندہ رکھنے کے لئے، اسے خوش دیکھنے کے لئے سب کچھ کرسکتا ہوں لیکن معلوم تو ہو بات کیا ہے؟ یہ معمہ جب تک حل نہیں ہو جاتا، مجھ پر خواب و خور حرام رہے گا، مجھے کسی چیز میں لطف نہیں آتا۔ ہر وقت اس کی مضمحل اور افسردہ تصویر میری آنکھوں کے سامنے پھرا کرتی ہے۔ اور جب بھی یہ تصویر تصور کی آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے میں تڑپ جاتا ہوں اور میری یہ کیفیت ہو جاتی ہے کہ زندگی سے دِل سیر ہو جاتا ہے!"

یہ کہتے کہتے اس شخص کی آنکھیں نم آلود ہوگئیں، جس کی دہشت سے شیروں کا پتہ پانی ہوتا تھا جس کا نام سُن کر بڑے بڑے ساونتوں اور سورماؤں کے دل دہل جاتے تھے، ——— جس کی ہیبت اور طنطنہ سے ہندوستان کے پہاڑ اور دریا تک لرزتے اور کانپتے تھے، ——— وہ سب کچھ تھا لیکن ایک انسان بھی تھا، ایک باپ بھی تھا، اس کے سینہ میں بھی دل تھا، اور یہ دل دھڑکتا بھی رہتا تھا!

افسرِ اعلیٰ علاء الدین کی یہ کیفیت دیکھ کر بہت متأثر ہُوا، وہ اپنے آقا کے قدموں پر گر پڑا۔ اس نے اپنے آقا کے قدموں کو بوسہ دیتے ہوئے باچشمِ اشکبار اور باگریۂ گلوگیر رُک رُک کر کہا:۔

"میرے آقا! آج میں نے آپ کا دِل دیکھ لیا، اسے پڑھ بھی لیا، اسے پا بھی لیا۔ میں نے جان لیا، اس دل میں شفقت بھی ہے، اس میں محبّت کا دریا بھی لہریں مارتا رہتا ہے۔ اس میں رحم بھی ہے

اور اس میں درد اور دکھ کی پاسداری بھی ہے۔ میں ہر قیمت پر اس معمّہ کو حل کروں گا، اور جب تک حل نہ کر لوں گا، مجھ پر بھی خواب و خور حرام رہے گا!"

افسرِ اعلیٰ کی ان باتوں سے خلجی کا دل ذرا ٹھہرا۔ پھر اس نے کہا:۔

"لیکن میں تمہیں زیادہ مہلت نہیں دے سکتا، کل دربارِ عام کے وقت تمہیں موجود ہونا چاہیے ——— اس طرح کہ معاملہ حل ہو چکا ہو، کیا اس کا وعدہ کرتے ہو؟"

افسرِ اعلیٰ نے سرِ بندگی خم کرتے ہوئے کہا:۔

"وعدہ کرتا ہوں جہاں پناہ!"

اور پھر وہ فوراً باہر چلا گیا۔

مردِ مومن!

دُوسرا دن طلوع ہوا۔ روزانہ کارروائی کے تکمیل پا جانے کے بعد علاء الدین اپنے ایوانِ خاص کی طرف روانہ ہوا محکمۂ جاسوسی کے افسرِ اعلیٰ سے اس نے کہا:۔

"تم میرے ساتھ آؤ!"

اور سب لوگ چلے گئے۔ علاء الدین خلجی افسرِ اعلیٰ کو لے کر ایوانِ خاص میں پہنچا۔ مسند پر متمکن ہونے کے بعد علاء الدین نے افسرِ اعلیٰ سے کہا:۔

"ہم نے جو کام سونپا تھا، وہ انجام پایا؟"

افسرِ اعلیٰ: "جہاں پناہ کے خانہ زاد ہر ذمہ داری کو خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ظلّ اللہ نے اس خانہ زاد کو جس کام پر معمور کیا تھا وہ اس نے انجام دے لیا!"

یہ سنتے ہی علاء الدین کی برہمی دُور ہو گئی۔ اس کا چہرہ پھول کی طرح شگفتہ ہو گیا۔ وہ مسکرانے لگا۔ اس نے اطمینان و دلجمعی کے ساتھ کہا:۔

علاء الدین خلجی: "تم نے معلوم کر لیا، خضر خاں کی اس اضطراب انگیز کیفیت کا راز کیا ہے؟"

افسرِ اعلیٰ: (مطمئن لہجہ میں) "معلوم کر لیا جہاں پناہ!"

علاءالدین خلجی :۔ "تو بتاتے کیوں نہیں، جلد کہو، ہم سننا چاہتے ہیں، ہم معلوم کرنا چاہتے ہیں اس راز کو!"

افسرِ اعلیٰ :۔ "خانہ زاد نے وہ راز معلوم تو کرلیا، لیکن وہ عجب کشمکش میں مبتلا ہے!"

علاءالدین خلجی :۔ "کشمکش؟ ـــــــ ہمارے دربار میں؟ ہمارے حضور میں؟ ہمارے سامنے؟ وہ کونسی کشمکش ہے جس نے تمہاری قوّت گویائی سلب کرلی ہے؟ اور تم خاموش رہنے پر مجبور ہو؟"

افسرِ اعلیٰ :۔ "جہاں پناہ! اس کشمکش نے غلام کو رات بھر سونے نہیں دیا۔ ع

گویم مشکل و گرنہ گویم مشکل!

کا معاملہ ہے، نہ کہتے بنتی ہے نہ خاموش رہنا ممکن نظر آتا ہے!"

علاءالدین خلجی :۔ "نہیں، خاموش رہنے کی ضرورت نہیں، بغیر اندیشہ اور تأمل کے جو کچھ کہنا چاہتے ہو، کہو، جو کچھ بھی تم نے معلوم کیا ہے کہہ ڈالو۔ تم ہماری امان میں ہو، تمہارا کوئی بال بھی بیکا نہیں کرسکتا!"

افسرِ اعلیٰ :۔ "جہاں پناہ! شہزادہ خضر خاں محبّت کے مرض میں مبتلا ہیں!"

علاءالدین خلجی :۔ (حیرت سے) "میرا بیٹا محبّت کرنے لگا ہے کسی سے؟ ـــــــ لیکن کس سے؟"

افسرِ اعلیٰ :۔ "راجکماری دیول دیوی سے! ـــــــ جو رانی کنول دیوی کی لڑکی ہے!"

یہ سُن کر علاءالدین سنّاٹے میں آگیا۔ یہ اتنی اچانک اور غیر متوقّع بات اسے معلوم ہوئی تھی، جس کا وہ وہم و گمان بھی نہ کرسکتا تھا۔ بے ساختہ اس کے مُنہ سے نکل گیا:۔

"آہ کمبخت نے محبّت کی تو کس سے؟ آنکھ وہاں لڑائی، جہاں حصُولِ مقصد میں کامیابی کسی طرح ممکن نہیں، وہ دُنیا کی کسی شاہزادی سے محبّت کرتا میں اس کے ساتھ تھا لیکن اس معاملہ میں اس کا ساتھ نہیں دے سکتا خواہ وہ مرہی کیوں نہ جائے!"

علاءالدین بے تابی اور اضطراب کے عالم میں مسندِ شہریاری سے اُٹھ کر ٹہلنے لگا۔ افسرِ اعلیٰ حیرت

اور تعجب کے عالم میں اس کی یہ کیفیت دیکھ رہا تھا۔ آخر اس سے نہ رہا گیا۔ اس نے بڑے ادب کے ساتھ کہا:

"جہاں پناہ کو دیول دیوی میں کوئی خرابی نظر آتی ہے؟"

علاء الدین نے بھڑک کر جواب دیا:-

"نہیں، دیول دیوی ہر اعتبار سے لاجواب ہے۔ صورت و سیرت میں کوئی اس کا ہمسر نہیں۔ میرے لئے اس سے بڑھ کر فخر و مسرت کی کوئی بات نہ تھی، کہ وہ میری بہو بنتی۔ لیکن شاید تمہیں معلوم نہیں، اس کی شادی ہو چکی ہے۔ وہ ایک شخص کی بیوی ہے۔ یہاں وہ اس لئے آئی ہے کہ اپنی ماں سے ملے۔ اس لئے نہیں آئی ہے کہ آنکھ لڑائے۔ محبت کرے، شادی رچائے اور شوہر کو چھوڑ دے، کیا تم نہیں جانتے ہندو عورتیں کتنی شوہر پرست ہوتی ہیں؟ ضرور وہ اپنے شوہر کو دل و جان سے چاہتی ہوگی۔ ہم اتنا بڑا کام نہیں کر سکتے کہ ایک بیوی کو اُس کے شوہر سے چھین لیں۔ ایک شوہر سے اس کی بیوی کو جُدا کر دیں۔ ہمیں خدا کو مُنہ دکھانا ہے، خدا کے حضور میں حاضر ہونا ہے، اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہے۔ اتنی بڑی سفّاکی کا کام ہم سے نہیں ہو سکتا، ——— خضر خاں کو یہ محبّت اپنے دل سے کھُرچنی ہوگی! ——— اس کے سوا کوئی صورت نہیں۔ ہمیں یہ سوچ کر دُکھ ہوتا ہے، کہ اگر کہیں یہ بھنک دیول دیوی یا کنول دیوی کے کانوں میں پڑ گئی، تو وہ اس نالائق کے بارے میں کیا رائے قائم کریں گی؟ ان کی نظر میں ہماری کیا وقعت رہ جائے گی؟ ——— ہم نے خضر خاں کی ذات سے بڑی بڑی اُمیدیں قائم کر رکھی تھیں، لیکن وہ نالائق نکلا۔ اس نے ہماری اُمیدوں اور آرزوؤں پر پانی پھیر دیا۔ ہمیں کہیں کا نہ رکھا! ——— بہرحال خضر خاں جو چاہتا ہے وہ نہیں ہو سکتا! دیول دیوی اپنے شوہر کے پاس اسی طرح واپس جائے گی، جس طرح آئی ہے، ——— عصمت کی دیوی بن کر ———!"

یہ کہہ کر اس نے دستک دی۔ فوراً دو مسلح غلام ایوان کے داہنے بائیں حصّہ سے برآمد ہوئے

"خضر خاں کو ہم شرفِ باریابی بخشنا چاہتے ہیں، اسے حاضر کیا جائے!"

افسرِ اعلیٰ کانپ گیا۔ علاءالدین پھر ٹہلنے لگا۔

* * * * * *

رنتھمبور اور چتوڑ کی فتح

شہزادہ خضر خاں دیول دیوی کی محبت میں سرشار تھا۔ اس کے ذہن و دماغ پر دیول دیوی کی حکومت تھی، اور خود اس پر علاء الدین خلجی کی، ـــــــ وہ اپنی جان و دل کا نذرانہ دیول دیوی کی خدمت میں پیش کر چکا تھا، لیکن خود علاء الدین کی مٹھی میں تھا، ـــــــ علاء الدین کی دہشت عشق تک پر غالب تھی۔ عشق کا بے باک اور منچلا جذبہ بھی اس کے حضور میں تھرّاتا ہوا کانپتا ہوا حاضر ہوتا تھا۔ اس کی خودسری، ضد، ہمت، خود آرائی، خود پسندی ہر چیز اس کے سامنے پہنچ کر کافور ہو جاتی تھی!

وہ تصورِ جاناں لئے ہوئے عالمِ خیال کی سیر کر رہا تھا۔ تصور کی دُنیا میں دیول دیوی اس کے سامنے تھی، اور وہ اس سے باتیں کر رہا تھا۔ اِدھر کئی دن سے پھر وہ بارگاہِ جمال میں باریاب نہیں ہو سکا تھا۔ بار بار جی چاہتا تھا کہ اس کے پاس جائے، اس سے باتیں کرے، اس کی پریم بھری باتیں سنے، اپنا سینہ چیرے اور دل نکال کر اس کے سامنے رکھ دے۔ دنیا کی، اہلِ دنیا کی، رسم و رواج دنیا کی شکایت کرے، اور ان سب کو ٹھکرانے کا اعلان کر دے، اس سے صاف اور برملا کہہ دے: "میں تمہارا بن چکا، تم میری ہو گئیں۔ ہم دونوں اب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کے شریکِ زندگی بن گئے۔ ہمیں اب

موت کے سوا دُنیا کی کوئی طاقت جُدا نہیں کر سکتی ، ــــــــــ اور دفعتہً اس کے دل میں کھٹک پیدا ہوئی ۔ ہاں اب ہمیں دُنیا کی کوئی طاقت جُدا نہیں کر سکتی لیکن کیا علاءالدین بھی نہیں کر سکتا ۔ آہ! دیول دیوی کتنی معصوم ہے ، کتنی نادان ہے کتنی بھولی ہے ، کتنی الھڑ ہے ، وہ اپنی محبت میں مست ہے ، وہ اپنے خیالات میں غرق ہے ، وہ دل میں خوش ہے کہ جو اس نے فیصلہ کر لیا ہے وہ قطعی اور آخری ہے ، اس فیصلہ سے اسے کوئی نہیں ہٹا سکتا ، اس فیصلہ کو کوئی رد نہیں کر سکتا ، محبت اس سے کوئی نہیں چھین سکتا ، اسے میرا ہاتھ جھٹک کر کوئی نہیں لے جا سکتا ، لیکن وہ نہیں جانتی اس دنیا میں خدا کے بعد ایک ہستی ایسی ہے جس کے فیصلہ کی کوئی اپیل نہیں ، جس کے فرمانوں کی تعمیل سب کو کرنی پڑتی ہے ، اور وہ ہے علاءالدین خلجی ، سلطانِ ہند ، شہنشاہِ گیتی ، والاجاہ والاشان ، قسمت اس کے سامنے دست بستہ حاضر رہتی ہے ۔ تقدیر میں اور اس میں کبھی اختلاف نہیں ہوتا ۔ اس کی تدبیر اور تقدیرِ الٰہی میں کامل یگانگت ہے ، اس کی مرضی خدا کی تقدیر بن جاتی ہے ، ــــــــــ کیا وہ بھی راضی ہو جائے گا؟ کیا اسے بھی رام کیا جا سکتا ہے ؟ کیا اسے اس تجویز سے متفق کیا جا سکتا ہے ؟ کیوں نہیں آخر وہ بھی آدمی ہے ، اس کے سینہ میں بھی دل ہے اور وہ دل دھڑکتا بھی رہتا ہے ، وہ اپنی اولاد سے محبت کرتا ہے ، خاص طور پر میں تو شفقتِ پدری سے بہت زیادہ بہرہ ور ہوتا رہتا ہوں ، وہ میرا دل رکھے گا ، میری بات مانے گا ، میرا کہا کرے گا ، مجھے محروم و مایوس نہیں ہونے دے گا اور اگر بفرضِ محال ایسا ہوا بھی تو کم از کم جان دے دینا تو میرے اختیار میں ہے ۔ میں اور دیول دیوی اپنی جان دے کر اس دُنیا سے رخصت ہو جائیں گے اور اُس دُنیا میں پہنچ جائیں گے جہاں سے ہماری زندگی کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گا !

خضر خاں اپنے خیالات و تصورات میں غرق تھا کہ علاءالدین کا بھیجا ہوا حاجب حاضر ہوا اور چُپ چاپ سامنے آ کر کھڑا ہو گیا ۔ بڑی دیر تک خضر خاں نے نگاہ اُٹھا کر دیکھا بھی نہیں کہ کون

آیا ہے اور کیوں آیا ہے؟ لیکن جب نظر پڑی تو تھرا کر رہ گیا۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور وہ سوچنے لگا، یہ کیوں آیا ہے؟ اسے شہنشاہ نے کیوں بھیجا ہے؟ اس نے پوچھنا چاہا، لیکن زبان نے یاری نہ دی۔ مستفسرانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے عرض کیا:۔

"جہاں پناہ نے ابھی اور اسی وقت آپ کو یاد فرمایا ہے!"

خضر خاں گھبرا گیا۔ اس نے پوچھا:۔

"مجھے یاد فرمایا ہے؟ غلام کو یاد کیا ہے؟"

اور پھر کوئی جواب نہ پاکر اس نے کہا:۔

"چلو، میں چلتا ہوں، ابھی چلتا ہوں!"

جب وہ علاؤالدین خلجی کے سامنے پہنچا تو اس نے دیکھا، وہ ایک اضطراب کے عالم میں ٹہل رہا ہے۔ خضر خاں کو دیکھ کر وہ ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ شفقت اور محبت کی نظر سے اسے دیکھا اور کہا:۔

"بیٹے! میں کتنی دیر سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ تم کیا کر رہے تھے؟"

خضر خاں اس کے سوا کچھ نہ کہہ سکا:۔

"جہاں پناہ کا حکم پاتے ہی غلام حاضر ہو گیا!"

اب دیوانِ خاص میں خلوت تھی، باپ بیٹے کے سوا کوئی اور موجود نہ تھا۔ علاؤالدین خود بھی مسند پر گاؤ تکیہ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور اسے بھی حکم دیا کہ بیٹھ جائے۔ پھر اس نے ایک طائرانہ نگاہ سے بیٹے کا جائزہ لینے کے بعد کہا:۔

"خضر خاں! ———— تم صرف میرے بیٹے ہی نہیں، ولی عہد سلطنت بھی ہو۔ میرے بعد اس وسیع مملکت کی ناخدائی تمہارے ہی ہاتھ میں آئے گی۔ میرے قویٰ اب مضمحل ہوتے جا رہے ہیں بڑھاپا میری طرف تیزی سے لپک رہا ہے۔ میرے مقابلہ میں تمہیں زیادہ باخبر اور باہوش ہونا چاہئے!"

موت کے سوا دُنیا کی کوئی طاقت جُدا نہیں کر سکتی۔ ـــــــ اور دفعتہً اس کے دل میں کھٹک پیدا ہوئی۔ ہاں اب ہمیں دُنیا کی کوئی طاقت جُدا نہیں کر سکتی لیکن کیا علاء الدین بھی نہیں کر سکتا۔ آہ! دیول دیوی کتنی معصوم ہے، کتنی نادان ہے کتنی بھولی ہے، کتنی الھڑ ہے، وہ اپنی محبّت میں مست ہے، وہ اپنے خیالات میں غرق ہے، وہ دل میں خوش ہے کہ جو اس نے فیصلہ کر لیا ہے وہ قطعی اور آخری ہے، اس فیصلہ سے اسے کوئی نہیں ہٹا سکتا، اس فیصلہ کو کوئی ردّ نہیں کر سکتا، محبّت اس سے کوئی نہیں چھین سکتا، اسے میرا ہاتھ جھٹک کر کوئی نہیں لے جا سکتا، لیکن وہ نہیں جانتی اس دُنیا میں خدا کے بعد ایک ہستی ایسی ہے جس کے فیصلہ کی کوئی اپیل نہیں، جس کے فرمانوں کی تعمیل سب کو کرنی پڑتی ہے، اور وہ ہے علاء الدین خلجی، سلطانِ ہند، شہنشاہِ گیتی، والاجاہ والاشان! قسمت اس کے سامنے دست بستہ حاضر رہتی ہے۔ تقدیر میں اور اس میں کبھی اختلاف نہیں ہوتا۔ اس کی تدبیر اور تقدیرِ الٰہی میں کامل یگانگت ہے، اس کی مرضی خدا کی تقدیر بن جاتی ہے۔ ـــــــ کیا وہ بھی راضی ہو جائے گا؟ کیا اسے بھی رام کیا جا سکتا ہے؟ کیا اسے اس تجویز سے متفق کیا جا سکتا ہے؟ کیوں نہیں آخر وہ بھی آدمی ہے، اس کے سینہ میں بھی دل ہے اور وہ دل دھڑکتا بھی رہتا ہے، وہ اپنی اولاد سے محبّت کرتا ہے، خاص طور پر میں تو شفقتِ پدری سے بہت زیادہ بہرہ ور ہوتا رہتا ہوں، وہ میرا دل رکھے گا، میری بات مانے گا، میرا کہا کرے گا، مجھے محروم و مایوس نہیں ہونے دے گا اور اگر بفرضِ محال ایسا ہوا بھی تو کم از کم جان دے دینا تو میرے اختیار میں ہے۔ میں اور دیول دیوی اپنی جان دے کر اس دُنیا سے رخصت ہو جائیں گے اور اُس دُنیا میں پہنچ جائیں گے جہاں سے ہماری زندگی کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گا!

خضر خاں اپنے خیالات و تصوّرات میں غرق تھا کہ علاء الدین کا بھیجا ہوا حاجب حاضر ہوا اور چُپ چاپ سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ بڑی دیر تک خضر خاں نے نگاہ اُٹھا کر دیکھا بھی نہیں کہ کون

آیا ہے اور کیوں آیا ہے ؛ لیکن جب نظر پڑی تو ٹھٹھرا کر رہ گیا - دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور وہ سوچنے لگا ، یہ کیوں آیا ہے ؛ اسے شہنشاہ نے کیوں بھیجا ہے ؟ اس نے پوچھنا چاہا ، لیکن زبان نے یاری نہ دی ۔ مستفسرانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا - اس نے عرض کیا :-

" جہاں پناہ نے ابھی اور اسی وقت آپ کو یاد فرمایا ہے ! "

خضر خاں گھبرا گیا - اس نے پوچھا :-

" مجھے یاد فرمایا ہے ؛ غلام کو یاد کیا ہے ؟ "

اور پھر کوئی جواب نہ پا کر اس نے کہا :-

" چلو ! میں چلتا ہوں ، ابھی چلتا ہوں ! "

جب وہ علاء الدین خلجی کے سامنے پہنچا تو اس نے دیکھا ، وہ ایک اضطراب کے عالم میں ٹہل رہا ہے - خضر خاں کو دیکھ کر وہ ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا - شفقت اور محبت کی نظر سے اسے دیکھا اور کہا :-

" بیٹے ! میں کتنی دیر سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں - تم کیا کر رہے تھے ؟ "

خضر خاں اس کے سوا کچھ نہ کہہ سکا :-

" جہاں پناہ کا حکم پاتے ہی غلام حاضر ہو گیا ! "

اب دیوانِ خاص میں خلوت تھی ، باپ بیٹے کے سوا کوئی اور موجود نہ تھا - علاء الدین خود بھی مسند پر گاؤ تکیہ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور اسے بھی حکم دیا کہ بیٹھ جائے - پھر اس نے ایک طائرانہ نگاہ سے بیٹے کا جائزہ لینے کے بعد کہا :-

" خضر خاں ! ———— تم صرف میرے بیٹے ہی نہیں ، ولی عہد سلطنت بھی ہو - میرے بعد اس وسیع مملکت کی ناخدائی تمہارے ہی ہاتھ میں آئے گی ، میرے قویٰ اب مضمحل ہوتے جا رہے ہیں بڑھاپا میری طرف تیزی سے لپک رہا ہے - میرے مقابلہ میں تمہیں زیادہ باخبر اور باہوش ہونا چاہیئے !"

خضر خاں :- "خدا جہاں پناہ کا سایۂ ہما پایہ تا صد وسی سال قائم رکھے، یہ جہاں پناہ کی برکت ہے کہ شیر اور بکری ایک گھاٹ پانی پی رہے ہیں، ہر طرف امن و امان کا دَور دورہ ہے، دوست شاد دشمن ناشاد، چوروں نے چوری سے ہاتھ اٹھا لیا، قزاقوں نے ڈکیتی چھوڑ دی، غریبوں نے فلکِ کج رفتار کا شکوہ ترک کر دیا ——— !"

علاء الدین خلجی :- (مسکرا کر) "بیٹے! تم تو ہماری شان میں قصیدہ پڑھنے لگے۔ ہمارے دربار میں شاعروں کی کمی نہیں، یہ کام انہوں کے لئے رہنے دو، تم نے بھی اگر اسی طرف توجہ کی اور بازی لے گئے تو وہ غریب پھر کیا کریں گے؟ ——— تم تو یہ بتاؤ، اگر واقعی ملک کے حالات سے باخبر اور واقف ہو تو اب نظم و نسق کا کیا حال ہے؟"

خضر خاں :- "جہاں پناہ بہت بہتر، ظلّ اللہ کے رعب اور دبدبہ کا یہ ایک کرشمہ ہے کہ حالات بالکل سُدھر چکے ہیں۔ جو بُرے تھے وہ درست ہو چکے ہیں۔ جو درست تھے وہ اور زیادہ بہتر ہو گئے ہیں!"

علاء الدین خلجی :- "ضروریاتِ زندگی کی بہم رسانی کی کیا کیفیت ہے؟"

خضر خاں :- "ہر چیز ملتی ہے اور مناسب قیمت پر دستیاب ہو جاتی ہے، ارزانی کا یہ عالم ہے کہ چالیس سیر گیہوں ساڑھے بارہ آنے کا، ڈھائی سیر خالص گھی ایک آنہ کا، ایک سیر شکر تین پیسے میں مہیا ہو جاتی ہے[1]۔ پھر کون ہے جو چوری کرے؟ ——— پیٹ بھر کر کھاتے ہیں، اور اپنے آقائے ولی نعمت کو دل سے دعا دیتے ہیں۔ راستے کے امن و امان کا یہ حال ہے کہ مسافروں کے قافلے اور تاجروں کے کارواں آزادی سے سفر کرتے ہیں۔ رات کو اپنا اسباب بغیر حفاظت کے

---

[1] یہ زیبِ داستان کے لیے من گھڑت افسانہ نہیں، تاریخی واقعہ ہے۔ فرشتہ اور دوسری تاریخوں سے تصدیق ہو سکتی ہے کہ خلجی نے یہی قیمت مقرر کی تھی اور اسی پر مال بکتا تھا۔

یونہی کھلا چھوڑ دیتے ہیں، نہ ڈکیتی کی واردات ہوتی ہے نہ چوری کا حادثہ!"

علاء الدین خلجی :۔ "صرف دلّی ہی میں جہاں ہم ہر وقت موجود رہتے ہیں؛ جہاں ہمارا کوڑا ہر وقت آمادۂ کار رہتا ہے؛ جہاں ہماری نصف تلوار ہمیشہ میان سے باہر رہتی ہے؛ یا یہی کیفیت دلّی سے باہر بھی ہے؟"

خضر خاں :۔ کل ہی شام کو ایک کاروانِ تجارت آیا ہے، یہ اس کے الفاظ ہیں جو غلام نے دہرائے ہیں۔ میر کارواں کا بیان ہے کہ ——— "کشمیر سے لے کر بنگال تک اور سندھ و گجرات سے لے کر تلنگانہ تک، راستوں کے پُرامن ہونے کی یہی کیفیت ہے!" ——— وہ بار بار حیرت کا اظہار کرتا تھا کہ ایسا عجیب نظامِ امن و حفاظت اس نے دُنیا میں کہیں بھی نہیں دیکھا۔ حالانکہ اس کا کام ہی یہ ہے کہ کاروبار کے سلسلہ میں دُنیا جہان کا گشت کرے!"

علاء الدین خلجی :۔ "ہمیں معلوم ہوا ہے، اس سال بڑا سخت قحط پڑا ہے!"

خضر خاں :۔ "جہاں پناہ کی اطلاع بالکل صحیح ہے!"

علاء الدین :۔ "پھر اب کیا ہوگا؟ رعایا پریشان ہوگی، بقّالوں کی بن آئے گی۔ ہم چاہتے ہیں کہ قحط کی شدّت میں بھی اجناس کی قیمتیں نہ چڑھنے پائیں، ——— یہ بتاؤ قحط کی اور قحط کے زمانہ میں لوگوں کی کیا کیفیت ہے؟"

خضر خاں :۔ "قحط بڑھتا جا رہا ہے جہاں پناہ! ایسا معلوم ہوتا ہے اس سال زمین نے اناج نہ پیدا کرنے کی قسم کھائی ہے!"

علاء الدین خلجی :۔ "ہوں، ——— اور اجناس خوردنی کی قیمتوں کا کیا حال ہے؟"

خضر خاں :۔ "جہاں پناہ نے جو نرخ مقرر کر دیئے ہیں اس میں نہ کمی ہوئی ہے نہ زیادتی۔ ساری خلقت کو اسی بھاؤ سے اناج مل رہا ہے۔ اور چاہے جہاں قحط کی شدّت ہو لیکن ہمارے ملک

پر تو اس کا کوئی اثر نہیں پڑا، اور پھر جہاں پناہ نے ہر ہر محلہ میں ایک ایک چودھری مقرر کر کے اور اسے ہر گھر تک اناج کی بہم رسانی کا ذمہ دار بنا کے عوام کے ہر دُکھ اور تکلیف کا عملی خاتمہ کر دیا ہے؟

علاءالدین کے دل میں کیا تھا؟ یہ اس نے اب تک ظاہر نہیں ہونے دیا تھا، البتہ نئے نئے پہلوؤں سے وہ خضر خاں کا امتحان لے رہا تھا۔ وہ اسے اپنے ڈھب پر لانے کی کوشش کر رہا تھا، وہ چاہتا تھا، اسے دیول دیوی کی پُرخار وادیِ محبت سے نکال کر مردِ میدان بنا دے۔ اسے عمل کی دُنیا میں اس طرح مصروف رکھے کہ پھر اس کے دل میں دیول دیوی کا خیال بھی نہ آ سکے۔ اس لئے کہ وہ ناممکن الحصول ہے۔ وہ ایک شوہر کی بیوی ہے، وہ ایک غیر مذہب کی پرستار ہے۔ اس پر جبر نہ ہونا چاہئے۔ اُسے لالچ سے خریدنے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے۔ اس کی شکستہ دل ماں کی دل شکنی نہیں کرنی چاہئے لیکن وہ حتی الامکان خضر خاں پر بھی زیادہ سختی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یوں حالات بالکل ہی مجبور کر دیں تو دوسری بات ہے۔ اس وقت اسے اس بات کی بھی خوشی تھی کہ خضر خاں کو اگرچہ دیول دیوی کی محبت نے سرشار اور سرگشتہ کر رکھا ہے، پھر بھی وہ حالات سے باخبر ہے، امورِ مملکت پر اس کی نظر ہے۔ رعایا کے حالات اور کیفیات سے آشنا ہے۔ اس کا دل فخر و مسرت سے معمور ہو رہا تھا۔ اس نے ایک سندا کے ساتھ یہ محسوس کیا، کیوں نہ ہو آخر خضر خاں کس کا بیٹا ہے؟ باپ کے صفات اگر اس میں نہیں ہوں گے تو کس میں ہوں گے؟ اس نے محبت بھری نظروں سے اپنے بیٹے کو دیکھا اور شفقت و مسرت کے لہجہ میں کہا:۔

"راجپوت اب پھر سر اُٹھانے لگے ہیں۔ رنتھمبور ان کی سرگرمیوں کا مرکز ہے۔ وہ دِلّی کی بالادستی نہیں قبول کرنا چاہتے۔ شاید وہ سمجھتے ہیں ہم کمزور ہیں، ان کی سرکوبی پر قدرت نہیں رکھتے۔ ان کی سرکشی کو برداشت کر لیں گے! ـــــ کیوں یہی بات ہے نا؟"

خضر خاں: "پدرِ بزرگوار! رنتھمبور کا قلعہ اپنی مضبوطی اور استحکام پر بلاشبہ جتنا چاہے، ناز کر سکتا

ہے۔ اور اس کا یہ نام بے جا بھی نہیں۔ دُنیا کے مستحکم ترین قلعوں میں اس کا نمبر سب سے پہلا ہے لیکن اس قلعہ کے مکین علاء الدین خلجی کی تلواروں اور اس کے سورماؤں کے سامنے بھی ٹھہر سکتے ہیں، یہ میں باور نہیں کر سکتا۔ یہ ناممکن ہے!"

علاء الدین خلجی ۔ (تجاہلِ عارفانہ کے ساتھ) "تو کیا ہوگا پھر؟"

خضر خاں ۔ "یہ مستحکم ترین قلعہ جہاں پناہ کی عظمت و جلال کے آگے سر بسجود ہوگا۔ اس قلعہ کے بلند و بالا در و دیوار جہاں پناہ کے دبدبہ اور سطوت کے سامنے سرِ تسلیم خم کریں گے۔ اس قلعہ کے جیالے اور من چلے راجپوت جہاں پناہ کی دارائی اور حشمت کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوں گے۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوا ہے اور کوئی وجہ نہیں ہے کہ اب بھی ایسا نہ ہو!"

علاء الدین خلجی ۔ "بیٹے، باتوں کا جہاں تک تعلق ہے، اسی طرح کے بلکہ اس سے بھی زیادہ شاندار اور پُرشکوہ الفاظ میرے کانوں میں اب تک گونج رہے ہیں۔ الغ خاں نے اس مہم کا بیڑا اٹھایا تھا۔ اسے گئے ہوئے کافی مدت گزر گئی، لیکن اب تک کامیابی نہیں ہوئی!"

خضر خاں ۔ "مقابلہ بھی تو بہت سخت ہے۔ راجپوت ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ جانتے ہیں اگر یہ قلعہ ہاتھ سے نکل گیا تو پھر ان کا شیرازہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بکھر جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تن من کی بازی لگائے ہوئے ہیں!"

علاء الدین خلجی ۔ "لیکن ہم زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتے۔ ہمارے لئے صرف رنتھمبور ہی نہیں اور بھی بہت سے مقامات ہیں جن پر علائی پرچم لہرانا ہے۔ اگر ایک ایک شہر اور ایک ایک قلعہ کے سر کرنے میں اتنی دیر لگی، تو سب کو فتح کرنے کے لئے تو عمرِ نوح چاہئے۔ علاء الدین کی رفتارِ فتوحات اگر اتنی سُست رہی تو یہ اس کے لئے فخر کا نہیں، شرم کا مقام ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ اپنا کام کچھ اپنے ہی سے خوب بن پڑتا ہے۔ ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میدانِ جنگ میں ہم خود پہنچیں گے!"

خضر خاں :۔ "جہاں پناہ کے زحمت فرمانے کی ضرورت نہیں۔ یہ غلام اس مہم کو باآسانی سر کرلے گا' اسے موقع دیا جائے!"

علاء الدین خلجی :۔ "نہیں ہم خود جائیں گے صبح ہمارا لشکر یہاں سے کوچ کردے گا!"

خضر خاں :۔ "جہاں پناہ ——— ظلِ اللہ!"

علاء الدین خلجی :۔ "اگر چاہو تو ہمارے ساتھ چل سکتے ہو۔ تمہیں دلیری اور بہادری کے مظاہرہ کا پورا موقع دیا جائے گا!"

خضر خاں :۔ "غلام کے لئے اس سے بڑھ کر خوش قسمتی کی بات کیا ہوسکتی ہے!"

علاء الدین خضر خاں کو دلی سے باہر دیول دیوی سے دُور بھیجنا چاہتا تھا۔ اس نے بیٹے کے جنگی اور ملی جذبات کو اس طرح آہستہ آہستہ تھوڑی دیر کی گفتگو میں بھڑکایا کہ بغیر کسی سختی اور تشدد کے اصل مقصد حاصل ہوگیا، وہ خضر خاں کی معیت اور ہم رکابی سے بہت خوش ہوا۔

اور دوسرے روز صبح صبح طبل پر چوٹ پڑی، نقارے کی آوازیں پردۂ گوش سے ٹکرانے لگیں، جنگی باجے بجنے لگے اور علاء الدین خلجی کی فوج ظفر موج شان و شکوہ اور جلال و جبروت کا پیکر بنی ہوئی دلی سے روانہ ہوگئی۔ اس فوج کے ساتھ چونکہ بہ نفس نفیس بادشاہ بھی جارہا تھا، اور اس کا ولی عہد بھی، اس لئے مہم کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔ شہریوں کا ٹھٹھ کا ٹھٹھ اس منظر کو دیکھنے کے لئے گلیوں سڑکوں اور چوراہوں پر مجتمع ہوگیا تھا۔ بالا خانوں اور کوٹھیوں سے لڑکیاں اور عورتیں جھانک رہی تھیں۔ قلعہ کے ایک جھروکے سے دو بڑی بڑی اشک آلود آنکھیں بھی اس منظر کو دیکھنے میں محو تھیں ——— یہ دیول دیوی تھی۔ خضر خاں جب اس طرف سے گزرا تو بے ساختہ اس کی نگاہیں اُوپر اُٹھ گئیں۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں اور جھک گئیں۔ خضر خاں بے انتہا کوشش کے باوجود دیول دیوی سے ملاقات کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا تھا۔ لیکن اس وقت دیول دیوی کا یہ التفات

دیکھ کر اس کی رگوں میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ اس کے افسردہ اور مضمحل چہرے پر رونق آگئی۔ اس کی بجھی بجھی آنکھوں میں زندگی اور رعنائی حیات کی چمک پیدا ہو گئی۔ اس کا دل ولولوں سے معمور ہو گیا ——

علاء الدین خلجی بظاہر ان حالات سے ناواقف اور ناآشنا تھا لیکن اس کی دُوررس نگاہ حالات کا جائزہ لینے میں برابر مصروف تھی۔ اس نے دیول دیوی کی آنکھیں بھی دزدیدہ نظروں سے دیکھ لیں اور بالکل انجان پنے کی حالت میں خضر خاں کی کیفیت بھی تاڑ لی۔ اس کے ہونٹوں پر تبسم کی اور ماتھے پر خشونت کی ایک ہلکی سی لہر آئی اور غائب ہو گئی۔ کوئی محسوس بھی نہ کر سکا کہ اس تبسم میں کیا پنہاں تھا اور اس خشونت میں کیا چیز جھلک رہی تھی؟

رنتھمبور ہر اعتبار سے ایک ناقابل تسخیر قلعہ تھا۔ محلّ وقوع کے اعتبار سے قدرت نے گویا اس کی حفاظت کا ذمہ لے لیا تھا۔ دشمن کی بڑی سے بڑی فوج بھی تباہ ہونے سے نہیں بچ سکتی تھی۔ اور یہ قلعہ جو درحقیقت ایک شہر تھا، ہر خطرہ سے بے پروا تھا، یہاں کے رہنے والے یہاں کے شہری اور سپاہی مسلمان فوج کا مذاق اڑاتے تھے۔ اس پر بڑی بڑی چٹانیں دھکیلتے تھے اور ایک ایک چٹان جب بہت سے مسلمان سپاہیوں کو چشم زدن میں موت کے گھاٹ اُتار دیتی تھی تو خوشی سے بے قابو ہو کر دیوانہ وار چیخ اُٹھتے تھے، شور و غل کرتے تھے۔ ناچ رنگ اور عیش و طرب میں منہمک ہو جاتے تھے۔ اُنھوں نے یقین کر لیا تھا مسلمانوں کو موت کھینچ کر یہاں لائی ہے، یہ اب زندہ بچ کر نہیں جا سکتے۔ الغ خاں بڑا جیالا اور بہادر تھا۔ لیکن یہاں آکر اس کی ہمت پست ہو گئی تھی۔ اس کی دلاوری جواب دے رہی تھی، اس نے بڑا شدید محاصرہ کیا تھا، لیکن اس محاصرہ سے قلعہ کو، اہالیانِ قلعہ کو، شہر کو، باشندگانِ شہر کو ذرا بھی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ وہ پہاڑ پر تھے اور دشمن نیچے، راستہ اتنا دشوار گزار طویل اور پیچ دار کہ نہ دشمن کی تلوار یہاں تک پہنچ سکتی تھی نہ بندوق نہ فوج۔ یہ محاصرہ رنتھمبور

کا محاصرہ نہیں تھا، الغ خاں نے خود اپنا محاصرہ کر لیا تھا، اب اس کے لئے یہاں سے زندہ سلامت بچ کر نکل جانا روز بروز ناممکن ہوتا جا رہا تھا۔ قلعہ میں نہ پانی کی کمی تھی نہ اناج کی، نہ فوج کی، اور الغ خاں ہر چیز کی کمی محسوس کر رہا تھا۔ وہ فوج جس پر اسے ناز تھا، اب اس کے چھکے چھوٹے جا رہے تھے۔ ہر روز نہ جانے کتنے آدمی چڑھتے ہوئے پتھر کی سلوں اور چٹانوں سے دب کر ہلاک ہو جاتے تھے۔ نجانے کتنے حالات کی ناسازگاری سے تنگ آ کر بیمار پڑ جاتے تھے، اناج ختم ہوتا جا رہا تھا، پانی کا حاصل کرنا جوئے شیر کے لانے سے کم نہ تھا اور منزلِ مقصود دور سے دور تر ہوتی جا رہی تھی!

اور ایک روز جب بے سان و گمان علاء الدین خلجی اپنا لشکر لے کر پہنچا تو الغ خان کی جان میں جان آئی۔ سپاہیوں میں ایک نیا ولولہ پیدا ہو گیا، اور رنتھمبور کے بلند و بالا عرش آشیاں حصار میں خوشی کے شادیانے بجنے لگے ——— موت علاء الدین خلجی کو بھی یہاں تک کھینچ لائی تھی، اب وہ بھی بچ کر نہیں جا سکتا تھا، اب وہ بھی ہلاک ہوگا، اور اس کے ہلاک ہونے کے معنی ہیں دلی میں مسلم شہنشاہیت کا خاتمہ، ——— روزِ نو کا آغاز!

الغ خاں کی فوج ایک عرصہ سے رنتھمبور کا محاصرہ کیے ہوئے تھی لیکن بے کار، بے نتیجہ، لاحاصل اور اب علاء الدین کے آتے ہی حالات نے دفعتہً پلٹا کھایا، اور جو بات ناممکن سمجھی جا رہی تھی وہ ممکن نظر آنے لگی۔ اس نے الغ خان اور اعیان و افسرانِ فوج کو طلب کیا، اور حقارت کی ایک نظر ڈال کر گرجدار آواز میں کہا:-

"تم یہ مہم سر نہ کر سکے، ڈر گئے، دشمن کی تعداد تمہیں مرعوب اور دہشت زدہ نہ کر سکتی۔ دشمن کی تدبیر نے تمہارے چھکے چھڑا دیئے۔ دشمن نے تمہارا امتحان لیا، اور تم فیل ہو گئے۔ اس نے معلوم کرنا چاہا، تم زندگی سے زیادہ محبت کرتے ہو یا موت سے؟ اور اس نے معلوم کر لیا زندگی تمہیں زیادہ عزیز ہے۔ موت کا خیر مقدم نہیں کر سکے تم، اس نے بڑی چٹانیں اور سلیں پھینکیں، تم نے

یہ گوارا کر لیا کہ ان کے نیچے دب کر مر جاؤ۔ لیکن یہ نہ کر سکے کہ دبتے، زخمی ہوتے، مرتے، کچلتے رہتے اور ساتھ ہی ساتھ آگے بڑھتے رہتے۔ ایک سِل سَو آدمیوں کو کچل سکتی تھی، ایک چٹان ایک سَو آدمیوں کو ہلاک کر سکتی تھی۔ لیکن اگر تم اپنی پوری قوت سے آگے بڑھتے تو ہزاروں آدمی کچل کر، دب کر مر جاتے پھر بھی چوٹی پر پہنچ سکتے تھے، اور دشمن کو موت کے گھاٹ اُتار سکتے تھے۔ افسوس ہے کہ یہ کمزوری تم سے سرزد ہوئی۔ بہر حال اب بھی کچھ نہیں گیا ہے۔ اگر واقعی میرے وفادار ہو، اگر واقعی تمہاری جاں نثاری کا دعویٰ سچا تھا، اگر سچ مچ موت سے نہیں ڈرتے اور مذہب ملت کے نام پر اسلام اور مسلمان کی خاطر، کلمۃ اللہ کی سربلندی اور حق و صداقت کے لئے جان کی بازی لگا سکتے ہو تو میرے ساتھ آؤ جس کے دل میں ذرا بھی جھجک ہو وہ واپس چلا جائے، جو بالکل ثابت قدم ہو صرف وہی ساتھ دینے کا ارادہ کرے۔ دُنیا میں سب سے بڑی قیمتی اور گرانمایہ پونجی اولاد کی ہوتی ہے، مَیں سب سے پہلے اس قربان گاہ پر اولاد کو بھینٹ چڑھاتا ہوں، آج اسمٰعیلؑ و حسینؓ کی سنّت پھر تازہ ہوگی۔ خضر خاں کیا تم اپنے جاں نثاروں اور بہادروں کے ساتھ سب سے پہلے، سب سے آگے پتھر کی سِلوں اور چٹانوں کا مقابلہ کرتے ہوئے رنتھمبور پر چڑھائی کے لئے تیار ہو؟"

خضر خاں نے بغیر کسی توقف اور تامل کے عزم اور استقامت کے ساتھ کہا:۔

"جہاں پناہ مَیں تیار ہوں!"

علاء الدین خلجی۔ "اگر تیار ہو تو اب مزید گفتگو کی ضرورت نہیں۔ اکیلے اور تنہا بڑھو، جسے تمہارا ساتھ دینا ہوگا، وہ خود پیچھے ہولے گا۔ مَیں اب کسی سے کچھ کہنا نہیں چاہتا!"

خضر خاں مسلح تو تھا ہی، فوراً ہی بجلی کی سی تیزی کے ساتھ رنتھمبور کے قلعہ پر چڑھ دوڑا۔ اسے جاتا دیکھ کر اس کے لشکر کے تمام لوگ سرخوشی کے عالم میں دیوانہ وار تعاقب کرتے ہوئے بڑھے۔ الغ خاں بھی لپک کر چلا، لیکن علاء الدین نے روک دیا۔

علاء الدین خلجی:۔ "نہیں الغ خاں، اب خضر خاں جا چکا، اسے خدا پر چھوڑ دو۔ اس طرف دیکھو ہی نہیں کہ کیا ہو رہا ہے، یہ مہم اب وہی فوج سر کرے گی جو خضر خاں کے اور میرے ساتھ دلی سے آئی ہے۔ برا نہ ماننا، اس کے معنی یہ نہیں کہ ہم تم پر اعتبار نہیں کرتے، ہمیں تم پر بھروسہ نہیں، تم ہمیں عزیز ہو، محبوب ہو، یہاں سے فارغ ہو کر ہم چتوڑ کی طرف بڑھیں گے، اور وہاں تمہیں پورا موقع دیں گے کہ اپنی شجاعت کا جوہر دکھاؤ، فوجی اور عسکری نقطۂ نظر سے یہ بات اچھی نہیں ہوتی کہ جو لوگ کسی ایک مہم سے اُکتا گئے ہوں انہیں بار بار اُسی کام پر لگایا جائے، اور اگر کہیں حسب عادت ان سے کوئی کمزوری سرزد ہو جائے، تو پھر اس کا اثر ان لوگوں پر بھی پڑتا ہے، جو نئے ولولہ اور جذبہ کے ساتھ اسے سر کرنے کے لئے آگے بڑھتے ہیں!"

الغ خاں:۔ "لیکن جہاں پناہ! یہ میرے لئے شرم کا مقام ہے کہ شہزادہ خضر خاں اپنی جان جوکھوں میں ڈالیں اور میں اپنے لشکریوں کے ساتھ چپ چاپ یہ تماشہ دیکھتا رہوں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ خودکشی کر لوں!"

علاء الدین خلجی۔ (نرمی اور ملائمت کے ساتھ) "نہیں الغ خاں! جذبات کی رَو میں بُری طرح بہے جا رہے ہو، اس بات کا خیال بھی نہ کرو، اس میں شرم کی کیا بات ہے؛ تم صرف خضر خاں کے دوست رفیق اور ہمساز ہو، میں تو اُس کا باپ ہوں۔ کتنا زیادہ چاہتا ہوں اُسے، لیکن مجھے دیکھو میں بھی اس کے ساتھ نہیں گیا، یہیں کھڑا تم سے باتیں کر رہا ہوں اور یقین دلاتا ہوں کہ گو اس مہم میں وہ ہلاک بھی ہو جائے، مگر یہاں سے جنبش نہیں کروں گا۔ وہ ابھی نوجوان اور ناآزمودہ کار ہے اس میں خود اعتمادی پیدا ہونی چاہئے۔ اسے تنہا یہ مہم سر کرنے دو، کب تک وہ میرے اور تمہارے سہارے زندگی بسر کرے گا؛ نہیں یہ اسی کا کام ہے، اسی کو کرنا چاہئے ——— ہاں تو چتوڑ کے لئے تم تیار ہو؛ چلو گے ہمارے ساتھ؟"

الغ خاں: غلام کا کام صرف جاں نثاری ہے چتوڑ نہیں، اگر پہاڑ سے ٹکرانے کا حکم ملے گا، تو بھی وہ تأمل نہیں کر سکتا!

علاءالدین خلجی: (شفقت و مرحمت کے ساتھ) "ہاں الغ خاں سچ کہتے ہو، ہمیں یقین ہے ہم تم پر اعتماد کرتے ہیں!"

یک بیک بیقراری کے ساتھ الغ خاں نے کہا:-

"دیکھئے دیکھئے جہاں پناہ! —— معلوم ہوتا ہے رنتھمبور سر ہو گیا، قلعہ فتح ہو گیا، وہ دیکھئے قلعہ پر ہمارا پرچم لہرا رہا ہے۔ وہ سنئے، اللہ اکبر کی روح پرور صدائیں بلند ہو رہی ہیں، وہ ملاحظہ فرمائیے فصیل پر سپاہی چڑھ رہے ہیں، تائیدِ الٰہی شہزادے کے ساتھ تھی۔ جو مہم مہینوں کی سر توڑ کوشش کے باوجود سر نہ ہو سکی، وہ چند لمحوں میں شہزادہ والا جاہ نے سر کر لی، —— زندہ باد شہزادہ خضر خاں!"

علاءالدین خلجی کا چہرہ وفورِ مسرت سے جگمگا اٹھا۔ اس نے الغ خاں کے احساس کمتری کو کم کرنے کے لئے کہا:-

"ہاں واقعی یہ تائیدِ الٰہی تھی کہ اس سرعت کے ساتھ یہ مہم سر ہو گئی۔ خود میں بھی اس کی توقع نہیں کرتا تھا، لیکن ظاہری اسباب بھی موجود ہیں۔ ادھر کئی دن سے تم نے چڑھائی نہیں کی تھی۔ اہالیانِ قلعہ مطمئن ہو گئے تھے کہ اب محاصرہ اٹھا لوگے۔ آج یک بیک خضر خاں پہنچا، اور پھر تیزی کے ساتھ ان کے سر پر پہنچ گیا۔ ہمارا خیال ہے آج اس گھبراہٹ میں انہیں پتھر کی سلیں اور چٹانیں لڑھکانے کا موقع بھی کم ملا ہوگا! —— وقت اور اتفاق کی بات ہے!"

اتنے میں شہزادہ کے لشکر کے کچھ سپاہی ہانپتے کانپتے علاءالدین کے سامنے حاضر ہوئے اور انہوں نے کہا:-

"قلعہ فتح ہو گیا، بے اندازہ دشمن ہلاک ہوئے، بے اندازہ مالِ غنیمت حاصل ہوا، ہمارے

بہت کم آدمی کام آئے۔ شہزادے نے ہمیں بھیجا ہے کہ یہ خوشخبری جہاں پناہ کے گوش مبارک تک پہنچادیں!"

علاء الدین یہ خوشخبری سُن کر مسکرایا۔ اس نے کہا:۔

"چلو ہم بھی چلتے ہیں، واقعی یہ بہت بڑی خوشخبری ہے، تمہیں انعام ملے گا!"

واقعی یہ بہت بڑی کامیابی تھی، اور چونکہ بالکل اچانک اور یک بیک اور بالکل غیر متوقع اور ناسازگار حالات میں حاصل ہوئی تھی، اس لئے اس کی قدر وقیمت بھی بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔ راجپوتوں کا یہ آخری اور سب سے بڑا مرکز، بالآخر دلّی کی سیادت تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا۔

علاء الدین نے خضر خاں کو گلے سے لگالیا، اس کی پیشانی کو بوسہ دیا اور کہا:۔

"تو وہ بیٹا ہے جس پر مجھے فخر ہے! تو نے ثابت کر دیا، علاء الدین کی مسند کا تجھ سے زیادہ اہل کوئی نہیں ——— !"

پھر اس نے مالِ غنیمت کی تقسیم شروع کی، اور خضر خاں کے لشکریوں کو، اپنے سپاہیوں کو، الغ خاں کے ساتھیوں کو بے اندازہ دولت سے نوازا، اور پھر الغ خاں کی پیٹھ پر دستِ شفقت پھیرتے ہوئے کہا:

علاء الدین خلجی: "رستا ؤ گے یا ہمارے ساتھ چتوڑ چلو گے؟ ہم چاہتے ہیں ایک ہی سلسلہ میں رنتھمبور اور چتوڑ کا معاملہ طے کرنے کے بعد دلّی پہنچیں، اور پھر آئندہ کے لئے ایک نیا پروگرام بنائیں!"

الغ خاں: "غلام جہاں پناہ کی ہمرکابی کا شرف ضرور حاصل کرے گا!"

اور پھر علاء الدین کا لشکر سیلِ بے اماں کی صورت میں آگے بڑھا اور بڑھتا رہا۔ راجپوتوں اور برہمنوں کی قوت و شوکت اور سطوت و عظمت اس سیل زمیں گیر کے ساتھ ساتھ خس و خاشاک کی طرح بہہ رہی تھی۔ علائی فوجیں چتوڑ کے سامنے پہنچ گئیں، یہاں کے راجپوت بھی لڑنے مرنے پر کمربستہ

تھے۔ انہیں علائی ارادہ کی بھنک پہلے ہی مِل چکی تھی۔ اُنہوں نے غیر معمولی تیاریاں پایۂ تکمیل تک پہنچالی تھیں، وہ رنتھمبور کے انجام سے بھی بے خبر نہ تھے، اور اپنے انجام سے بھی بے خبر نہ تھے۔ انہیں قوت پر طاقت پر جنگی تیاریوں پر، اسلحہ اور ساز و سامانِ جنگ پر ناز تھا، اپنے وسائل اور ذرائع پر بھروسہ تھا، انہیں یقین تھا وہ مسلمانوں کے بڑے سے بڑے لشکر کو شکست دے سکتے ہیں، وہ اس بات پر اڑے ہوئے تھے کہ کسی قیمت پر دِلّی کی بالا دستی کو علاء الدین کی شہنشاہیت کو تسلیم نہیں کریں گے۔ انہیں نہ صرف اپنی انفرادیت پر اصرار تھا بلکہ یہ خیال بھی جما ہُوا تھا کہ بھارت ورش پر حکومت ان کا حق ہے نہ کہ علاء الدین کا۔ وہ علاء الدین کو اس دیس سے نکال دینا چاہتے تھے، اور یہی وجہ تھی کہ اس کے راستہ میں ہر طرح کی رُکاوٹیں پیدا کرتے رہتے تھے۔ عاجز آکر علاء الدین نے فیصلہ کر لیا تھا کہ چتوڑ کی اس خودسری کا دندان شکن جواب دے کر رہے گا!

علاء الدین نے سب سے پہلے رانا چتوڑ کو حسنِ اخلاق سے رام کرنے کی کوشش کی، اسے صلح کا پیام دیا۔ یقین دلایا کہ اس کی داخلی آزادی پر کوئی حرف نہ آئے گا، اگر وہ متحدہ ہندوستان کی اطاعت قبول کرلے۔ لیکن رانا اپنی متوقع فتح کے نشہ میں چُور تھا۔ اس نے ایک نہ سُنی۔ اس کا صرف ایک ہی جواب تھا:

"تلوار ہی آخری فیصلہ کرے گی!"

اور آخر کار آخری فیصلہ تلوار ہی کے سپرد کردیا گیا۔

علاء الدین خلجی بہت بڑا ماہرِ نفسیات بھی تھا۔ اس نے الغ خاں کو رنتھمبور کی جنگ میں حصّہ لینے کی اجازت نہیں دی تھی۔ یہ بات بہت بڑی مصلحت پر مبنی تھی۔ الغ خاں میں احساسِ کمتری پیدا ہُوا، اسے اپنے وجود سے شرم آنے لگی۔ خضر خاں کی کامیابی نے اسے اور زیادہ شرمندہ کیا، آب جاں بازی اور جاں نثاری کا جوہر دکھلانے کے لئے وہ بے قرار تھا۔ علاء الدین نے یہ سب کچھ

اسی لئے کیا تھا۔ اس نے جب دیکھا لوہا گرم ہے، تو فوراً چوٹ لگا دی۔ اس نے کہا:-

"الغ خاں! ہم چاہتے ہیں اس مہم کو تم سر کرو۔ ہم اور خضر خاں تمہاری ماتحتی میں کام کریں گے!"

الغ خاں قدموں پر گر پڑا۔ اس نے کہا:-

"میرے آقا! ایسے الفاظ نہ استعمال کیجیے۔ غلام کو حکم دیجیے، اور پھر دیکھیے، وہ تعمیلِ ارشاد کے لئے جان کی بازی کس طرح لگاتا ہے؟"

علاء الدین نے اجازت دے دی، اور الغ خاں اپنا لشکر لے کر آگے بڑھا۔ راجپوتوں نے بھی جان کی بازی لگا دی تھی۔ کئی مرتبہ تو ایسا معلوم ہوا کہ الغ خاں ہار جائے گا۔ راجپوتوں نے جب یہ دیکھا، کہ مسلمانوں کا ریلا کسی طرح روکے نہیں رکتا، ایک طرف الغ خاں سر فروشی کی تمنا سے بے قرار سیلِ رواں کی طرح آگے بڑھ رہا ہے، دوسری طرف شہزادہ خضر خاں خون کے دریا میں نہایا ہوا کشتوں کے پشتے لگاتا آگے بڑھ رہا ہے، اور تیسری طرف خود علاء الدین بپھرے ہوئے شیر کی طرح بڑھتا چلا آ رہا ہے۔ تو انہوں نے "جوہر" کا فیصلہ کر لیا یعنی عورتیں آگ میں جل گئیں اور وہ اپنے ناموس کی طرف سے مطمئن ہو کر میدانِ جنگ میں جان دینے کے لئے کود پڑے۔ لیکن علائی فوجوں کے سامنے ان کا یہ عزمِ بیباکانہ بھی کام نہ آیا[1]! کئی روز تک کشت و خون کا سلسلہ جاری رہا، الغ خاں نے تو واقعی طے کر لیا تھا، کہ رنتھمبور کا داغِ ناکامی چتوڑ میں دھو کر رہے گا۔ وہ بڑی بے جگری اور ہمت کے ساتھ لڑا، زخمی ہوا۔ لیکن میدانِ جنگ سے منہ نہ موڑا۔ یہی حالت اس کی فوج کی بھی تھی۔ وہ بھی اپنے دامن سے ناکامی کا داغ دھونا چاہتی تھی، اور کوئی شبہ نہیں۔ الغ خاں اور اس کی فوج نے چتوڑ کے میدانِ جنگ میں جس جاں بازی کا مظاہرہ کیا۔ اس نے رنتھمبور کے داغِ ناکامی کو بالکل دھو دیا، یہ بڑا معرکہ کا رن تھا، اور بالآخر یہاں بھی راجپوت بُری طرح ناکام ہوئے، اور علاء الدین کے حصّہ میں

---

[1] چتوڑ کے ساتھ ہی پدمنی کا افسانہ بھی یاد آ جاتا ہے لیکن تاریخی اعتبار سے یہ غلط ہے۔ لہٰذا میں نے اس کا ذکر نہیں کیا۔

کامیابی اور کامرانی آئی۔ یہ دونوں مہمیں اس نے اتنی سرعت اور تیزی کے ساتھ سر کیں کہ ان پر کرامت کا شبہ ہوتا تھا۔ اور حُسنِ نیت سے بڑھ کر کوئی کرامت نہیں۔ اس نے حضرت سلطان المشائخ سے جو وعدہ کرلیا تھا اس پر سختی سے قائم تھا۔ اس نے اپنی زندگی کا رُخ بدل دیا تھا، مقاصد بدل دیئے تھے۔ پہلے وہ صرف ایک تاجدار تھا، ایک بادشاہ تھا، ایک کشورکشا تھا جو اپنے سوا کسی کی سلطانی تسلیم نہیں کرتا، جو چاہتا ہے کرتا ہے نہ اس سے بازپُرس ہوسکتی ہے، نہ اس کی تادیب و اصلاح کی جاسکتی ہے، لیکن اب وہ ایک مجاہد تھا، ایک غازی تھا۔ اب تک وہ اپنے لئے، اپنی اولاد کے لئے حصولِ زر کے لئے، مالِ غنیمت کے لئے تلوار میان سے باہر نکالتا تھا، اب اس کی تلوار قوم اور مذہب کے لئے میان سے باہر آتی تھی، مسلمانوں کی فلاح، اعلائے کلمۃ الحق اور کلمۃ اللہ کی سربلندی بھی اس کا مقصد تھا۔ یہ مقصد جتنا نیک تھا اس کے حصول کے لئے جس خلوص اور جوش کے ساتھ وہ برسرِکار تھا اسی تناسب سے تائیدِ الٰہی بھی اس کے ساتھ تھی، وہ بڑی آسانی سے ناممکن کو ممکن کر دکھاتا تھا!

فتحِ چتوڑ کے بعد اس نے الغ خاں کو بھی خوب نوازا، اور جب یہاں سے کامیاب و کامران واپس چلنے کا وقت آیا تو اس نے محسوس کیا، جو کچھ ہوچکا ہے اگرچہ کافی ہے، بہت زیادہ ہے، پھر بھی دل کی امنگ سے مطابقت نہیں رکھتا۔ لہٰذا اس نے راستہ بدل دیا اور چتوڑ سے مالوہ پہنچا۔ وہاں فتح اور کامرانی کے جھنڈے لہرائے، دشمنوں کو زیر کیا، رقبۂ مملکت میں اضافہ کیا، پھر وہاں سے گجرات پہنچا۔ یہاں بھی اگرچہ شدید مزاحمت ہوئی، لیکن جو طاقت رنتھمبور اور چتوڑ کے مورچے سر کرچکی تھی وہ مالوہ میں کیا اٹکتی؟ اور گجرات میں اس کے قدم کیوں ڈگمگاتے؟ چنانچہ یہاں بھی فتح و کامرانی حاصل ہوئی اور پھر شاداں و فرحاں، شادکام و بامراد یہ لشکر بھی دلی پہنچ گیا۔ —— آج بھی خلقت تماشائی بنی گلیوں اور کوچوں، سڑکوں اور چوراہوں پر کھڑی تھی، آج بھی کوٹھوں اور بالاخانوں کی کھڑکیوں سے لڑکیاں اور عورتیں ان سورماؤں کو جھانک رہی تھیں، آج بھی قلعہ کے جھروکے سے دو بڑی بڑی آنکھیں سب سے بے نیاز اس منظر کو تک رہی تھیں، اور خضر خاں سے چار ہونے کے بعد وہ بڑی بڑی پلکیں اس طرح جُھک گئیں جیسے چھوئی مُوئی کی پتیاں لجا کر جُھک جاتی ہیں!

دیوار

خضر خاں دلّی واپس آچکا تھا، کئی مرتبہ راجکماری دیول دیوی سے ملاقات بھی ہو چکی تھی۔ ہر ملاقات میں دل کی بیتابی کچھ اور بڑھ جاتی تھی، ہر ملاقات میں آرزوئیں اور تمنائیں پہلے سے زیادہ مچلنے لگتی تھیں، ہر ملاقات میں ہمیشہ کے لئے جدا نہ ہو سکنے کی حسرت کچھ اور بھڑک اٹھتی تھی۔ لیکن درمیان میں ایک ایسی دیوار کھڑی تھی، جسے توڑنا اور توڑ کر امید کے قلعے میں پہنچنا ناممکن تھا۔ یہ دیوار نہیں تھی، خود ایک قلعہ تھا، ناقابلِ تسخیر، خود ایک حصار تھا ناقابلِ فتح، بھلا کس میں سکت تھی کہ اسے سر کرنے کا خیال بھی دل میں لا سکتا۔ علاء الدین خلجی کو اس کے ارادہ سے پھیرنا کوئی آسان کام تھا؟ گھنٹوں اور پہروں یہ دونوں سر جوڑ کر بیٹھتے تھے اور اس گتھی کو حل کرنے میں لگ جاتے تھے۔ راجکماری دیول دیوی اپنی معصومیت اور سادہ لوحی کے باعث شروع شروع میں صورتِ مسئلہ کی نزاکت سے پورے طور پر واقف نہیں تھی۔ اسی لئے اسے کچھ زیادہ اہمیت بھی نہیں دیتی تھی۔ لیکن یہاں قیام کی مدت جتنی طویل ہوتی جاتی تھی، حالات و اشکاف ہوتے جاتے تھے، امیدیں پژمردہ ہوئی جاتی تھیں۔ ناکامی اور نامرادی کا اندیشہ بڑھتا جاتا تھا:

"اب کیا ہوگا؟"

بس یہی ایک فکر تھی، جو خضر خاں اور دیول دیوی کے دل میں ہلچل برپا کئے ہوئے تھی! ——

خضر خاں اس حقیقت سے باخبر ہو چکا تھا کہ علاء الدین اس رشتہ کو پسند نہیں کرتا، دیول دیوی کے دل میں بھی خضر خاں کی دل گرفتگی اور مایوسی نے یہ بات ڈال دی تھی کہ یہ بیل منڈھے چڑھتی نظر نہیں آتی کنول دیوی حالات سے بالکل بے خبر تھی۔ علاء الدین کیوں اس رشتہ کو ناپسند کرتا ہے۔ اس کی وجہ نامعلوم تھی، صرف قیاس کا جہاں تک تعلق تھا، یہ دونوں ستم کشِ محبت ایک دوسرے سے کچھ کہے بغیر اپنے اپنے دل میں توجیہیں گڑھا کرتے تھے۔ خضر خاں کا خیال تھا کہ خلجی اس لئے اس رشتہ کو ناپسند کرتا ہے کہ یہ بات آدابِ شاہی کے خلاف ہے کہ اس کا ولی عہد ایک غیر مذہب اور غیر خاندان کی لڑکی سے شادی کرے۔ دیول دیوی بھی جب اس مسئلہ پر غور کرتی تو صرف ایک ہی بات اس کے دل میں آتی تھی۔ بھلا مخمل میں کہیں ٹاٹ کا پیوند لگ سکتا ہے، کنول دیوی اوّل تو اس بات کو سوچتی ہی نہیں تھی اور اگر کبھی بھولا بھٹکا خیال اس طرف آ گیا تو وہ اسے دھکے دے کر اپنے نہاں خانۂ دماغ سے نکال دیتی تھی۔ بھلا ایسی اَن ہونی بات بھی کہیں ہو سکتی ہے۔ دیول دیوی لاکھ خوبصورت، خوب سیرت، حسین و جمیل سہی، لیکن کہاں گنگوا تیلی، اور کہاں راجہ بھوج۔ بہتر یہ ہے کہ اس بات کو زیرِ غور ہی نہ لایا جائے۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ وہ اپنی لڑکی کے مستقبل کے بارے میں حد سے زیادہ پریشان تھی۔ اس بات پر وہ خدا کا شکر ادا کرتی تھی کہ دیول دیوی گوبند پرشاد کے پنجۂ ہوس سے رہا ہو گئی۔ کرن سنگھ کی خود غرضی پر بھینٹ چڑھنے سے بچ گئی۔ لیکن اسے زندگی بھی تو بسر کرنی تھی، —— مگر کہاں اور کس کے ساتھ؟ یہ لاینحل معمہ تھا جو آیا تھا، اس نے انقلابِ احوال سے پیشتر کس کس خوشامد اور منت سے استدعا کی تھی کہ اس کے لڑکے کے ساتھ دیول دیوی بیاہ دی جائے۔ لیکن نہ کرن سنگھ نے پروا کی، نہ دیول دیوی اس کے بیٹے کو خاطر میں لائی، نہ خود میں نے اِدھر دھیان دیا۔ اب جب وہ شہنشاہ کا مطیع اور فرمانبردار بن کر دلّی آیا، تو بھی اسے اپنی تمنا یاد تھی، بار بار اس نے التجائیں کیں کہ اس کے بیٹے کو داماد بنا لوں لیکن نہ جانے دماغ

کیوں پھر گیا تھا کہ مَیں نے دیول دیوی سے بھی مشورہ کرنے کی ضرورت نہ محسوس کی، اور صاف انکار کر دیا، اور اب محسوس کرتی ہوں کہ یہ بہت بڑی غلطی ہوگی۔ موجودہ حالات میں رام دیو کے لڑکے سے بہتر کوئی بر دیول دیوی کو نہیں مل سکتا، ——— کیوں نہ از سرِ نو سلسلہ جنبانی کی جائے۔ جبکہ اتفاق سے بڑا اچھا موقع بھی میسر آگیا ہے۔ مَیں نے سُنا ہے، اس کا سفیر آیا ہُوا ہے اور شہنشاہ کا مہمان ہے!

اور جس وقت ماں بیٹی کے بارے میں یہ باتیں سوچ رہی تھی، وہ اپنے کمرہ میں صندل کے تخت پر ریشمی گاؤ تکیہ سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ ایک پاؤں زمین پر لٹکا رکھا تھا، دوسرا تخت پر سمٹا ہُوا تھا۔ رادھا سمٹے ہوئے پاؤں کو دبا رہی تھی، اور سنجوگتا لٹکے ہوئے پاؤں کو اس طرح ہاتھ میں لئے آہستہ آہستہ سہلا رہی تھی جیسے یہ بہت بڑی اور قیمتی پونجی ہو۔ دیول دیوی کے خوبصورت ہونٹوں پر تبسّم کھیل رہا تھا، رادھا اور سنجوگتا بھی اسے خوش دیکھ کر خوش ہو رہی تھیں۔ رادھا نے راجکماری سے کہا:

"کئی دن ہو گئے شہزادے صاحب نہیں آئے؟"

وہ مسکرائی اور جواب دیا:-

"آج آئیں گے، ——— آج کا وعدہ کر گئے تھے!"

سنجوگتا بولی:-

"روز کیوں نہیں آتے۔ کچھ ان کے پاؤں میں مہندی لگی رہتی ہے کہ چھوٹ جائے گی!"

دیول دیوی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"آ لینے دے، پھر پوچھ لینا، ——— اری پگلی، وہ شہزادے ہیں، ولی عہد ہیں، اور بھی تو بہت سے کام رہتے ہیں، ہر وقت یہاں کیسے بیٹھے رہیں؟"

سنجوگتا: "ہر وقت بیٹھنے کو کون کہتا ہے، بس دن میں ایک دفعہ آ جایا کریں۔ تھوڑی دیر بیٹھیں اور چلے جائیں، کوئی اُن کا دامن پکڑ کر تھوڑے بیٹھتا ہے!"

دیول دیوی: "ہاں یہ تو میں بھی چاہتی ہوں، کئی دفعہ کہا بھی لیکن وہ بیچارے بھی تو مجبور ہیں شہنشاہ سے بہت ڈرتے ہیں، کہتے ہیں، زیادہ آمد و رفت کا نتیجہ کہیں یہ نہ نکلے کہ آنا جانا بھی بند کر دیا جائے تو اور لینے کے دینے پڑ جائیں!"

سنجوگتا: "کیوں آنا جانا کیوں بند کر دیا جائے گا؟ ——— کیا ہم کسی سے ہیٹے ہیں؟ کم ہیں؟"

دیول دیوی: "اری تو بڑی بے وقوف ہے، کچھ سمجھتی ہی نہیں، کم ہونے اور ہیٹے ہونے کا سوال نہیں بات یہ ہے کہ شہنشاہ اپنے ولی عہد کی بڑی سخت نگرانی رکھتے ہیں!"

رادھا: "اگر کہیں شہزادے لڑکی ہوتے جب تو شاید چوکی پہرہ مقرر ہوتا ان پر؟"

دیول دیوی ہنسنے لگی۔ اس نے کہا:

"تم لوگ بڑی چنچل ہو، آنے دو شہزادے کو ضرور ایک بات کہوں گی ان سے!"

رادھا: "تم کیا کہو گی، راجکماری ہم خود ہی صاف صاف باتیں کرنے کا تہیہ کر چکے ہیں۔ ہم میں تو وہ کسی طرح!"

دیول دیوی: (حیران ہو کر) "اُن سے کیا باتیں کرے گی، ذرا مجھے بھی تو بتا۔ میں بھی تو سنوں!"

رادھا: "کہیں گے، یہ چھپ چھپ کر ڈر ڈر کر آنا بند کرو، مرد ہو تو مردانہ حوصلہ سے کام لو۔ جس سے محبت کرتے ہو اس کا ہاتھ پکڑ دو، اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کے ہو جاؤ، ——— آخر اس طرح کب تک کام چلے گا؟"

دیول دیوی: (گھبرا کر) "ارے کہیں ایسا غضب نہ کرنا، وہ تو خود اسی فکر میں گھلے جا رہے ہیں!"

رادھا: "تو پھر آگے کیوں نہیں بڑھتے؟ دل کی بات زبان تک کیوں نہیں لاتے؟ ڈر کاہے کا؟ جھجک کیسی؟"

دیول دیوی: "بالکل نادان ہے رادھا تو تو، ——— کہہ تو رہی ہوں، وہ شہنشاہ سے ڈرتے ہیں میں بھی تو ڈرتی ہوں ان سے۔ کون نہیں ڈرتا شہنشاہ سے، ان کے مزاج اور طبیعت سے واقف

ڈر لگتا ہے۔ ماتاجی کو شہنشاہ اتنا چاہتے ہیں، لیکن وہ بھی بعض وقت سہم جاتی ہیں ان سے!"

رادھا۔" تو پھر اس طرح کام کیسے چلے گا؟"

دیول دیوی۔" کوئی تدبیر سوچ لیں، بڑی اچھی تدبیر ہے وہ، کیا مجال ہے جو پٹ پڑ جائے!"

سنجوگتا۔" نہ جانے کونسی تدبیر ہے وہ!"

دیول دیوی۔" شہنشاہ بہت جلد ایک بہت بڑا دربار منعقد کرنے والے ہیں، اس میں ان لوگوں کو انعامات دیئے جائیں گے جنہوں نے رنتھمبور اور چتوڑ کی جنگ میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ کچھ تجھے خبر بھی ہے۔ اکیلے شہزادے نے رنتھمبور کا قلعہ فتح کیا ہے، جو آسمان سے باتیں کر رہا تھا، تو شہزادے کو بھی انعام ملے گا، وہ صاف صاف کہہ دیں گے، مجھے کوئی اور انعام نہیں چاہیئے سوائے دیول دیوی کے!"

یہ کہتے کہتے دیول کے چہرے پر شرم و حجاب کی کیفیت طاری ہو گئی، اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور اس نے شرما کر اپنی ہنس کی سی گردن جھکالی۔

سنجوگتا۔" اور اگر شہنشاہ نے یہ انعام دینے سے انکار کر دیا، تب کیا ہو گا؟"

رادھا بگڑ گئی، اس نے گھور کر سنجوگتا کو دیکھا اور خفگی کے لہجہ میں کہا:۔

"تیرے منہ میں خاک، شہنشاہ انکار کر دیں گے؟ یہ ہو سکتا ہے بھلا؟ کیا شہنشاہ کو ہماری راجکماری سے اچھی بہو مل سکتی ہے؟"

سنجوگتا۔" نہیں، تم میرا مطلب نہیں سمجھیں، یہ تو اب ٹھیک ہے۔ مگر ایک بات تو ہم میں سے کسی نے بھی نہیں سوچی!"

رادھا۔" وہ کونسی بات ہے سنجوگتا دیوی؟"

سنجوگتا۔" وہ بات نہیں، دیوار ہے، بہت بڑی دیوار، دھرم کی دیوار، —— دیکھ لینا، یہ ضرور

آڑے آئے گی اس کا کچھ اپائے (تدارک) سوچ لینا ضروری ہے!"

رادھا سوچ میں پڑ گئی، اس نے آہستہ سے کہا:۔

"ہاں اس طرف تو کبھی ہمارا دھیان ہی نہیں گیا!"

دیول دیوی نے مسکراتے ہوئے مداخلت کرتے ہوئے کہا:۔

"لیکن یہ تو کوئی دیوار نہیں ہے، اور اگر ہے بھی تو بہت معمولی!"

سنجوگتا۔ "واہ راجکماری، یہ کیسی بات کہہ رہی ہو تم!"

دیول دیوی۔ "ہاں ——— یہ دیوار پہلے کبھی مضبوط رہی ہو گی۔ اب تو مکڑی کے جالے سے بھی زیادہ کمزور ہے، ——— جب تک بلگانہ فتح نہیں ہوا تھا، میں رام نگر نہیں گئی تھی، میری ماتا مسلمانوں کے ہاتھوں قید نہیں ہوئی تھیں، پتاجی نے انہیں اچھوت سے بدتر سمجھ کر ان سے نفرت نہیں شروع کی تھی اس وقت تک میں بڑی پکی ہندو تھی۔ میرا دھرم پہاڑ کی طرح اٹل تھا اس دھرم پر میں ہر چیز کو قربان کر سکتی تھی، حتّٰی کہ اپنے دل کو بھی، محبت کو بھی، سکھ، راحت، آرام ہر چیز کو ——— لیکن جب میں نے گھر سے باہر قدم نکالا اور دھرم کا اصل روپ دیکھا تو اسی دن میں نے اس دھرم کو چھوڑ دیا تھا، سچ بتا رادھا، پھر کبھی تو نے مجھے پوجا پاٹ کرتے دیکھا؟"

رادھا۔ "نہیں ——— اب سوچتی ہوں تو یاد آتا ہے، واقعی کبھی نہیں دیکھا!"

دیول دیوی۔ "اور پھر جب میں خضر خاں کے ساتھ دلی آئی، میں نے مسلمانوں کا جلوہ دیکھا۔ ان کی شرافت اور انسانیت دیکھی، بے سہارا دکھی لوگوں کے ساتھ ان کا برتاؤ دیکھا، اپنی دکھیاری ماں کا عروج دیکھا، ——— جسے زندگی بھر کے رفیق اور محبت کرنے والے شوہر نے ٹھکرا دیا تھا صرف اس جرم میں کہ وہ بے خطا تھی، ——— اپنا اعزاز و اکرام دیکھا مسلمانوں کی بے تعصبی اور رواداری دیکھی، غیر مسلموں سے ان کا حسنِ سلوک دیکھا، رام دیو پر احسان و کرم کی بارش دیکھی،

جب سے سچ کہتی ہوں، مجھے اپنی بدقسمتی پر افسوس ہوتا ہے کہ اتنے دنوں تک اندھیرے میں کیوں رہی ؛ روشنی سے بیگانہ اور محروم کیوں رہی ؟ ——— "

رادھا۔ "یعنی تم مسلمان کیوں نہیں ہوگئیں ؟ "

سنجوگتا۔ (دانتوں تلے انگلی دباکر) "چُپ پگلی کہیں کی !"

دیول دیوی۔ "ہاں رادھا یہی بات ہے میری پختہ رائے ہے کہ اگر کوئی دھرم قبول کیا جا سکتا ہے، تو وہ اسلام ہی ہے ؛ ——— جو دھرم انسان کو ذلیل کرتا ہو، مَیں تو اس کی جگہ بند نہیں قبول کر سکتی، جو دھرم انسان کو بام رفعت پر پہنچاتا ہو وہی اصل دھرم ہے اور مَیں اسی کی پُوجا کر سکتی ہوں !

سنجوگتا۔ "تو راجکماری، کیا تم مسلمان ہوگئیں ؟ "

دیول دیوی۔ "ہاں، ——— تجھے یقین کیوں نہیں آتا ؟"

رادھا۔ "لیکن یہ تو آج سُن رہی ہوں، پہلے کبھی تم نے ذکر بھی نہیں کیا !"

دیول دیوی۔ "ذکر کرنے کی کیا ضرورت ہے ؛ دھرم کا معاملہ، بندے اور پرمیشور (خدا) کا معاملہ ہے کسی دوسرے کو رازدار بنانے کی کیا ضرورت ہے ؛ مَیں نے تو یہ بات کبھی شہزادے سے بھی نہیں کہی !"

سنجوگتا۔ "مَیں کہہ دوں گی !"

دیول دیوی۔ "خبردار، ——— کوئی ایسی بات نہیں کرنا چاہتی جس سے یہ معلوم ہو کہ مَیں شہزادے یا شہنشاہ کو پرچانا چاہتی ہوں ! یہ میرا ذاتی معاملہ ہے مَیں جانوں اور میرا بھگوان جانے، کسی دوسرے کو اس میں دخل دینے کی کیا ضرورت ہے ؟"

اور عین اسی وقت جب یہاں یہ باتیں ہو رہی تھیں، شہنشاہ علاءالدین خلجی اور رانی کنول دیوی آمنے سامنے بیٹھے رازدارانہ طور پر خلوت میں باتیں کر رہے تھے۔ علاءالدین نے محبت بھری نظروں سے کنول دیوی کو دیکھا اور کہا :-

"رانی! تم اپنی کسی خواہش کا ہم سے اظہار نہیں کرتیں، اپنی کسی فکر کا ہم سے ذکر نہیں کرتیں، اپنی کسی بات کا ہم سے تذکرہ نہیں کرتیں، آخر کیوں؟ کچھ خفا ہو ہم سے؟ کوئی بات ناگوار گزری ہے تمہیں؟"

رانی کنول دیوی: "جہاں پناہ ایسی باتیں کر کے داسی کا دِل نہ دُکھائیے۔ میرے دل میں آپ کی جو محبت اور عظمت ہے، اس کا اندازہ خدا کے سوا کوئی نہیں کر سکتا۔ مجھے نئی زندگی ملی ہے، اور یہ صرف آپ کی عطا کی ہوئی ہے۔ کیا میں زندگی کی آخری سانس تک اس احسان کو بھول سکوں گی؟ میرا ہر بُن مُو آپ کا شکر گزار ہے، جب دُنیا میں میرا کوئی نہ رہ گیا تھا، آپ اُٹھے، آپ نے مجھے سہارا دیا، جب سب نے، دھرم والوں نے، قوم والوں نے، گھر والوں نے، شوہر تک نے مجھے ٹھکرا دیا تھا، آپ نے مجھے اپنا بنا لیا، پہلے میں صرف ایک معمولی راجہ کی رانی تھی، اب شہنشاہِ ہندوستان کی ملکہ ہوں، جس کے دبدبہ اور طنطنہ سے زمین و آسمان کانپتے ہیں ———— ہاں ایک دُکھ ضرور تھا، ایک کانٹا تھا جو میرے دل میں برابر کھٹکتا رہتا تھا، جس نے میری زندگی کو تلخ بنا دیا تھا جس نے میری زندگی اجیرن بنا دی تھی، جس نے میرا سُکھ چھین لیا تھا، ———— دیول دیوی کی جُدائی ———— سو آپ کی مہربانی سے وہ کانٹا بھی نکل گیا۔ میری بچی مجھے مل گئی، اور میں نے ہر وہ چیز پالی، جس کی تمنا کر سکتی تھی، جب تک وہ نہیں آئی تھی، میرا دل دھڑکتا رہتا تھا، آپ نے جذبہ میں آ کر شہزادہ خضر خاں کو اس خطرناک اور جان جوکھوں کے کام پر روانہ کر دیا، بس یہ چند دن تھے، جب میں اپنی لڑکی سے نفرت کرنے لگی تھی۔ کاش وہ پیدا نہ ہوئی ہوتی، کسی طرح بھی مَیں اس پر تیار نہ تھی کہ اس کے لئے شہزادے کی زندگی خطرے میں ڈالوں، لیکن بھلا کس میں مجال ہے کہ شہنشاہ کو ان کے فیصلہ سے پھیر سکے، مَیں چپ رہی، لیکن میرا دل رو رہا تھا۔ شہزادہ پر کوئی آنچ آئے، اسے مَیں گوارا نہیں کر سکتی تھی ————"

علاء الدین خلجی: "ماشاء اللہ جوان لڑکی ہے، سوچنا کیا ہے کسی شریف راجکمار سے شادی کر دی

جب سے سچ کہتی ہوں، مجھے اپنی بدقسمتی پر افسوس ہوتا ہے کہ اتنے دنوں تک اندھیرے میں کیوں رہی؟ روشنی سے بیگانہ اور محروم کیوں رہی؟ ــــــــ"

رادھا ۔ "یعنی تم مسلمان کیوں نہیں ہوگئیں؟"

سنجوگتا ۔ (دانتوں تلے انگلی دبا کر) "چپ پگلی کہیں کی!"

دیول دیوی ۔ "ہاں رادھا یہی بات ہے میری پختہ رائے ہے کہ اگر کوئی دھرم قبول کیا جا سکتا ہے تو وہ اسلام ہی ہے ــــــــ جو دھرم انسان کو ذلیل کرتا ہو، میں تو اس کی جگر بند نہیں قبول کر سکتی، جو دھرم انسان کو بام رفعت پر پہنچاتا ہو وہی اصل دھرم ہے اور میں اسی کی پوجا کر سکتی ہوں!"

سنجوگتا ۔ "تو راجکماری، کیا تم مسلمان ہوگئیں؟"

دیول دیوی ۔ "ہاں، ــــــــ تجھے یقین کیوں نہیں آتا؟"

رادھا ۔ "لیکن یہ تو آج سن رہی ہوں، پہلے کبھی تم نے ذکر بھی نہیں کیا!"

دیول دیوی ۔ "ذکر کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ دھرم کا معاملہ، بندے اور پرمیشور (خدا) کا معاملہ ہے کسی دوسرے کو رازدار بنانے کی کیا ضرورت ہے؟ میں نے تو یہ بات کبھی شہزادے سے بھی نہیں کہی!"

سنجوگتا ۔ "میں کہہ دوں گی!"

دیول دیوی ۔ "خبردار، ــــــــ کوئی ایسی بات نہیں کرنا چاہتی جس سے یہ معلوم ہو کہ میں شہزادے یا شہنشاہ کو پرچانا چاہتی ہوں! یہ میرا ذاتی معاملہ ہے میں جانوں اور میرا بھگوان جانے، کسی دوسرے کو اس میں دخل دینے کی کیا ضرورت ہے؟"

اور عین اسی وقت جب یہاں یہ باتیں ہو رہی تھیں، شہنشاہ علاء الدین خلجی اور رانی کنول دیوی آمنے سامنے بیٹھے رازدارانہ طور پر خلوت میں باتیں کر رہے تھے۔ علاء الدین نے محبت بھری نظروں سے کنول دیوی کو دیکھا اور کہا:۔

"رانی! تم اپنی کسی خواہش کا ہم سے اظہار نہیں کرتیں، اپنی کسی فکر کا ہم سے ذکر نہیں کرتیں، اپنی کسی بات کا ہم سے تذکرہ نہیں کرتیں، آخر کیوں؟ کچھ خفا ہو ہم سے؟ کوئی بات ناگوار گزری ہے تمہیں؟"

رانی کنول دیوی۔ "جہاں پناہ ایسی باتیں کر کے داسی کا دل نہ دکھائیے۔ میرے دل میں آپ کی جو محبت اور عظمت ہے، اس کا اندازہ خدا کے سوا کوئی نہیں کر سکتا۔ مجھے نئی زندگی ملی ہے، اور یہ صرف آپ کی عطا کی ہوئی ہے۔ کیا میں زندگی کی آخری سانس تک اس احسان کو بھول سکوں گی؟ میرا ہر بُن مُو آپ کا شکر گزار ہے، جب دُنیا میں میرا کوئی نہ رہ گیا تھا، آپ اُٹھے، آپ نے مجھے سہارا دیا، جب سب نے، دھرم والوں نے، قوم والوں نے، گھر والوں نے، شوہر تک نے مجھے ٹھکرا دیا تھا، آپ نے مجھے اپنا بنا لیا، پہلے میں صرف ایک معمولی راجہ کی رانی تھی، اب شہنشاہِ ہندوستان کی ملکہ ہوں، جس کے دبدبہ اور طنطنہ سے زمین و آسمان کانپتے ہیں ——— ہاں ایک دُکھ ضرور تھا، ایک کانٹا تھا جو میرے دل میں برابر کھٹکتا رہتا تھا، جس نے میری زندگی کو تلخ بنا دیا تھا، جس نے میری زندگی اجیرن بنا دی تھی، جس نے میرا سُکھ چھین لیا تھا، ——— دیول دیوی کی جُدائی ——— سو آپ کی مہربانی سے وہ کانٹا بھی نکل گیا۔ میری بچی مجھے مل گئی، اور میں نے ہر وہ چیز پالی، جس کی تمنا کر سکتی تھی، جب تک وہ نہیں آئی تھی، میرا دل دھڑکتا رہتا تھا، آپ نے جذبہ میں آکر شہزادہ خضر خاں کو اس خطرناک اور جان جوکھوں کے کام پر روانہ کر دیا، بس یہ چند دن تھے، جب میں اپنی لڑکی سے نفرت کرنے لگی تھی۔ کاش وہ پیدا نہ ہوئی ہوتی، کسی طرح بھی میں اس پر تیار نہ تھی کہ اس کے لئے شہزادے کی زندگی خطرے میں ڈالوں، لیکن بھلا کس میں مجال ہے کہ شہنشاہ کو ان کے فیصلہ سے پھیر سکے۔ میں چپ رہی، لیکن میرا دل رو رہا تھا۔ شہزادہ پر کوئی آنچ آئے، اسے میں گوارا نہیں کر سکتی تھی ———"

علاؤالدین خلجی۔ "ماشاء اللہ جوان لڑکی ہے، سوچتا کیا ہے کسی شریف راجکمار سے شادی کر دی

جائے اس کی !"

رانی کنول دیوی :- "ہاں ہے تو بہتر، لیکن کس سے بات چیت چھیڑی جائے ؟"

علاءالدین خلجی :- "رام دیو اپنے راجکمار کے لئے مصر ہے۔ اس کی دلی تمنّا ہے کہ دیول دیوی اس کی بہو بنے، تم نے سنا ہوگا، اس کا سفیر آج کل آیا ہوا ہے یہاں ؟"

رانی کنول دیوی :- "جی ہاں کل ہی معلوم ہوا مجھے !"

علاءالدین خلجی :- "اسے رام دیو نے اس لئے بھیجا ہے کہ میرے ذریعہ سلسلۂ جنبانی کی جائے !"

رانی کنول دیوی :- "پھر آپ نے کیا جواب دیا ؟"

علاءالدین خلجی :- "کچھ نہیں، تمہاری مرضی اور مشورہ کے بغیر میرا کچھ کہنا مناسب نہ تھا، اب جیسا کہو ویسا کیا جائے ؟"

رانی کنول دیوی :- "آپ کی رائے کیا ہے ؟"

علاءالدین خلجی :- "میری ذاتی رائے کا جہاں تک تعلق ہے۔ میں تو اس میں کچھ ہرج نہیں سمجھتا، رام دیو سے اچھی طرح واقف ہوں، شریف ہے، باوضع ہے، بااصول ہے، وفادار ہے، قول کا پکا اور بات کا دھنی ہے، جو شرط وہ منظور کرے گا، اسے آخر تک نباہے گا !"

رانی کنول دیوی :- "اور اس کا لڑکا ؟"

علاءالدین خلجی :- "اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم، لیکن آخر باپ کا اثر کہاں تک نہ ہوگا بیٹے میں ؟"

رانی کنول دیوی :- "ہاں یہی میں بھی سوچتی ہوں !"

علاءالدین خلجی :- "موجودہ حالات میں تو اس سے بہتر رشتہ کی توقع نہیں کی جا سکتی، — پھر جیسا کہو، ویسا کیا جائے !"

رانی کنول دیوی :- "اگر آپ اجازت دیں تو دیول دیوی سے بھی پوچھ لوں، آخر زندگی اسی کو نباہنی ہے !"

علاء الدین خلجی :۔ "ہاں کوئی مضائقہ نہیں ۔ ہمارے اسلام میں تو لڑکی کو پورا حق ہے کہ اقرار کرے یا انکار کر دے، ہرگز اس پر کوئی دباؤ نہیں ڈالا جا سکتا !"

رانی کنول دیوی :۔ "اسلام کی فضا میں سانس لینے کے بعد ہی تو یہ خیال آیا میرے دل میں، ورنہ مالِ تجارت کی طرح پوٹلی میں باندھ کر جس کے چاہتی حوالہ کر دیتی !"

علاء الدین خلجی :۔ (ہنس کر) "بڑی دلچسپ باتیں ہوتی ہیں تمہاری ۔۔۔۔۔ کیا تمہیں اندیشہ ہے کہ وہ انکار کر دے گی !"

رانی کنول دیوی :۔ "بڑی لاڈلی بچی ہے، مَیں تو اس کی مرضی کے خلاف کوئی بات نہیں کرنا چاہتی اگر وہ راضی ہو گئی، تو ہاں کر دوں گی، اور اگر اس نے انکار کیا تو مَیں بھی صاف جواب دینے پر مجبور ہو جاؤں گی، اور مجھے امید ہے کہ جہاں پناہ بھی میری تائید فرمائیں گے، آج ہی اس سے بات چیت کر کے کل آپ کو اطلاع دے دوں گی !"

علاء الدین خلجی :۔ "نہیں کوئی اعتراض نہیں، ہم ہرگز یہ نہیں چاہتے کہ دیول دیوی کی مرضی کے خلاف کوئی بات کی جائے، اسے ہم اتنا ہی چاہتے ہیں جتنا خضر خاں کو !"

رانی کنول دیوی :۔ "یہ میرا ایمان ہے جہاں پناہ !"

علاء الدین خلجی تھوڑی دیر بیٹھ کر اپنے محل میں واپس پہنچا، اور راستہ بھر اسی مسئلہ پر غور کرتا رہا۔ وہ واقعی دیول دیوی کو اولاد کی طرح چاہنے لگا تھا۔ اس کے دل میں یہ تمنا بھی کبھی کبھی مچلنے لگی تھی، کہ کاش دیول دیوی رام دیو کے بجائے اس کی بہو بنتی ۔ لیکن وہی دھرم اور مذہب کا سوال سامنے آ جاتا تھا، ایک غیر مسلم لڑکی سے وہ اپنے ولی عہد کی شادی کسی قیمت پر کرنا نہیں چاہتا تھا، اور یہ بھی منظور نہ تھا کہ کسی کے مذہب کو دباؤ یا لالچ کے ماتحت بدلنے کی کوشش کی جائے ۔ کنول دیوی اپنی مرضی سے بلکہ جبراً سے مسلمان ہو چکی تھی ۔ لیکن دیول دیوی کے بارے میں اس نے اشارۃً بھی استفسار اور استصواب

نہیں کیا، اسے کیا حق تھا کہ ایک لڑکی جو ہندو ماں باپ کی گود میں پلی، جس نے ہندو دھرم کی گود میں آنکھ کھولی، جس کی رگ و پے میں ہندو سماج کے ریت اور رسم سرایت کیئے ہوئے ہوں، اس سے مذہب اور دھرم کے بارے میں کوئی سوال کرے، یا اسے کسی طرح اس سے منحرف کرنے کی کوشش کرے! ـــ پھر جب یہ بات نہیں ہوسکتی، دھرم نہیں بدل سکتا، تو ضرور ہے کہ کسی ہم مذہب کے ساتھ اسے زندگی بسر کرنے کا موقع فراہم کیا جائے۔ اس نقطۂ نظر سے رام دیو کے خاندان سے بہتر کوئی خاندان اس کی نظر میں نہیں تھا!

پھر یہ خیال بھی آتا تھا کہ یہ کمبخت خضر خاں ہزار جان سے فریفتہ ہے اس پر میں نے اسے رنتھمبور اور چتوڑ کے معرکوں میں اُلجھایا، الجھ گیا، جان کی بازی لگا دی۔ تن تنہا اس ناقابل تسخیر قلعہ کو فتح کرکے مجھے حیران کردیا[1]۔ اسی کی وجہ سے مالوہ اور گجرات ہوکر آیا کہ شاید طبیعت بہل جائے یہ سودا دماغ سے نکل جائے، لیکن وہ ہے کہ اسی غم میں سوکھا چلا جارہا ہے۔ مجھے وہ بہت عزیز ہے، لیکن اسلام اس سے زیادہ عزیز ہے، خضر خاں کی خوشی اور زندگی کے لئے میں دیول دیوی پر کسی طرح کا دباؤ نہیں ڈال سکتا، ـــــ ناممکن ـــــ! میں خدا کو کیا مُنہ دکھاؤں گا؟ حضرت سلطان المشائخ کو کیا جواب دوں گا؟ نہیں کوئی ایسی بات نہیں کرسکتا، جس پر بعد میں مجھے

---

[1] دلی سے فرنٹیئر میل پر بمبئی کی طرف چلئے تو راستے میں سوائی مادھوپور کا اسٹیشن آتا ہے۔ یہاں سے ۲۲،۳۰ میل کے فاصلہ پر یہ عظیم الشان قلعہ اپنی ناقابل تسخیر یادگاروں کے ساتھ اب بھی موجود ہے۔ یہاں علاء الدین خلجی کی بنائی ہوئی ایک مسجد بھی اب تک موجود ہے، جس کا کتبہ صاف پڑھا جاتا ہے۔ ایک بزرگ کا مزار بھی قلعہ میں ہے۔ اس سارے علاقہ کو اگر گنج شہیداں کہا جائے تو ذرا بھی مبالغہ نہ ہوگا، مزارات اور مساجد کی وہ کثرت ہے جس کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ عہد علائی کے بسائے ہوئے مسلمان بھی اب تک یہاں کافی تعداد میں موجود ہیں، زمانہ نے انہیں بہت کچھ بدل دیا ہے، لیکن اُن کی آن اب تک قائم ہے قلعہ میں علائی فوج کے چلائے ہوئے تین آہنی تیر اب تک دیوار میں پیوست ہیں اور یاد دلاتے رہتے ہیں کہ اس راہ سے ہمارا کاروان اقبال گزرا تھا۔

پچھتانا پڑے!

لیکن خضر خاں کس طرح راہِ راست پر آئے؟

جبر کرنے پر طبیعت رضامند نہیں ہوتی، اس کا اُترا ہوا چہرہ دیکھ کر خواہ مخواہ دل کڑھنے لگتا ہے، اور یہ مسئلہ ایسا ہے کہ بغیر سختی کے کام نہیں چل سکتا ۔ علاء الدین یہی باتیں سوچ رہا تھا، کہ قسمت کا مارا خضر خاں اس طرف آنکلا ۔ علاء الدین نے سوچا، اس سے اچھا وقت اس مسئلہ کے طے کرنے کا نہیں مل سکتا ۔ اُس نے بیٹے کو بُلا کر پاس بٹھایا اور کہا :۔

"بیٹے! میں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں، کیا تم اسے پسند کرتے ہو کہ اپنے لئے کسی دوسرے کی زندگی غارت کر دو؟ میں نے تمہیں جو تعلیم دلائی ہے، جو تربیت دی ہے، اس کی روشنی میں جواب دو، کیا کسی پر جبر کرنا جائز ہے؟ کسی کا مذہب بدلوانے کی کوشش کرنا ازروئے اسلام مستحسن ہے؟"

خضر خاں حیرت سے یہ باتیں سُن رہا تھا ۔ اس نے کہا :۔

"جہاں پناہ! ان سب سوالات کا جواب نفی میں ہے، اس سے بڑھ کر سفاک کون ہو سکتا ہے، جو کسی کی زندگی غارت کرے ۔ اس سے بڑھ کر اسلام کا دشمن کون ہو سکتا ہے جو کسی کا مذہب دباؤ سے بدلنے کی کوشش کرے!"

علاء الدین خوش ہو گیا ۔ اس نے کہا :۔

"شاباش بیٹے، مجھے تم سے اسی جواب کی توقع تھی ——— اب بتاؤ، پھر تم دیولدی سے محبت کیوں کرتے ہو؟ تم مسلمان ہو وہ ہندو ہے، تم کو اپنا مذہب عزیز ہے، اسے اپنے دھرم پر اعتقاد ہے، یہ اتنی بڑی دیوار ہے، جو کسی کے توڑے نہیں ٹوٹ سکتی ۔ ممکن ہے تمہارے اثر سے تمہاری خاطر سے وہ اپنا دھرم بدلنے پر راضی ہو جائے، لیکن کیا اسلام اس تبدیلی کو قبول کرے گا؟ شرافت،

انسانیت اور اسلامیت کا تقاضا یہ ہے کہ تم راستہ سے ہٹ جاؤ۔ وہ ہندو ہے، اسے موقع دو کہ وہ اپنا ہندو شریکِ حیات منتخب کرلے، ——— تم اسے بہلا پھُسلا کر اس کے دھرم سے منحرف کرنے کی کوشش نہ کرو، ——— میں چاہتا ہوں مجھ سے عہد کرو کہ اب دیول دیوی کے پاس اس کے محل میں نہیں جاؤگے ؛ صرف اسی طرح وہ تمہیں بھول سکتی ہے، اور ٹھنڈے دل سے اپنے مستقبل کے بارے میں کوئی فیصلہ کر سکتی ہے، بتاؤ کرتے ہو عہد ؛"

خضر خاں کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ اسے ساری دُنیا گھومتی ہوئی نظر آنے لگی۔ اس نے گلوگیر آواز کے ساتھ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے اُٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا :۔

"جہاں پناہ! میں عہد کرتا ہوں کہ دیول دیوی کے پاس اب نہیں جاؤں گا!"

علاء الدین خوش ہو گیا۔ اس نے اپنے سعادت مند بیٹے کو شاباش دی۔ لیکن خضر خاں جا چکا تھا!

سلسلۂ جنبانی

شہزادہ خضر خاں نے شہنشاہ علاء الدین خلجی سے کرنے کو وعدہ تو کر لیا، کہ اب وہ دیول دیوی سے ملنے کی کوشش نہیں کرے گا، لیکن دل پر اس پابندی عہد سے جو کچھ گزر رہی تھی۔ اس کا اندازہ کسے تھا؟ چند ہی دن میں حالت یہ ہوئی کہ مہینوں کا بیمار معلوم ہوتا تھا، چہرہ اُتر گیا آنکھوں میں گڑھے پڑ گئے۔ ہنسی تو بڑی چیز ہے مسکرانا تک بھول گیا۔ ہر روز صبح کو حسب معمول باپ کے سلام کو حاضر ہوتا، اور تھوڑی دیر ٹھہر کر واپس چلا جاتا۔ علاء الدین اس کی کیفیت دیکھ رہا تھا، سمجھ رہا تھا، محسوس کر رہا تھا، لیکن خاموش تھا، نہ بازپرس کر سکتا تھا نہ تسلّی اور دلدہی کے کلمات مُنہ سے نکال سکتا تھا!

اُدھر دیول دیوی اس اچانک اور غیر متوقّع انقلاب سے بہت پریشان تھی، وہ حیران تھی کہ یہ یک بیک کیا ہو گیا؟ دل یقین کرنے پر آمادہ نہیں تھا کہ خضر خاں دغا دے سکتا ہے، بے وفائی کر سکتا ہے، عہدِ وفا فراموش کر سکتا ہے۔ لیکن حقائق بڑے سنگین ہوتے ہیں، انہیں تسلیم کیا جائے، یا اُن کی طرف سے آنکھیں بند کر لی جائیں، بہر حال وہ اپنا وجود ثابت کر کے رہتے ہیں۔ اسے بھی چُپ سی لگ گئی تھی۔ رادھا گھنٹوں اور پہروں اس کے پاس بیٹھی دل بہلانے کی کوشش کرتی

رہتی تھی۔ سنجوگتا کو جتنے لطیفے یاد تھے، جتنی کہانیاں یاد تھیں، جتنے گیت یاد تھے، سب ختم ہو گئے لیکن دیول دیوی کے دل کی کلی نہ کھلی، اس کے لب تبسم سے آشنا نہ ہوئے۔ اس کی افسردگی اور اضمحلال میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اس کی آنکھ سے اس عرصہ میں ایک آنسو بھی کسی نے گرتے نہیں دیکھا، دیکھنے والا محسوس کر سکتا تھا۔ اس عرصہ میں وہ صرف روتی ہی رہی ہے۔ اس کی خوش طبعی اور زندہ دلی ختم ہو چکی تھی۔ اس کی حاضر جوابی اور شوخی جواب دے چکی تھی۔ وہ تھی اور عالمِ خیال، وہ تھی اور عالمِ تصوّر وہ تھی اور خاموشی، تنہائی اور سکوت!

ایک روز دیول دیوی اسی عالم میں پریشان اور مضطرب بیٹھی تھی کہ رانی کنول دیوی آگئی۔ بیٹی ماں کو آتا دیکھ کر استقبال کے لئے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ماں نے شفقت سے سر پر ہاتھ رکھا اور بیٹھتے ہوئے کہا:

"بیٹی! کئی دن سے تجھے پریشان اور مضطرب دیکھ رہی ہوں۔ اسی لئے کچھ ضروری باتیں کرنا تھیں انہیں بھی ٹال گئی، حالانکہ شہنشاہ روز دریافت کرتے ہیں!"

شہنشاہ کا حال سُن کر دیول دیوی کے کان کھڑے ہوئے۔ اس نے کہا:۔

"ماں جی! طبیعت تو ٹھیک ہے، کوئی بیماری نہیں آزار نہیں، اچھی بھلی ہوں، لیکن جانے کیوں طبیعت گری گری سی بجھی بجھی سی رہتی ہے آج کل —— ہاں شہنشاہ میرے بارے میں دریافت کر رہے تھے کچھ؟"

رانی کنول دیوی۔ "ہاں بیٹی! تیرے ہی بارے میں کچھ بات چلا رہے ہیں وہ، کیا کوئی باپ اپنی چہیتی بیٹی کا اتنا خیال رکھے گا، جتنا وہ تیرا رکھتے ہیں، بالکل اپنی بیٹی کی طرح چاہتے ہیں تجھے،"

دیول دیوی کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس کا رنگِ رُخ بدل گیا۔ ناقابلِ بیان کیفیت طاری ہو گئی اس پر۔ وہ سوچنے لگی۔ شہنشاہ میرے بارے میں کیوں فکر مند ہیں؟ کیا سوچ رہے ہیں؟ کیا دریافت کرنا چاہتے ہیں؟ کہیں ہمارے پریم اور محبت کی سُن گن تو نہیں مل گئی انہیں؟ کہیں

اُنہوں نے ہمارا راز تو نہیں پالیا؟ کیا وہ ہمارے چاؤ اور محبت سے تو واقف نہیں ہو گئے؟ ان سب سوالات کے ہجوم میں اس نے اپنی طبیعت کی یکسوئی کھو دی۔ اس نے کہا:۔

"ماتا جی! یہ تو میں مانتی ہوں شہنشاہ مجھے بہت چاہتے ہیں، واقعی بیٹی کی طرح لحاظ کرتے ہیں جب محل میں آتے ہیں اس طرف ضرور تشریف لاتے ہیں، اچھی اچھی باتیں ضرور کرتے ہیں، مجھے ہنسانے کی کوشش کرتے ہیں۔ شہنشاہ کی شفقت اور محبت دیکھ کر وہ غم بھول گئی جو باپ کی طرف سے پہنچا! ——— لیکن آخر وہ چاہتے کیا ہیں؟ کیا سوچ رہے ہیں میرے بارے میں؟"

کنول دیوی:۔ "تیرے مستقبل کے بارے میں، تیری زندگی کے بارے میں۔ ——— ایک باپ بیٹی کے بارے میں یہی باتیں تو سوچتا ہے!"

دیول دیوی نے شرما کر سر جھکا لیا، کچھ نہ بولی۔

کنول دیوی:۔ "بیٹی وہ آیا ہے آج کل رام دیو کا سفیر، تو نے سنا ہوگا؟"

دیول دیوی:۔ "ہاں ماتا جی سُنا ہے، ——— کیوں آیا ہے؟ کیا پھر اس سے اور شہنشاہ سے ٹھن گئی؟"

کنول دیوی:۔ "وہ اتنا بے وقوف نہیں ہے، کہ شہنشاہ سے بگاڑے، زیرک اور ہوشیار ہے، شہنشاہ کا دل سے اطاعت گزار ہے، اور شہنشاہ بھی اس کا بہت خیال کرتے ہیں!"

دیول دیوی:۔ "اُونہہ ہوگا، ہمیں کیا ———!"

کنول دیوی:۔ "بیٹی! تیرے ہی لئے تو آیا ہے!"

دیول دیوی:۔ "میرے لئے؟ ——— کیوں ماتا جی؟"

کنول دیوی:۔ "ہاں بیٹی وہ اپنے راجکمار کا تجھ سے بیاہ کرنا چاہتا ہے!"

یہ سُن کر دیول دیوی سن سے ہو گئی، پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ بڑی مشکل سے اپنے

آپ کو سنبھالا، اور گویا ہوئی :۔

دیول دیوی :"پھر شہنشاہ نے کیا جواب دیا؟"

کنول دیوی :۔" وہ کیا جواب دیتے، اُنہوں نے مجھ سے صلاح لی!"

دیول دیوی :۔" پھر آپ نے کیا کہا؟"

کنول دیوی :" میں نے کہا دیول سے پوچھ کر بتاؤں گی ۔ اس کی مرضی بنا میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ سفیر روز جواب کی اُمید کرتا ہے اور شہنشاہ کو تیری افسردگی کے باعث میں کوئی جواب نہ دے سکی ۔ وہ بھی کہتے ہوں گے ذرا سے کام میں اتنی دیر لگا دی، ——— ! میرے خیال میں تو تجویز بڑی معقول ہے شہنشاہ کا بھی یہی خیال ہے، صرف تیری ہاں کا انتظار ہے!"

دیول دیوی نے کوئی جواب نہ دیا، خاموش ہوگئی ۔ ماں نے سر اُٹھا کر دیکھا، تو اس کی کٹورا سی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے ۔ ماں سے آنکھیں چار ہوئیں، تو وہ موتی کی طرح برسنے لگے

کنول دیوی اس کی یہ حالت دیکھ کر بے قرار ہوگئی ۔ اس نے اسے کھینچ کر گلے سے لگا لیا، اور سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا :۔

کنول دیوی :۔" کیا ہوا میری بچی، تو رو کیوں رہی ہے؛ میں نے کوئی ایسی بات کہہ دی ہے جو تجھے ناگوار گزری؟"

دیول دیوی نے ماں کی گود میں سر رکھ کر سسکیاں لے لے کر رونا شروع کر دیا۔ کنول دیوی نے محبت بھرے لہجہ میں کہا :۔

"میری بچی! آخر تو رو کیوں رہی ہے؛ کیا تجھے یہ رشتہ منظور نہیں؟"

دیول دیوی :۔" ماتا جی! اگر میں آپ پر ایک بوجھ ہوں، تو میرا گلا گھونٹ دو، مار ڈالو مجھے شہنشاہ کو اگر میرا یہاں رہنا ناگوار ہے تو میں چلی جاؤں گی یہاں سے لیکن وہ بات نہیں ہو سکتی جس

کی آپ نے اور شہنشاہ نے سازش کی ہے!"

سازش کے لفظوں پر کنول دیوی کو ہنسی آ گئی۔ اس نے دیول دیوی کے گال پر ایک ہلکی سی چپت لگائی اور کہا:۔

"کچھ پاگل ہوئی ہے۔ بھلا ہم اور شہنشاہ تیرے خلاف سازش کریں گے؟ لیکن بیٹی آخر شادی ہونی ہے!"

دیول دیوی:۔ "نہیں! میں نہیں کروں گی شادی۔ میں جس حالت میں ہوں خوش ہوں!"

اس ضد پر کنول دیوی کو غصہ آ گیا۔ اس نے ذرا تلخ لہجہ میں کہا:۔

کنول دیوی:۔ "تو ہمیشہ سے اسی طرح کی باتیں کرتی آئی ہے، کبھی کسی راجکمار کو تو نے پسند نہیں کیا، سب میں کیڑے نکالے۔ ایک جوان لڑکی عمر بھر ماں کے گھر میں نہیں رہ سکتی۔ اس طفلانہ ضد سے کام نہیں چلے گا، تجھے شادی کرنا پڑے گی۔ نہ میں تیری دشمن ہوں، نہ شہنشاہ کی!"

دیول دیوی کے سر پر یہ الفاظ ہتھوڑا بن کر لگے، وہ ماں کی بات جھیل نہ سکی۔ اسے جواب نہ دے سکی، لیکن تیورا کر گری اور بیہوش ہو گئی، رادھا اور سنجوگتا الگ کونے میں کھڑی ماں بیٹی کی باتیں سُن رہی تھیں، دونوں لپکیں اور جلدی سے دیول دیوی کو اُٹھا کر بستر پر لٹا دیا۔ گلاب چھڑکا جانے لگا، لخلخہ سنگھایا جانے لگا، کنول دیوی بیٹی کی یہ حالت دیکھ کر ضبط نہ کر سکی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا:۔

"ہائے کیا ہو گیا میری بچی کو؟"

رادھا جلی ہوئی تو تھی ہی۔ اس نے کہا:۔

"وہی جو آپ دیکھ رہی ہیں، بھلا راجکماری ایسی باتوں کی متحمل ہو سکتی ہیں، جب کہ ان کا دل بھی دُکھا ہوا ہے؟"

یہ سُن کر کنول دیوی چونکی، اس نے کہا:۔

"دِل دُکھا ہُوا ہے؛ کیا بات ہوئی؛ مجھے تو کچھ معلوم نہیں، ——— لیکن پہلے میری بچی کو ہوش میں تو لاؤ کسی طرح؛"

فوراً ہی آدمی دوڑے، اور دم کے دم میں کئی حکیم اور وید حاضر ہو گئے۔ تھوڑی دیر کی تگ و دو کے بعد راجکماری کو ہوش آگیا اس نے آنکھیں کھول دیں۔ لیکن اتنی ہی دیر میں کمزور ہو گئی جیسے مہینوں کی بیمار، کنول دیوی نے پیشانی کو بوسہ دیتے ہوئے کہا:۔

"میری بچی! اب طبیعت کیسی ہے؛"

دیول دیوی نے کمزور آواز میں جواب دیا:۔

"اچھی ہوں!"

کنول دیول ہاتھ باندھ کر اس کے سامنے کھڑی ہو گئی اور کہنے لگی:۔

"تجھ سے معافی مانگتی ہوں، مجھے معاف کردے۔ اب تیری مرضی کے خلاف کوئی بات نہیں کروں گی۔ جب تک تُو معاف نہیں کردے گی مسکرانے گی نہیں، ہنسے گی نہیں، اس وقت تک میں یُونہی ہاتھ باندھ کر کھڑی رہوں گی تیرے سامنے!"

دیول دیوی نے افسردہ تبسم کے ساتھ ہاتھ پکڑ کر ماں کو پاس بٹھا لیا۔ پھر اس کے زانو پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ ماں وفورِ محبت سے بے تاب ہو ہو کر اس کے ماتھے اور سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ آنسو اب تک آنکھوں میں ڈبڈبا رہے تھے!

ایک ہولناک رات

عَلاءُ الدِّین خلجی کی تاجوری اور جہانداری کا آفتابِ عالمتاب نصف النہار پر تھا۔ اس کے رعب و دہشت کی ہر چہار طرف کارفرمائی تھی۔ ہندوستان کے بڑے بڑے رجواڑے اس کے آگے سربسجود ہو چکے تھے۔ بڑے بڑے راجپوت سورما اس کی شہنشاہیت کے سامنے سرِ تسلیم خم کر چکے تھے۔ بڑی بڑی مملکتیں اس کی اطاعت کا حلقہ اپنے گلے میں فخر کے ساتھ ڈال چکی تھیں۔ بڑے بڑے سرکش اور باغی اس کی غلامی پر قانع ہو چکے تھے۔ جن خاندانوں نے رعایا کا خون چوس کر دولتِ بیکراں جمع کی تھی، اور جن کے خزانے سونے ہیرے اور جواہرات سے بھرپور تھے، اور جنہیں اس بات پر ناز تھا کہ انہوں نے کسی کی بالادستی کبھی تسلیم نہیں کی۔ ان کے خزانۂ عامرہ سے تاریخ مقررہ پر ٹھیک وقت پر ایک لمحہ کی تاخیر کے بغیر خراج کی رقمیں پابندی کے ساتھ نکلتی تھیں، اور بغیر کسی یاددہانی کے علاء الدین کے خزانۂ شاہی میں داخل ہو جاتی تھیں۔ وہ داخلی اور خارجی خطرے سے آزاد تھا۔ اس وسیع و عریض مملکت میں کوئی نہیں تھا جو اس کی بالادستی کو چیلنج کر سکتا، جو اس کی شہنشاہیت سے ٹکر لے سکتا، جو اس کی قوت اور طاقت کا حریف بن سکتا۔ وہ دوستوں، ہوا خواہوں اور وفاداروں کے لئے دریائے کرم تھا۔ دشمنوں، بدخواہوں اور غداروں کے لئے قضائے مبرم

جس طرح اس کے مہر و کرم کی کوئی انتہا نہ تھی، اسی طرح اس کے قصاص اور انتقام کی بھی کوئی حد نہ تھی۔ وہ لوگ مطمئن تھے جن کا دامن چاک تھا اور جن کے دامن گرد آلود تھے۔ وہ نہ گھر میں محفوظ تھے، نہ تہ خانے میں۔

شروع شروع میں جب وہ برسرِ اقتدار ہوا ہے، تو لوگوں نے یہ سمجھا تھا یہ بھی ایک کشورکش اور فاتح ہے۔ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ تختِ حکومت پر قبضہ کرے اور عیش و عشرت کی زندگی بسر کرے۔ کوئی شبہ نہیں۔ شروع میں اس کے لچھن تھے بھی ایسے ہی، لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے، دریا بہتے بہتے اپنا رُخ بدل لیتا ہے، اس کی منزل بدل جاتی ہے، اس کا راستہ تبدیل ہو جاتا ہے۔ بالکل یہی کیفیت علاء الدین کی ہوئی۔ وہ جس راستہ پر چل رہا تھا، وہ بھی بڑائی اور شہرت کا، کامیابی اور کامرانی، نمود اور عروج کا راستہ تھا۔ اگر وہ صرف اسی راستہ پر چلتا رہتا تو بھی اس کی عظمت مسلّم رہتی۔ لیکن بہت جلد اس نے بہتے ہوئے دریا کی طرح اپنا رُخ بدل دیا اور اس کا راستہ تبدیل ہو گیا۔ وہ بہت بڑا لٹیرا بن سکتا تھا، بہت بڑا قزاق بن سکتا تھا، بہت بڑا بادشاہ بن سکتا تھا، بہت بڑا فاتح اور سپہ سالار بن سکتا تھا، لیکن اس کی منزل بدلی، اور اس نے اپنا راستہ تبدیل کیا، اور وہ ایک بلعظمت شہنشاہ بن گیا، جس کی عزت ہندو بھی کرتے تھے اور مسلمان بھی، اس لئے کہ اس نے سب کو زندگی کا شکوہ عطا کیا تھا۔ اس نے سب کو لطف و کرم اور مہر و نوازش سے سرفراز کیا تھا، اس کے دریائے عدل و احسان سے سب سیراب ہوتے تھے، جب سے اس نے ایک صوفی صافی اور درویش حق آگاہ سلطان المشائخ کا دامن پکڑا تھا۔ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے بجائے خدا کے بندوں کا چاکر بن گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں تلوار اس لئے نہیں تھی کہ ہر ایک کا گلا کاٹ ڈالے، اس لئے تھی کہ ظالم کو زندہ نہ رہنے دے۔ اس کے ہاتھ میں کوڑا اس لئے نہیں تھا کہ جو سامنے آئے، اس کی پیٹھ لہولہان کر دے، اس لئے تھا کہ جو حدود سے تجاوز کرے سزا پائے۔ اس کے قبضہ میں اقتدار و اختیار کی باگ اس لئے

نہیں تھی کہ ہر قوت کو کچل دے یا پامال کر دے، اِس لئے اور صرف اِس لئے تھی کہ جو اقتدار و اختیار کا غلط استعمال کرے، اس سے اقتدار و اختیار چھین لیا جائے!

اس نے سرمایہ داروں کا زور ختم کر دیا تھا، اس نے زمینداروں اور جاگیرداروں کی طاقت چھین لی تھی، اس نے نفع پرستوں، ذخیرہ اندوزوں اور ضروریاتِ زندگی کا ذخیرہ کرنے والوں کو مفلوج اور معطل کر دیا تھا۔ اس نے رشوت کھانے والے حکام کا قلع قمع کر دیا تھا۔ اس نے ان تمام لوگوں کے دانت توڑ ڈالے تھے جو سانپ کی طرح زہریلے تھے۔ اب بھی وہ زندہ تھے لیکن ضرر رسانی کی اہلیت اور سکت سے محروم ہو چکے تھے۔

اناج بے حد سستا مل رہا تھا۔ اچھے سے اچھا کپڑا کوڑیوں کے بھاؤ بک رہا تھا۔ خالص گھی اور شکر کے دام حیرت انگیز طور پر بہت کم تھے۔ ضروریاتِ زندگی کی تمام چیزیں ایسی نہیں کہ ان کی قیمت معیّن ہو، کمال یہ تھا کہ متعینہ قیمت پر بغیر کسی دشواری کے ہر وقت بڑی آسانی سے دستیاب ہو جاتی تھیں کسی کے حق پر ڈاکہ نہیں پڑ سکتا تھا، کسی کی عزت اور آبرو کو خطرہ نہیں تھا، کسی کے امن و عافیت میں خلل انداز ہونے کی جرأت کرنے والا ناپید تھا، ——— یہی وجہ تھی، کہ خلقت علاء الدین کو دعائیں دے رہی تھی، اس کی درازیٔ عمر و اقبال کی دل و جان سے تمنائی تھی۔ علاء الدین یہ رنگِ محفل دیکھتا تھا اور دل ہی دل میں خوش ہوتا تھا۔

شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم!

اس نے وہ کارنامہ انجام دیا تھا جو اب تک اس دیس میں کوئی انجام نہ دے سکا تھا!

اور اس کارنامہ کے علاوہ اس کا دوسرا بہت بڑا ناقابلِ فراموش اور تاریخی کارنامہ یہ تھا کہ اس نے اس بکھرے ہوئے ملک کی شیرازہ بندی کر دی تھی۔ پہلی مرتبہ اسے ایک مرکزی طاقت کا تابع بنا دیا تھا۔ یہ بات بھی اس شان، اس جمال اور کمال کے ساتھ علاء الدین سے پہلے اس ملک

میں کبھی رونما نہیں ہوئی تھی۔

فارغ البالی، آسائش، عافیت اور امن وامان کی فراوانی نے ملک کے لوگوں کو عام طور پر اور دلی کے لوگوں کو خاص طور پر اب سست اور آرام پسند کر دیا تھا۔ وہ اب راگ ورنگ میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ سیر وشکار اور تفریح ان کا بہترین اور محبوب مشغلہ بن گیا تھا۔ ہر اندیشہ سے، ہر خدشہ سے، ہر خطرہ سے وہ یکسر بے نیاز بن چکے تھے، آسودگی تھی، عافیت تھی، آسائش تھی، لطف وتنعم کی زندگی تھی اور وہ تھے!

ایک روز وہ اپنے دربارِ خاص میں ندیموں، مصاحبوں، وزیروں اور معتمد افسروں کے جھرمٹ میں اس طرح بیٹھا تھا جیسے ستاروں کی محفل میں چاند، چہرے پر بشاشت چھائی ہوئی تھی آنکھوں میں مسرت کی چمک نظر آرہی تھی، مسکراتے ہوئے اپنے معتمد اور محبوب کوتوال عین الملک کی طرف دیکھا اور کہا:۔

"ہم دیکھتے ہیں کہ اب ہماری مملکت کا انتظام بہت درست ہو گیا ہے۔ ہمارے حدود مملکت میں بھی کافی توسیع ہو گئی ہے، دکن کا دُور دراز اور دور دست اور وسیع علاقہ اب ہلالی پرچم کے زیر سایۂ اطاعت اور امن کی زندگی بسر کر رہا ہے، ہر طرف شادمانی ہے، نشاطِ خاطر ہے، اطمینان و آسائش ہے، کہیں سے نوحہ وماتم کی صدا بلند نہیں ہوتی، شکوہ وشکایت کا دفتر نہیں کھلتا!"

عین الملک:۔ "جہاں پناہ کے رعب ودہشت کا یہ عالم ہے کہ قحط کے سخت ترین زمانہ میں بھی ارزاں ترین نرخ پر غلّہ بڑی آسانی سے دستیاب ہوتا رہا!"

علاء الدین خلجی:۔ "ہم اس بات سے بھی مسرور ومطمئن ہیں کہ قتل وغارت، فتنہ وفساد، سازش اور بغاوت، چوری اور ڈکیتی کا بھی یکسر قلع قمع ہو گیا ہے۔ مسافروں کے قافلے اطمینان سے آتے جاتے ہیں اور کسی حادثے سے دوچار نہیں ہوتے!"

عین الملک :۔ "یہ جہاں پناہ کی سطوت اور دبدبہ کا نتیجہ ہے!"

علاء الدین خلجی :۔ لیکن ایک بات ہے جو تیر کی طرح ہمارے دل میں کھٹکتی رہتی ہے!"

عین الملک :۔ "وہ کون سی بات ہے جہاں پناہ؟"

علاء الدین خلجی :۔ (ٹھنڈی سانس بھرکر) "ہم دیکھتے ہیں لوگوں کے اخلاق پست ہوتے جارہے ہیں آوارگی اور عیاشی جڑ پکڑتی جارہی ہے۔ ان میں راگ رنگ، رقص و نغمے، جوئے اور سٹے کا میلان بھی رفتہ رفتہ بڑھ رہا ہے، —— یہ چیزیں دیمک کی طرح ہماری مملکت کو چاٹ لیں گی — یہ شاندار اور فلک بوس قصرِ حکومت ایک روز بے سان و گمان زمین پر آرہے گا!"

عین الملک :۔ "جہاں پناہ!"

علاء الدین خلجی :۔ "ہمیں بتاؤ یہ برائیاں کس طرح دُور ہوسکتی ہیں؟ —— مولانا آپ ہی کچھ فرمایئے؟"

مولانا مغیث الدین :۔ "بہت آسانی سے قابو پایا جاسکتا ہے ان برائیوں پر!"

علاء الدین خلجی :۔ "تو ارشاد فرمایئے! ہم چاہتے ہیں، یہ برائیاں دُور ہوجائیں!"

مولانا مغیث الدین :۔ "چونکہ اصلاحِ اخلاق کی کوشش حکومت کی طرف سے نہیں ہوتی، اس لئے فضائل کے بجائے رذائل پر لوگ مائل ہوجاتے ہیں۔ اصلاحی کوششیں اگر شروع کردی جائیں تو فوراً یہ برائیاں ختم ہوجائیں گی!"

علاء الدین خلجی :۔ "آپ نے بجا فرمایا۔ واقعی یہ کام ہونا چاہئے!"

یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ ایک جاسوس افتاں وخیزاں دربارِ شاہی میں حاضر ہوا۔ جاسوسوں کو حاضر ہونے کی ہر وقت اجازت تھی، علاؤالدین نے اس پر ایک نظر ڈالی تو اسے کافی پریشان اور حواس باختہ پایا۔ اس نے وقار کے ساتھ پوچھا۔

"کون سی خبر لے کر آئے ہو تم ؟"

وہ حاضرین کو دیکھ کر کچھ کہتا ہوا جھجکا ۔ شاید وہ تخلیہ میں گفتگو کرنا چاہتا تھا ۔ لیکن علاءالدین نے اس احتیاط کو کچھ زیادہ اہمیت نہ دی ۔ اس نے کہا :۔

"یہاں جتنے لوگ ہیں ، یہ سب ہمارے ہمراز ، دمساز اور جاں نثار ہیں ۔ ان سے احتیاط کے کوئی معنیٰ نہیں ، جو خبر لائے ہو بے تأمل بیان کرو !"

جاسوس :۔ "جہاں پناہ مغلوں (تاتاریوں) کی فوج ایک سیلِ رواں کی طرح بڑھتی چلی آرہی ہے !"

علاءالدین خلجی :۔ (درشتی کے ساتھ) "آنے دو ، اس طوفان کا منہ ہم پہلے بھی کئی دفعہ موڑ چکے ہیں !"

جاسوس :۔ "لیکن اس دفعہ ان کا لشکر حدِ شمار سے خارج ہے جہاں پناہ !"

علاءالدین خلجی :۔ "علاءالدین کو خدا کی ذات پر بھروسہ ہے ۔ اپنی شمشیر خارا شگاف پر ناز ہے ، اپنے دست و بازو پر اعتماد ہے ، اپنے وفادار اور جاں نثار سپاہیوں اور افسروں پر فخر ہے ۔ اسے کسی بڑے سے بڑے لشکر کی پروا نہیں ۔ آنے دو ، جو اس سے ٹکرّے گا تباہ ہوگا !"

جاسوس :۔ "جہاں پناہ ! ــــــ جہاں پناہ !!"

علاءالدین :۔ "ہاں کہو ــــــ کہو ہم سن رہے ہیں !"

جاسوس :۔ "اس مرتبہ ماوراءالنہر کا فرماں روا قتلغ خواجہ دل بادل لشکر لے کر بڑھا ہے ۔ تین لاکھ[1] سے زیادہ آزمودہ کار اور تجربہ کار سپاہی اس کے ساتھ ہیں ۔ وہ یہ فیصلہ کر کے آرہا ہے کہ دلّی فتح کئے بغیر واپس نہ جائے گا !"

علاءالدین خلجی :۔ "وہ اگر جانا بھی چاہے تو نہیں جا سکتا ۔ آنا اس کے اختیار میں تھا ، جانا اس

---

[1] یوں تو بعض تاریخوں میں تین لاکھ سے بھی زیادہ سپاہ لکھی ہے ۔ لیکن اس پر تقریباً سب کا اتفاق ہے کہ تاتاری سپاہ کی تعداد دو لاکھ سے بہت زیادہ نہیں !

کے بس سے باہر ہے، وہ یہاں مرنے کے لئے آیا ہے، واپس جانے کے لئے نہیں۔ ہم اس کا پرتپاک استقبال کریں گے۔ اس کی خاطر مدارات کریں گے، ہاں تم نے کیا کہا، قتلغ خواجہ کے ساتھ کتنے آدمی ہیں؟"

جاسوس: "تین لاکھ سے زیادہ جہاں پناہ!"

علاءالدین خلجی: "بہت کم ہیں، کاش زیادہ ہوتے، تاکہ انہیں شکست دینے میں، قتل کرنے میں کچھ لطف تو آتا ——— ہاں یہ تو بتاؤ مغلوں کا لشکر اب کتنی دور رہ گیا ہے؟"

جاسوس: "ہر لمحہ دلّی سے قریب تر ہوتا جاتا ہے جہاں پناہ!"

علاءالدین خلجی: "ہم بے تابی سے اُس کے منتظر ہیں!"

علاءالدین نے حاضرینِ مجلس کی موجودگی میں تاتاریوں کی آمد کا حال سُن کر جو باتیں کی تھیں وہ اگرچہ اس کے عزم و استقامت کا ثبوت تھیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ فوری طور پر اتنے بڑے اور خونخوار لشکر کا مقابلہ کرنے کی تاب نہیں رکھتا تھا۔ اندرونی امن و امان اور ہندوستانی رجواڑوں کی اطاعت نے اس کی توجہ عسکری اور فوجی امور پر کم کر دی تھی۔ شہر والے بھی عیش و اطمینان کی زندگی بے غل و غش بسر کر رہے تھے، اور اس کا وہم و گمان بھی نہ کر سکتے تھے کہ یوں مصیبت میں پھنس جائیں گے۔ علاءالدین اور تاتاریوں کے لشکر کا تناسب ایک اور چار کا تھا۔ جاسوس کے سامنے علاءالدین نے ہمت افزا باتیں کر لیں، لیکن اس کے جانے کے بعد جب حالات کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا علائی فوج اور تاتاری فوج میں تعداد کے لحاظ سے کوئی مناسبت ہی نہیں ہے۔ اتنی بڑی اور خونخوار اور درندہ صفت فوج پر غالب آجانا قطعی ناممکن ہے۔ جبکہ حالت یہ ہے کہ تاتاریوں کے پاس بے حد و حساب لشکر کے علاوہ ساز و سامانِ جنگ کی افراط بھی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ قتلغ خواجہ یہ فیصلہ کرکے اپنی راجدھانی سے چلا تھا کہ نہ صرف دلی پر قبضہ کرے گا بلکہ سارے ہندوستان کو زیرنگیں کرے گا۔ کرن سنگھ نے مہادیو پرشاد کو اپنا سفیر بنا کر قتلغ خواجہ کے پاس بھیجا تھا اور اسے یقین دلا دیا تھا کہ بھارت کے سارے ہندو راجا اس کا ساتھ دیں گے۔ شرط صرف یہ ہے کہ وہ علاءالدین کا خاتمہ کردے۔ ان راجاؤں پر علاءالدین کی اتنی دہشت بیٹھی ہوئی ہے کہ وہ اس کی زندگی میں علانیہ اس کے خلاف کوئی اقدام نہیں کرسکتے لیکن جہاں انہیں یہ معلوم ہوا کہ علاءالدین ہار گیا یا مار ڈالا گیا، یہ بڑی خوش دلی کے ساتھ قتلغ خواجہ کی اطاعت کا دم بھرنے لگیں گے، اس طرح اسے ایک بہت بڑا ملک مفت میں مل جائے گا!"

قتلغ خواجہ بڑا ہوشیار، زمانہ شناس اور جہاندیدہ آدمی تھا۔ اس کا نظام جاسوسی بھی بے حد کامیاب تھا۔ ماوراءالنہر میں بیٹھ کر دلی اور ہندوستان کے ہر بڑے شہر اور بڑی ریاست کا رتی رتی حال دم بدم اُسے معلوم ہوتا رہتا تھا۔ علاءالدین کی فوجی طاقت کے اتنا چوکنا تھا، کہ اس نے مصدقہ اطلاعات کے باوجود ہمیشہ اس کی طاقت کا اندازہ زیادہ سے زیادہ کیا، اور اسی تناسب سے اپنی فوجی تیاریوں کو مکمل کیا، اور جب یہ تیاریاں مکمل ہوگئیں، تو وہ سیلِ بلاخیز کی طرح دلی کی طرف بڑھا اور آتے ہی محاصرہ کرلیا، جب محاصرہ کرلیا، تو یہ بات اور زیادہ وضاحت کے ساتھ علاءالدین پر منکشف ہوگئی کہ مقابلہ ایسے زبردست اور طاقتور حریف سے ہے جس سے عہدہ برآ ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ صورتِ حال کی اس نزاکت نے اسے پریشان کردیا لیکن اس نے اپنی پریشانی ظاہر نہیں ہونے دی۔ عین الملک اور بعض دوسرے معتمدین کو بلا کر رائے لی، کہ اس صورت میں کیا کیا جائے؛ عین الملک کی سربراہی میں سب نے بالاتفاق یہ مشورہ دیا کہ جب ہمارے اندر دشمن سے عہدہ برآ ہونے کی طاقت نہیں تو پھر تقاضائے تدبّر اور دانش یہ ہے کہ خلقِ خدا کا خون یونہی ضائع نہ کرایا جائے جب شکست پہلے بھی ہے اور آخر میں بھی، تو مناسب یہی ہے کہ اسے پہلے ہی مان لیں، تاکہ بعد میں

مزید تباہ کاریوں اور بربادیوں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ یہ سن کر علاء الدین نے متانت کے ساتھ پوچھا:۔

"تو پھر کیا کیا جائے؟"

ان سب نے کہا:۔

"قتلغ خواجہ کی جھولی میں اپنی جان بچانے کے لئے وہ سب کچھ ڈال دیا جائے جو وہ مانگے[1]!"

اس جواب نے علاء الدین کے سمندِ عزم پر مہمیز کا کام کیا۔ اس نے اپنی برہمی چھپائی، اور اپنے تمام معتمد فوجی امیروں اور سرداروں کو بغرض مشورہ طلب کیا، اس نے حاضرین کے چہروں سے ان کے دل کا جائزہ لیا، اور کہا:۔

علاء الدین خلجی:۔ "مغلوں کا لشکر آگیا، دلی تک پہنچ گیا!"

ایک نے جواب دیا:۔

"معلوم ہے جہاں پناہ!"

علاء الدین خلجی:۔ "اس نے دلی کا تین طرف سے محاصرہ بھی کرلیا ہے۔ اس کی تعداد واقعی حد شمار سے خارج ہے!"

ایک دوسرے سردار نے جواب دیا:۔

"یہ بات بھی ہم جاں نثاروں کو معلوم ہے جہاں پناہ!"

علاء الدین خلجی:۔ "شاید تمہیں یہ نہیں معلوم کہ ہمارا لشکر اس کے مقابلہ میں بہت کم ہے یعنی ایک اور چار کی نسبت ہے!"

ایک تیسرے سردار نے کہا:۔

"جہاں پناہ! ہماری نگاہ اس چیز کو بھی محسوس کر چکی ہے!"

علاء الدین خلجی:۔ "بڑی اچھی بات ہے کہ تمام باتیں آپ کو معلوم ہیں، اب پوچھنا یہ ہے کہ اس

[1] تاریخ ہند (ہاشمی)

صورت میں کیا کیا جائے ؟ ــــــــ ہتھیار ڈال دیئے جائیں یا جنگ کا آغاز کیا جائے ؟"
کچھ دیر تک مجلس پر سناٹا سا چھایا رہا، جب کسی نے گفت گو کا آغاز نہ کیا تو علاء الدین نے تمام حاضر الوقت سرداروں سے نام بنام دریافت کرنا شروع کیا :۔
"ظفر خاں تم کیا کہتے ہو ؟"
ظفر خاں :۔ "وہی جو آقا کا حکم ہو، ــــــ
مجھے تو خوشی ہے کہ جو کچھ کہو بجا کہئے !"
علاء الدین خلجی :۔ "الغ خاں ــــــ ہم تمہاری رائے بھی معلوم کرنا چاہتے ہیں ؟"
الغ خاں :۔ "اگر جہاں پناہ کا حکم ہو تو یہ تنہا غلام تاتاریوں کے سارے لشکر سے بھڑ جانے کا حوصلہ رکھتا ہے !"
علاء الدین خلجی :۔ "رکن خاں تم کیوں نہیں کہتے کچھ ؟"
رکن خاں :۔ "غلام صرف ایک بات جانتا ہے۔ جب جنگ شروع ہو گی، تو سب سے پہلے جو شخص دشمن سے مقابلہ کرنے نکلے گا، وہ رکن خاں ہو گا، اسے زندگی اتنی پیاری نہیں جتنی موت !"
علاء الدین خلجی :۔ "اور غازی ملک تمہارا ارادہ کیا ہے ؟"
غازی ملک :۔ "میری زندگی کی سب سے بڑی تمنا یہ ہے کہ آقا پر تصدق ہو جاؤں، یہ زندگی بیکار ہے، اگر اپنے تاجدار اور شہریار کے کام نہ آئے !"
اِن باتوں سے علاء الدین مطمئن ہو گیا۔ جوشِ مسرت سے اُس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ عین الملک کی باتوں سے جتنا تکدّر پیدا ہوا تھا، وہ سب رفع ہو گیا۔ اُس نے بڑے محبت بھرے لہجہ میں کہا :۔
"میرے سردارو !
تم سپاہی ہو، اور سپاہی کا کام صرف لڑنا، خون بہانا اور سینہ پر نیزہ کا وار روکنا ہے، اور

مجھے مسرت ہے کہ تم کھرے، سچے اور مخلص سپاہی ثابت ہوئے۔ مجھے تم پر ناز ہے، فخر ہے، تم ہی میرے دست و بازو ہو، تم ہی میری روحِ رواں ہو، ابھی صرف تھوڑی دیر پہلے کی بات ہے کہ ایک صاحب نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ میں مغلوں کو رشوت دے کر اس بلا کو ٹال دوں[1]۔ مجھے خیال ہوا شاید اس مشورہ کو تمہاری تائید حاصل ہو، الحمدللہ کہ میرا شبہ غلط ثابت ہوا۔ اب میں مطمئن ہوں آپ میں لڑنے کے لئے تیار ہوں۔ لڑتے ہوئے مرجانا، بغیر لڑے ہار جانے سے کہیں زیادہ باعزت و بااصول طریق کا ہے۔ میں اس زندگی سے نفرت کرتا ہوں جو شکست سے حاصل ہو، اور اس موت کا شائق ہوں جو جنگ کے میدان میں حاصل ہو! ——— انشاءاللہ دو ہی تین دن میں ضروری تیاریاں مکمل کر کے ہم اپنے بن بلائے مہمانوں سے ہاتھ ملائیں گے!"

بڑی تیزی سے علاءالدین نے جنگی تیاریاں شروع کر دیں۔ مولانا مغیث الدین اس کے دست راست بنے ہوئے تھے، انہوں نے ایسے پُراثر وعظ کہے، ایسی دلگداز تقریریں کیں، تاریخ اسلام کی سرفروشی، جاں نثاری اور ایثار و قربانی کی ایسی زہرہ گداز داستانیں بیان کیں کہ لوگ تڑپ اٹھے۔ یہ شہری آبادی تھی، اسے جنگ و پیکار سے کوئی تعلق نہیں تھا، اور جو لوگ جنگی رجحان رکھتے تھے وہ پہلے ہی سے فوج میں باقاعدہ داخل تھے۔ لیکن مولانا کے اثرانگیز وعظ و تلقین کا اثر یہ ہوا، کہ لوگوں کا ہراس دور ہو گیا، ان میں خود اعتمادی پیدا ہو گئی۔ دفاعِ ملی کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ اپنی آن اور اپنی شان پر کٹ مرنے کا ایک نیا اور تازہ ولولہ نمودار ہو گیا۔ یا تو تاتاریوں کی آمد کی خبر نے سب کو بدحواس اور پریشان کر دیا تھا، یا اب لوگ اس کے منتظر تھے کہ جنگ ہو تاکہ حق و باطل کا فیصلہ ہو سکے۔ ادھر علاءالدین نے تاتاریوں کے مقابلہ میں اپنی فوج کی عددی کمی یوں پوری کی کہ ان کی حوصلہ افزائی کی۔ انہیں انعام و اکرام سے نوازا، ان کے مناصب میں اضافہ کیا۔ ان کے جوشِ ملی

[1] تاریخ ہند، (سید ہاشمی)

اور جذبۂ دفاع میں ایک نئی تڑپ پیدا کی۔ ان میں مرمٹنے، کٹ مرنے اور مسکراتے ہوئے موت کا خیر مقدم کرنے کی تمنا پیدا کی۔ کوئی شبہ نہیں، علائی فوج یکتا فوج تھی۔ بہادر، دلیر، سرد و گرم چشیدہ لیکن اس کے مقابلہ میں جو فوج تھی وہ بھی یکتا تھی، ہر اعتبار سے یکتا تھی، تعداد اور ساز و سامانِ جنگ کے اعتبار سے اپنی مثال آپ، درندگی اور خونخواری میں بے بدل، وحشت اور بربریت میں لاجواب، اس فوج کی دہشت ساری دُنیا پر چھائی ہوئی تھی۔ اس لئے کہ یہ وہ فوج تھی جس نے ہر حریف کے چھکے چھڑا دیئے تھے۔ اس نے بڑی بے دردی اور قساوت سے شہروں کو مٹا دیا تھا، آبادیوں کو تہ تیغ کر دیا تھا، کھیتوں میں آگ لگا دی تھی، عصمتیں لوٹ لی تھیں۔ لوگ اسے قہرِ خداوندی کا نمونہ سمجھتے تھے، اس سے ڈرتے تھے، اس کا نام سُن کر بید لرزاں کی طرح کانپنے لگتے تھے۔ علاءالدین نے اپنی فوج میں ایسا ولولہ اور جوش پیدا کر دیا، کہ اس کی فوج تقاضا کرنے لگی جنگ جلد از جلد شروع کی جائے!

علاءالدین نے دل ہی دل میں ایک فیصلہ کر لیا تھا، اور اس فیصلہ پر وہ سختی سے قائم تھا۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ ذلّت کی زندگی پر عزّت کی موت کو ترجیح حاصل ہے۔ یہی جذبہ اس نے اپنے سپاہیوں اور افسروں میں بھی پیدا کر دیا تھا، اس نے سوچ لیا تھا اگر ہم جیت نہیں سکتے تو مر تو سکتے ہیں۔ ہماری موت بھی یادگار اور ناقابلِ فراموش ہوگی۔ خود دشمن ہماری موت پر رشک کرے گا، بشرطیکہ وہ سچا اور کھرا بہادر ہو!

دوسری طرف قتلغ خواجہ کا محاصرہ شدید سے شدید تر ہوتا جا رہا تھا۔ وہ بہت بڑی فوج ہمرکاب لایا تھا ——— یہ وہ فوج تھی، جو درجنوں شہروں کو مٹی کا ڈھیر بنا چکی تھی، جو لاکھوں آدمیوں کو موت کے گھاٹ اُتار چکی تھی، جو بڑے بڑے قلعوں کو مسمار کر چکی تھی، جو بڑی بڑی آبادیوں کو تاراج کر چکی تھی۔ وہ اپنی فتح مندی پر، اپنی قوّت و طاقت پر، اپنے کس بل پر، اپنی روایاتِ تخریب و تعزیر پر نازاں تھی، جسے اس پر فخر تھا کہ پہلے اس نے کشتوں کے پشتے لگائے، پھر کٹتے ہوئے سروں کا مینار

بنایا، اور تاریخ میں ایسی مثال قائم کردی جس کی پیروی کسی دوسرے فاتح اور کشورکشا کے لئے ممکن نہیں۔ قتلغ خواجہ ایک طرف محاصرہ تنگ کرتا جارہا تھا، دوسری طرف فوج کے دل میں مالِ غنیمت کی بے اندازہ زر وجواہر کی، خوبصورت عورتوں کی، طرحدار غلاموں کی ایک نئی امید اور آرزو پیدا کررہا تھا۔ اس کا پروگرام بنا ہوا تھا۔ شہنشاہیتِ عظمیٰ کا منصوبہ ایک کھلی ہوئی کتاب کی طرح اس کے سامنے موجود تھا۔ سارا ہندوستان زیرِ نگیں کرنے کا جو خواب اس نے دیکھا تھا اب اس کی تعبیر نکلنے کا وقت آگیا تھا مسلمان اس بسیں میں مٹھی بھر تھے، پردیسی تھے، تقریباً اتنے ہی اجنبی تھے یہاں کے رہنے جتنے خود تاتاری۔ ہندو ریاستیں ان کی شہنشاہیت کا پرچم سرنگوں کرنے کے لئے تیار تھیں، ان کی طرف سے اخلاقی مدد اب مل رہی تھی، اور خلجی کی شکست یا ہلاکت کے بعد تو من و تو کا فرق ہی مٹ جانے والا تھا۔ یہ بات اس نے اپنے ذہن نشین بھی کرلی تھی اور فوج کے دل میں بھی بٹھادی تھی۔ اسے یقین کامل تھا، پکے ہوئے پھل کی طرح بھارت اس کی گود میں گرنے والا ہے!

خلجی کی فوجی تیاریاں مکمل ہوچکی تھیں۔ اس نے اپنے فیصلہ کا اعلان کردیا تھا کہ کل جنگ کا آغاز ہوگا۔ اس فیصلہ سے فوج بہت خوش تھی، بہت مطمئن تھی۔ گویا اسے منہ مانگی مراد مل گئی تھی۔ لیکن خود خلجی پر اضطراب و اضطرار کی کیفیت طاری تھی جیسے جیسے رات ختم ہوتی جاتی تھی، اور سپیدۂ سحر نمودار ہونے کا وقت قریب آتا جاتا تھا، اس کی بے چینی اور بے کلی میں اضافہ ہوتا جاتا تھا اور آج کی رات بھی بڑی بھیانک تھی۔ قتلغ خواجہ کے قلبِ سیاہ کی طرح کالی۔ نہ جانے کیا سوچ کر خلجی اپنے محل کے چور دروازے سے ایک چادر اوڑھ کر باہر نکلا، اور ایک ویران و سنسان راستے پر ہولیا۔ چلتے چلتے وہ ایک چھوٹی سی خانقاہ کے سامنے پہنچا۔ ٹھٹکا، جھجکا، اور پھر سرعت کے ساتھ خانقاہ کے اندر داخل ہوگیا۔ خانقاہ میں ایک مسجد تھی، ایک حجرہ تھا، حجرہ میں ایک چراغ ٹمٹمارہا

تھا۔ دروازہ نیم وا تھا، دروازے پر پہنچ کر علاءالدین کے قدم پھر لڑکھڑائے، لیکن ہمت کرکے وہ اندر چلا گیا یہاں وہ درویش حق آگاہ جسے دُنیا سلطان المشائخؒ کے نام سے پکارتی تھی، اپنے رب سے مناجات میں مصروف تھا۔ سر سجدہ میں جھکا ہوا تھا، روح مقاماتِ معرفت کی سیر کر رہی تھی۔ بڑی دیر تک علاءالدین چور کی طرح چپ چاپ کھڑا رہا۔ سلطان المشائخؒ نے جب سجدہ سے سر اُٹھایا، تو ایک شخص کو دیکھا جو چادر اوڑھے کھڑا تھا اور جس کا چہرہ بھی بڑی حد تک چادر میں چھپا ہوا تھا۔ سلطان المشائخؒ نے جیسے ہی سجدہ سے اُٹھ کر خلجی کی طرف مُنہ پھیرا، وہ بے ساختہ ان کے قدموں پر گر پڑا اور سسکیاں لے لے کر رونے لگا۔ سلطان المشائخؒ نے شفقت سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھا اور فرمایا:۔

"تم کون ہو؟ اتنے نادقت آنے کا سبب کیا ہے؟ روکیوں رہے ہو؟"

علاءالدین خلجی:۔ "مَیں ایک گناہگار ہوں، خاطی ہوں، باغی ہوں، اور آپ کے دامن میں پناہ لینے آیا ہوں!"

سلطان المشائخؒ:۔ "تم ایک فقیر کے پاس پناہ لینے آئے ہو؟ جس کے پاس نہ مال و دولت ہے، نہ فوج و سپاہ؟"

علاءالدین خلجی:۔ "یہ وہ بارگاہ ہے جہاں مال و دولت کی کوئی وقعت نہیں، جہاں فوج و سپاہ کی قوت کام نہیں دے سکتی!"

سلطان المشائخؒ:۔ "آخر تم چاہتے کیا ہو؟"

علاءالدین خلجی:۔ "مَیں اپنے لئے کچھ نہیں چاہتا، اپنی قوم کے لئے، اپنی ملّت کے لئے، مسلمانوں کے لئے دستِ سوال دراز کرکے آیا ہوں!"

سلطان المشائخؒ:۔ "عجیب آدمی ہو! ——— لیکن تمہاری قوم اور ملّت پر کیا اُفتاد پڑی ہے؟"

علاء الدین خلجی :۔ "تاتاریوں کا ٹڈی دل لشکر دلی کا محاصرہ کر چکا ہے۔ محاصرہ روز بروز تنگ ہوتا جا رہا ہے، جنگ آہستہ آہستہ ناگزیر ہوتی جا رہی ہے!"

سلطان المشائخؒ :۔ "ہاں! ــــــ یہ ہمیں معلوم ہے!"

علاء الدین خلجی :۔ "تو پھر کچھ کیجئے۔ صرف آپ ہی کی ذات اس بیڑے کو گرداب کے چکر سے بچا کر ساحلِ مراد تک پہنچا سکتی ہے!"

سلطان المشائخؒ :۔ "تم ضرورت سے زیادہ حسنِ ظن سے کام لے رہے ہو!"

علاء الدین خلجی :۔ "نہیں، ــــــ میں جانتا ہوں، جب انسانی تدبیریں ناکام ہو جاتی ہیں تو صرف خاصانِ خدا ہی ہوتے ہیں جو بگڑی کو بنانے کی صلاحیت رکھتے ہیں!"

سلطان المشائخؒ :۔ "لیکن انسانی تدبیروں کے ناکام ہو جانے کا فیصلہ تم نے کیسے کر لیا؟"

علاء الدین خلجی :۔ "اس لئے کہ تاتاریوں کا لشکر علائی لشکر سے چار گنا زیادہ ہے۔ وہ اتنی بڑی قہرمانی فوج سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا!"

سلطان المشائخؒ :۔ "تو اس کی فکر علاء الدین کو ہونی چاہئے، جسے اس کے بندے جہاں پناہ کہتے ہیں، جس کا خطاب لوگوں کی زبان پر سلطان عالم پناہ ہے، جس کی دھاک دلّی سے لے کر دکن تک بیٹھی ہوئی ہے، جس کی تلوار کا لوہا بڑے بڑے سرکش اور سرافراز مانتے ہیں۔ تم جیسے آدمیوں کو اس جھمیلے میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے؛ تم کہیں جاؤ، دو روٹیاں کھانے کو مل جائیں گی، تن ڈھانکنے کو دو گز کپڑا بھی میسّر آ جائے گا، سر چھپانے کو جھونپڑی بھی ہر جگہ مل جائے گی۔ فکر تو علاء الدین کو ہونی چاہئے جس کی سلطنت، عزّت، تمکنت اور قیصریت خطرہ میں ہے۔ تاتاریوں سے شکست کی صورت میں تمہارا تو کچھ نہ بگڑے گا۔ لیکن علاء الدین کی بادشاہت ختم ہو جائے گی، ــــــ اگر تم نے کھانا نہ کھایا ہو، تو ہم اس کا انتظام کریں؟ کھاؤ، پیو،

اور سو جاؤ!"

علاء الدین خلجی:- "وہ ننگِ خلائق جس کا ابھی آپ ذکر فرما رہے تھے آپ کے سامنے موجود ہے۔ اسے اپنی خطاؤں کا اعتراف ہے، وہ اپنی غلطیوں کا اقرار کرتا ہے، اسے اپنی کوتاہیوں پر ندامت ہے۔ وہ ہر تعزیر اور عقوبت برداشت کرنے کو تیار ہے، لیکن وہ چاہتا ہے کہ اس کی غلطیوں اور کوتاہیوں کی سزا اس کی قوم کو نہ ملے!"

یہ کہہ کر خلجی رونے لگا۔ سلطان المشائخؒ نے دریافت فرمایا:-

"تو تم علاء الدین خلجی ہو؟"

علاء الدین خلجی:- "اسی نامۂ سیاہ کو علاء الدین کہتے ہیں!"

سلطان المشائخؒ:- "ندامت کے آنسو دامن کے ہر دھبّے کو دھو دیتے ہیں۔ تمہارا یہ تضرّع اور خشوع رائگاں نہ جائے گا!"

علاء الدین خلجی:- "تو کیا میں یقین کر لوں آپ کی دعائیں میرے ساتھ ہیں!"

سلطان المشائخؒ:- "ہاں میں دعا کرتا ہوں کہ خدا تمہیں سچّے مسلمان بننے کی توفیق عطا فرمائے اور کفّار پر غلبہ عطا فرمائے!"

علاء الدین خلجی:- "اب میں مطمئن ہوں، اب میرے دل کا اضطراب دُور ہو گیا، اب مجھے یقین ہے کہ نصرتِ الٰہی میرے ساتھ ہوگی!"

سلطان المشائخؒ:- "لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ (خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہو)!"

علاء الدین خلجی:- "میں خدا کی رحمت سے مایوس نہیں ہوں، پُر امید ہوں۔ میرے اندر ایک نیا ولولہ، ایک نیا جذبہ، ایک نیا جوش پیدا ہو گیا ہے۔ میں لڑوں گا اور کفّار کے چھکّے چھڑا دوں گا۔ تاتاریوں کو ایسا سبق دوں گا کہ وہ زندگی بھر یاد کریں گے، کبھی فراموش نہ کر سکیں گے!"

سلطان المشائخ ۔ "انشاءاللہ!"

علاءالدین خلجی ۔ "جی ہاں انشاءاللہ!"

سلطان المشائخ ۔ "ناموں میں بڑی تاثیر ہوتی ہے ۔ تمہارا نام علاءالدین ہے ۔ خدا تمہیں موقع دے رہا ہے، کہ اپنے نام کو سچا کر دکھاؤ ۔ اس کے دین کو سربلند کرنے میں جان کی بازی لگا دو!"

علاءالدین خلجی ۔ "انشاءاللہ ایسا ہی ہوگا!"

سلطان المشائخ ۔ رات گزر چکی ہے ۔ فجر کا اول وقت شروع ہو چکا ہے ۔ آج ہی تمہیں جنگ شروع کرنی ہے، اب جاؤ خدا پر بھروسہ رکھو، اور نتیجہ سے بے پروا ہو کر میدان میں کود پڑو۔ اسلام کی تاریخ پیش نظر رکھو، بارہا ایسا ہوا ہے کہ مسلمان اپنے سے کئی گنا زیادہ فوج سے لڑے ہیں اور کامیاب ہوئے ہیں ۔ اگر تمہاری نیت نیک ہے، جذبہ خالص ہے، تو تاریخ پھر اپنا اعادہ کر سکتی ہے!"

علاءالدین خلجی ۔ (خوش ہو کر) "اب غلام جاتا ہے، لیکن جانے سے پہلے ایک عرض اور کرنا چاہتا ہے!"

سلطان المشائخ ۔ "کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟"

علاءالدین خلجی ۔ "میں چاہتا ہوں فجر کی نماز آپ کی اقتدا میں ادا کروں، پھر یہاں سے روانہ ہوں!"

سلطان المشائخ ۔ "لیکن تم نے جہاد کا عزم کیا ہے ۔ خدا کے راستے میں سرفروشی کے ارادے سے نکلے ہو ۔ کیوں نہ آج کی نماز تم پڑھاؤ!"

علاءالدین خلجی ۔ "نہیں، میں اس قابل نہیں ہوں، میرا وجود سراپا معصیت ہے ۔ میں اتنی بڑی

جرأت کبھی نہیں کر سکتا، جو میری تمنا ہے وہ پوری فرمایئے۔ میری سب سے بڑی سعادت اور خوش بختی یہی ہے کہ آپ کے پیچھے نماز پڑھوں، اس طرح مجھ میں ایک نئی اُمنگ پیدا ہو جائے گی!"

سلطان المشائخ: "کوئی مضائقہ نہیں ـــــــ وضو کر لو!"

علاء الدین خلجی: "میں باوضو ہوں!"

سلطان المشائخ: (مسکرا کر) "جزاک اللہ، آؤ۔ یہ سامنے مسجد ہے، وہیں نماز پڑھیں گے!"

علاء الدین حضرت کے پیچھے پیچھے مسجد میں پہنچا اور وہاں اُن کی اقتدا میں نماز ادا کی۔ اس نماز میں جو کیف و سرور حاصل ہوا، وہ زندگی میں کبھی حاصل نہیں ہوا تھا۔ نماز کے بعد حضرت سلطان المشائخ نے دستِ دعا بلند کر کے ربِ ذوالجلال سے گڑگڑا کر دعا کی کہ وہ لشکرِ اسلام کو اعدائے اسلام پر فتح و ظفر عطا فرمائے!

نماز کے بعد علاء الدین خوش خوش اپنے قصر کی طرف روانہ ہوا۔

دل کی دھڑکن

حضرت سلطان المشائخ کی خانقاہ سے علاء الدین قلبِ مطمئنہ کے ساتھ واپس ہُوا یوں تو ایک عرصے سے اس کے اندر خوشگوار مذہبی تبدیلی پیدا ہو رہی تھی، چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ اس نے جس کثرت سے مسجدیں، خانقاہیں، حوض، مینار اور حصار تعمیر کرائے، کسی بادشاہ کے کارنامے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے[1]، ——— اور یہ اسی للّٰہیت کا نتیجہ تھا کہ "انصاف اور سچائی کا دَور دورہ اور بغاوت و سرکشی کی کساد بازاری جیسی اس زمانہ میں ہوئی کسی اور زمانے میں میسّر نہ ہوئی ہوگی"[2]۔ لیکن آج حضرت سلطان المشائخ کے حضور میں حاضر ہونے اور ان کی اقتدا میں نماز پڑھنے ان کے کلماتِ قدسی سننے اور جمالِ باکمال دیکھنے کے بعد اس میں جو تبدیلی ہوئی، وہ واقعی بہت ہی عجیب اور بڑی خوشگوار تھی۔

اب تک علاء الدین شہر پناہ سے باہر نہیں نکلا تھا، لیکن آج اسے جنگ شروع کرنی تھی، اس نے اپنی فوجوں کو جمع کیا اور اپنے آزمودہ کار سپہ سالاروں کے ساتھ باہر نکلا۔ تاتاری تو دل سے چاہتے تھے کہ لڑائی شروع ہو، وہ بھی بڑی آمادگی سے باہر نکلے۔ تاتاریوں (مغلوں) کی فراست اور تدبر کا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ماوراء النہر سے لے کر دلّی تک کی طویل مسافت انہوں نے قطع کی۔ مگر راستہ

[1] [2] تاریخ فرشتہ ص ۲۰۵ ج: ۱

پھر خلافِ عادت اور خلافِ اصُول کہیں لُوٹ مار نہیں کی، تاکہ ان کی قوت محفوظ رہے۔ وہ دلّی پر چڑھ آئے اور تین طرف سے اس کا محاصرہ کرلیا۔ صرف جمنا کی طرف کا راستہ کھلا رہ گیا۔[1] جب علائی فوجیں شہر پناہ سے باہر نکلیں تو قتلغ خواجہ خود اپنا گھوڑا بڑھا کر وسط میں آیا، اور اس نے سردارانِ فوج اور سپاہیوں کو مخاطب کرکے ایک بڑی ولولہ آفریں تقریر کی۔ اس نے کہا:۔

"میرے بہادرو!

ہم دور دراز کی مسافت طے کرکے اس دیس میں پہنچے ہیں۔ یہاں کی ندیاں، یہاں کے پہاڑ، یہاں کی وادیاں، یہاں کی آب و ہوا، یہاں کے موسم، یہاں کے پھل، یہاں کی دولت، یہاں کے مناظر، یہاں کا حسن و جمال، یہ سب چیزیں اس لئے ہیں کہ ہمارے استعمال میں آئیں، اب تک کئی بار ہم آئے اور واپس چلے گئے۔ اب اس لئے آئے ہیں کہ کبھی واپس نہ جائیں، اس سرزمین پر ہمارا پرچم لہرائے گا، اور ہمیشہ لہراتا رہے گا۔ ہم یہاں حکومت کریں گے اور یہاں کا ہر جاندار ہمارا غلام ہوگا ——— نہیں صرف جاندار ہی نہیں، ہر بے جان بھی ہمارا غلام ہوگا، یہاں کا چپہ چپہ ہماری اطاعت کا پابند ہوگا!

شاباش بہادرو شاباش!

آگے بڑھو، آگے بڑھو، حلوائے تر کی صُورت میں دشمن تمہارے سامنے موجود ہے، اسے لقمہ بنالو! یاد رکھو، اگر تم نے کمزوری دکھائی، تو یہاں سے زندہ واپس نہیں جاسکتے یہاں کا ذرہ ذرہ تمہارا دشمن ہے، تمہیں بھاگنے کا راستہ نہ ملے گا۔ لہٰذا ایسی پامردی اور استقلال سے لڑو کہ کوئی تمہیں زیر نہ کرسکے۔ دشمن کی پیش قدمی کا انتظار بیکار ہے، حملہ کا آغاز تمہاری طرف سے ہونا چاہئے تاکہ دشمن ہکا بکا رہ جائے!"

[1] تاریخ پاکستان و بھارت (ہاشمی)

اور اُدھر علاء الدین خلجی اپنی سپاہ اور اپنے سرداروں کو مخاطب کر کے کہہ رہا تھا :-

" ترک سپاہیو !

——— لڑائی تمہارا کھیل ہے، آج اس وسیع میدان میں تمہیں اپنا پُرانا کھیل پھر کھیلنا ہے، بارہا تم نے دشمنوں سے مقابلہ کیا ہے، جس میں وہ ہارا ہے اور تم جیتے ہو، آج بھی یہی ہوگا، فتح و نصرت تمہارے قدم چُومنے کی آرزومند ہے، تلوار میان سے باہر نکلنے اور دشمن کا سر کاٹنے، اس کا خون چاٹنے اور اس کے جسم و جان کا رشتہ منقطع کرنے کے لئے بے قرار ہو رہی ہے، خدا کے بھروسے پر آگے بڑھو، اور دشمن پر ایسی کاری ضرب لگاؤ کہ پھر وہ سر نہ اُٹھا سکے !

——— ہاں دیکھو وہ دشمن بڑھ رہا ہے، اس نے ہماری ہیش بستی کا انتظار بھی نہیں کیا۔ خبردار ! وہ آگے نہ بڑھنے پائے، اگر وہ آگے بڑھنے میں کامیاب ہو گیا تو یاد رکھو تم غلام ہو جاؤ گے، تمہاری مسجدیں ڈھادی جائیں گی، تمہاری حویلیاں مٹی کا ڈھیر بنادی جائیں گی، تمہاری شاندار عمارتیں غارت کردی جائیں گی۔ تمہاری دولت و ثروت چھین لی جائے گی، تمہاری عفّت شعار، عصمت مآب اور حیادار لڑکیاں، بہنیں اور بیویاں لونڈیاں بنالی جائیں گی، کیا تم اسے گوارا کر سکتے ہو ؟

(نعرے : "ہرگز نہیں !" ———)

اگر واقعی تم اس ننگ کو گوارا نہیں کر سکتے تو دشمن کو پیچھے دھکیل دو، اس طرح، کہ وہ پھر نہ پلٹ سکے، آج پھر کفر نے اسلام پر یورش کی ہے، کمرِ ہمّت باندھ کر اُٹھو، اور کفر کا صفایا کردو۔ تم ان بزرگوں کی اولاد ہو، جنھوں نے ہر طرح کی بے بضاعتی کے باوجود زنگ خوردہ اسلحہ لے کر پھٹے پُرانے کپڑے پہن کر، فقر و فاقہ کی حالت میں توانا اور قتور، زور آزما

سامانِ جنگ سے لیس دشمن کا مقابلہ کیا ہے، اسے شکست دی ہے، اس کی حکومت چھین لی ہے، اگر تمہاری رگوں میں وہی خون دوڑ رہا ہے، تو کوئی وجہ نہیں کہ اس دشمن کو تم مچھر کی طرح مسل نہ دو ۔۔۔ حکم کا انتظار نہ کرو، دشمن بڑھ رہا ہے، تم بھی صفتِ سیلِ رواں بڑھو اور اس طرح اپنے گرداب بلا تک اُسے اپنی لپیٹ میں لے لو کہ پھر اُبھر نہ سکے ۔۔۔ !"

یہ کہہ کر علاءالدین نے گھوڑا بڑھایا، اور میدانِ جنگ میں یکہ و تنہا بے اندیشہ و تامّل کود پڑا۔ علاءالدین کو یوں جاتے دیکھ کر الغ خاں، رکن خاں، ظفر خاں اور دوسرے سرداروں کو کہاں تاب رہ سکتی تھی۔ انہوں نے بھی اپنے اپنے دستوں کو جنبش دی، اور آدمیوں کے اس سمندر میں کود پڑے!

گھمسان کی جنگ شروع ہو گئی!

ہاتھی چنگھاڑ رہے تھے، گھوڑوں کی ٹاپوں سے زمین روندی جا رہی تھی، نیزے اس طرح چل رہے تھے جیسے دو سانپ آپس میں گتھ گئے ہوں، تلواریں اس طرح چمک رہی تھیں جیسے بجلیاں، تیر اس طرح چشم زدن میں جسم و روح کا تعلق منقطع کر رہے تھے کہ مرتے مرتے سانس لینے کی بھی مہلت نہ ملتی تھی۔

ایک ہولناک، مہیب اور دہشت ناک منظر چھایا ہُوا تھا، سر کٹ رہے تھے، دھڑ گر رہے تھے، خون کے فوارے جاری تھے۔ زخمیوں کی آہوں اور کراہوں سے شورِ محشر برپا تھا۔ کسی کو کسی کا ہوش نہیں تھا، کسی کو کسی کی فکر نہ تھی۔ سب اپنی اپنی دھن میں مست تھے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا تھا، جنگ اور زیادہ ہولناک، اور زیادہ خوفناک، اور زیادہ لرزہ خیز بنتی جا رہی تھی۔

ظفر خاں کا رنگِ شجاعت سب سے الگ تھا۔ وہ شجاعت میں رستمِ عصر تھا، ہوشیاری اور فرزانگی میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ آج سے بہت پہلے جب سلطان الشایخ کے کلماتِ طیبہ اس کے

کان میں پڑتے تھے، اس نے دل ہی دل میں یہ فیصلہ کر لیا تھا، کہ یہ زندگی خدا نے دی ہے، اسے خدا ہی پر نثار ہونا چاہئے، آج وقت آگیا تھا کہ اپنے عہد کو پورا کرے، اپنے قول کو نباہے، امتحان کی گھڑی سر پر تھی، اور یہی فیصلہ کُن گھڑی بھی تھی۔ اسی آن یہ فیصلہ ہونا تھا کہ اس کا عہد پختہ تھا یا بودا؛ اس نے اپنے جنگی ہاتھیوں کے ساتھ صبا رفتار گھوڑوں کو کچھ اس طرح بڑھایا کہ دشمن کی صفیں کاٹتا ہُوا آگے بڑھا اور بڑھتا رہا۔ اس نے دشمن کے بائیں بازو پر یورش کی، اور اسے کاٹ کر رکھ دیا، اور چند گھنٹے کی خوفناک اور خونریز جنگ کے بعد مغلوں کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ ظفر خاں چھتیس[۳۶] میل تک یونہی تعاقب کرتا ہُوا نکل گیا۔ ہزاروں مغلوں کو اس کی فوج نے موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ ظفر خاں کی بہادری اس کے لئے جان لیوا ثابت ہوئی، وہ علائی فوج تو کیا، خود اپنے دستہ سے بھی الگ ہو گیا اور تعاقب جاری رکھا، یہاں تک کہ ایک موقع پر غنیم اسے تنہا دیکھ کر پلٹ پڑا اور ہر چہار طرف سے گھیر لیا۔ قتلغ خواجہ ظفر خاں کی دلیری اور بہادری سے اتنا متأثر تھا کہ اس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ ظفر خاں کو زندہ گرفتار کیا جائے۔ اس کی جان نہ لی جائے۔ ایسے بہادر کی ہم قدر کرتے ہیں ہم نہیں چاہتے کہ یہ مارا جائے۔ ہم انعام و اکرام دے کر اسے رخصت کر دیں گے!

لیکن اس پیشکش کے بعد جب اس سے ہتھیار ڈالنے کو کہا گیا، تو شیر کی طرح غرّا کر اس نے کہا "بہادر اپنی زندگی کا سودا نہیں کرتے۔ قتلغ خواجہ سے کہدو، ظفر خاں ہتھیار ڈالنے سے انکار کرتا ہے۔ وہ دشمن سے انعام و اکرام لینا اپنی توہین سمجھتا ہے، دشمن سے زندگی کی بھیک مانگنا اس کے لئے باعثِ ننگ ہے!"

اور یہ کہہ کر دشمن کے نرغہ میں گھرا ہُوا وہ بہادر پھر گتھ گیا، وہ زخمی ہُوا، گھوڑے سے گر پڑا لیکن تلوار اب بھی اُس کے ہاتھ میں تھی، وہ اُٹھا اور پا پیادہ لڑنے لگا، اور جب تک جان نہ دے دی، نہ تلوار ہاتھ سے چھوڑی، نہ میدان سے قدم ہٹایا۔

تاریخ ہند (ہاشمی)

اس کے بعد مغلوں کی پسپائی پھر اقدام سے بدل گئی، اُنہوں نے اپنی قوت مجتمع کی، اور اس آخری بازی میں اپنی جان داؤں پر لگادی ——— جنگ شروع ہوگئی پوری شدت اور خوں ریزی کے ساتھ، گرد کے طوفان اُٹھ رہے تھے، خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں، ہتھیاروں کی چمک دمک نے نظر کو خیرہ کردیا تھا۔ تیروں کی نوک بڑی تیزی سے زندگی کا فیصلہ کر رہی تھی۔ دونوں لشکر اس طرح آپس میں گتھ گئے تھے کہ حریف اور حلیف کا پتہ چلانا مشکل تھا!

اس جنگ میں خضر خاں شریک نہ ہوسکا تھا۔

وہ اپنے عہد پر قائم تھا۔ اس نے اجکماری دیول دیوی سے ملنا جلنا ترک کردیا تھا۔ پاس عہد نے اس کی جان پر بنادی تھی۔ وہ لاغر ہوگیا تھا، کمزور ہوگیا تھا، آنکھیں حلقوں میں دھنس گئی تھیں چہرے پر زردی چھاگئی تھی، بظاہر وہ کچھ بھی بیمار نہ تھا، لیکن صورت دیکھئے تو مہینوں کا بیمار معلوم ہوتا تھا حکیم اسے مقوی سے مقوی دوائیں دیتے تھے، وہ انہیں استعمال بھی کرتا تھا لیکن بقول —

مریضِ عشق پر رحمت خدا کی   مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

علاء الدین اس کی راحت و آرام، عافیت اور آسائش کا بہت خیال رکھتا تھا۔ خود مزاج پرسی کے لئے ہر روز آیا کرتا تھا، دیر تک بیٹھتا تھا، تسلی اور دل دہی کی باتیں کرتا تھا، حکایتیں اور داستانیں سنایا کرتا تھا۔ اُس کا خیال بٹانے اور طبیعت بدلنے کی کوشش کرتا تھا خضر خاں زبان سے خاموش تھا۔ لیکن حالت بتارہی تھی کہ یہ مرض جان لے کر ٹلے گا۔ علاء الدین بھی خاموش تھا، اور اس کا عزم کہہ رہا تھا کہ محبوب بیٹے کا مرجانا گوارا ہے لیکن اس کی خاطر کوئی ایسی بات نہیں کی جاسکتی جو اُصول کے خلاف ہو اور جس دن لڑائی شروع ہوئی، اس دن بھی حسب معمول علاء الدین اس کے پاس آیا، بیٹھا، باتیں کیں اور چلتے وقت یہ خبر سنائی کہ آج جنگ شروع ہورہی ہے!

یہ سُن کر خضر خاں اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اس نے کہا:۔

"آپ نے مجھے پہلے نہ بتایا!"

علاء الدین نے محبت بھرے لہجے میں کہا:۔

"ویسے ہی تمہاری صحت گر رہی ہے۔ مَیں نہیں چاہتا کہ پریشان کُن خبریں تمہارے کانوں تک پہنچیں!"

خضر خاں نے جرأت کے ساتھ کہا:۔

"کچھ بھی ہو۔ مَیں عورتوں کی طرح گھر میں نہیں بیٹھ سکتا۔ مَیں چلوں گا!"

علاء الدین نے اپنے ہاتھ سے اسے پھر بستر پر بٹھا دیا اور کہا:۔

"نہیں بیٹے، خودکشی کی کوشش نہ کرو، خدا کے فضل سے میرے پاس کافی فوج ہے۔ مَیں دشمن سے اچھی طرح نبٹ لوں گا، باپ اور بادشاہ کی حیثیت سے جو حکم تمہیں دوں، اس کی تعمیل کرنی چاہئے تمہیں!"

خضر خاں کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"کاش آج سے پہلے مَیں مر گیا ہوتا۔ ایسی زندگی میرے لئے باعثِ ننگ ہے!"

علاء الدین نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا:۔

"بیٹے کیسی باتیں کرتے ہو تم؟ بیماری، کمزوری اور مجبوری اختیاری تو نہیں ہوتی، تم نوجوان ہو، انشاء اللہ اس سے بڑے بڑے معرکے پیش آئیں گے، اور ان میں حصہ لو گے، ایک معمولی سے معرکہ میں حصہ نہ لے سکنے پر اتنے غمگین کیوں ہوتے ہو؟ یہ بھی کوئی بات ہے؟"

یہ کہہ کر علاء الدین اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے جاتے جاتے کہا:۔

"دیکھو تمہاری اس کھڑکی سے جو بستر کے پاس ہے۔ میدانِ جنگ بالکل صاف نظر آرہا ہے۔ یہاں لیٹے لیٹے تم جنگ کی ساری کیفیت بڑے اطمینان سے دیکھ سکتے ہو!"

علاءالدین چلا گیا اور خضر خاں بستر پر نڈھال ہو کر پڑ گیا۔

خضر خاں اپنے بستر پر چپ چاپ لیٹا تھا کہ اسے کسی کے پاؤں کی آہٹ محسوس ہوئی نظر اُٹھا کر دیکھا تو مُنہ ڈھانپے، چادر میں لپٹی ہوئی ایک عورت کھڑی تھی۔ خضر خاں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

"تم کون ہو؟"

عورت نے جواب دینے کے بجائے گھونگھٹ اُٹھا دیا، یہ دیول دیوی تھی!

دیول دیوی کو دیکھ کر خضر خاں چند لمحوں کے لئے بالکل گم صُم ہو گیا۔ اسے اپنی نظروں پر اعتبار نہیں آ رہا تھا، وہ بیتابی اور بیقراری کے ساتھ اُٹھ کھڑا ہوا۔

"دیول دیوی تم؟ ——— کس طرح یقین کروں تم یہاں ہو؟"

دیول دیوی: "یقین کیجئے!"

خضر خاں: "تم خفا ہو مجھ سے؟ تمہیں خفا ہونے کا حق بھی ہے!"

دیول دیوی: "بالکل نہیں، آپ سے خفا ہونے کا مجھے حق کیا ہے؟"

خضر خاں: "یہ نہ کہو، یوں کہو، میں تمہارا مجرم ہوں!"

دیول دیوی: "نہیں یہ نہ کہئے۔ شہزادے جرم نہیں کیا کرتے۔ ان سے جُرم سرزد ہی نہیں ہو سکتا، جُرم تو ہم جیسے لوگ کرتے ہیں، سو مجھے اقرار ہے کہ واقعی مجرم ہوں!"

خضر خاں: (ٹھنڈی سانس لے کر) "جو چاہو، کہو، میں اپنی صفائی میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتا لیکن کیا میرے اندر تم کوئی تبدیلی نہیں دیکھتیں؟"

دیول دیوی: "کیسی تبدیلی؟ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی!"

خضر خاں: "لوگ کہتے ہیں کمزور ہو گیا ہوں، میرا رنگ زرد پڑ گیا ہے۔ لاغری بڑھتی جا رہی ہے، آنکھیں حلقوں میں دھنس گئی ہیں، مہینوں کا بیمار معلوم ہوتا ہوں حکیم صاحب دوائیں دیتے ہیں،

عرق پلاتے ہیں، خمیرے چٹاتے ہیں لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوتا، ——— کیا یہ سب جھوٹ ہے؟"

دیول دیوی نے اب نگاہ غور سے خضر خاں کو دیکھا، تو واقعی یہ انقلاب احوال دیکھ کر دہ دنگ رہ گئی۔ بیتاب ہو کر اس نے کہا:۔

دیول دیوی:۔ "تو آپ بیمار ہیں کچھ؟ ——— مجھے تو آپ کی بیماری کی کوئی اطلاع نہیں ملی۔ ورنہ سر کے بل آتی آپ کی تیمارداری کرتی اور اچھا کر لیتی!"

خضر خاں:۔ "ہاں میں بیمار ہوں، اور یہ بھی سچ ہے کہ تم ہی مجھے اچھا کر سکتی ہو، میرا علاج حکیم صاحب کے بس کا نہیں، صرف تمہارے اختیار میں ہے!"

دیول دیوی:۔ "یہ آپ میری صورت دیکھ کر کہہ رہے ہیں؟"

خضر خاں:۔ "مجھے غلط نہ سمجھو! ——— کیا تمہیں میری محبت کا یقین نہیں؟"

دیول دیوی:۔ (آہ سرد بھر کر) "تھا تو؟"

خضر خاں:۔ "مگر اب نہیں رہا؟ یہی نا؟"

دیول دیوی:۔ "جھوٹ بولنا میری عادت نہیں۔ کیسے مان لوں کہ آپ اب بھی مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ آپ نے ملنا چھوڑ دیا، آنا جانا چھوڑ دیا، اس طرح کٹ گئے، جیسے آپ سے کبھی میل جول ہی نہ تھا!"

خضر خاں:۔ "ہاں سچ کہتی ہو، لیکن میں مجبور تھا!"

دیول دیوی:۔ "مرد بھی مجبور ہوتے ہیں، یہ آج آپ سے معلوم ہوا، ——— ورنہ میں تو اس خیال میں تھی، مجبوری صرف عورت ہی کا حصہ ہے!"

خضر خاں:۔ "بڑی بے درد ہو، دیول دیوی کاش تم میرا دل دیکھ سکتیں!"

دیول دیوی:۔ "آپ کا دل دیکھنا اور اسے سمجھنا مشکل پا کر آج اس لئے آئی تھی، کہ اپنا دل دکھا

دوں آپ کو !"

خضر خاں ۔" تمہارا دل ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ آہ جو صرف میرا تھا!"

دیول دیوی ۔" ہاں وہ آپ کا تھا، آپ کا ہے اور آپ ہی کا رہے گا!"

خضر خاں ۔" مانتا ہوں میرا تھا، یہ بھی مانتا ہوں اب تک میرا ہے، لیکن آئندہ بھی میرا رہ سکے گا یہ میں نہیں مان سکتا!"

دیول دیوی ۔ (تیوری چڑھاکر) "کیوں؟ یہ خیال آپ کے دل میں کیوں آیا؟ کیا آپ مجھے اپنی طرح "مجبور" سمجھتے ہیں؟ میں دیول دیوی ہوں، جو کہتی ہوں وہ کرتی ہوں، میں کسی طاقت کے آگے سر نہیں جھکا سکتی، میرا فیصلہ اٹل اور مستقل ہوتا ہے!"

خضر خاں ۔" تم میری مجبوری کسی طرح نہیں سمجھ سکتیں!"

دیول دیوی ۔" ممکن ہے آپ ایسے ہی مجبور ہوں، اور میں آپ کی مجبوری سمجھنا بھی نہیں چاہتی تو میں تو اپنا اختیار دکھانے آئی ہوں آپ کو!"

خضر خاں ۔ (متحیر ہوکر) "اختیار؟ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

دیول دیوی ۔" یاد ہے آج سے بہت دن پہلے میں نے آپ کو اپنے بالوں کے جوڑے سے کوئی چیز نکال کر دکھائی تھی؟"

خضر خاں ۔ (پریشان ہوکر) "ہاں یاد ہے، تم نے زہر ہلاہل کی پڑیا دکھائی تھی ۔۔۔۔۔۔ لیکن اس وقت وہ بات کیوں یاد آگئی؟"

دیول دیوی ۔" اس لئے کہ اب اس کے استعمال کا وقت آگیا ہے۔ آپ نے مجھے چاہا، میں نے آپ کو چاہا، آپ مجبوری سے پیچھے ہٹ گئے ہیں، میرا قدم پیچھے نہیں ہٹ سکتا!"

خضر خاں ۔ (بیقرار ہوکر) "نہیں، خدا کے لئے ایسا نہ کہو، تمہاری زندگی کے ساتھ میری زندگی بھی

وابستہ ہے، تم نہ رہیں تو میں جی کر کیا کروں گا؟"

دیول دیوی :- "لیکن اب زندہ رہنے کا حق مجھ سے چھینا جا رہا ہے؟"

خضر خاں :- "میں نہیں سمجھا، تم کیا کہنا چاہتی ہو؟ —— کون ہے جو تم سے زندہ رہنے کا حق چھین سکے؟"

دیول دیوی :- "کیا کریں گے آپ نام معلوم کر کے؟ کر بھی کیا سکتے ہیں آپ؟"

خضر خاں :- "میں اس ظالم کو اپنی جان کی بازی لگا کر روکوں گا، —— بھلا میرے ہوتے تمہاری زندگی چھینی جا سکتی ہے؟"

دیول دیوی :- "جب بچنے کی کوئی صورت نہ رہی تو میں نے فیصلہ کر لیا، کسی اور کو اپنا گلا نہ گھونٹنے دوں گی۔ خود ہی اپنی زندگی کا خاتمہ کر دوں گی —— دیکھئے وہ زہر —— اب بھی میرے پاس ہے، ہر وقت میرے پاس رہتا ہے، ہر وقت میرے بالوں کے جوڑے میں پوشیدہ رہتا ہے!"

خضر خاں :- (دیوانہ وار) "خدا کے لئے ایسی باتیں نہ کرو، مجھ پر رحم کرو، میں نہیں برداشت کر سکتا ان باتوں کو —— مجھے بتاؤ کیا بات ہے، کون لاگو ہو گیا ہے تمہاری زندگی کا؟"

دیول دیوی :- "نام بتاؤں؟ سنیں گے آپ؟"

خضر خاں :- "ہاں بتاؤ، ضرور بتاؤ، فوراً بتاؤ؟"

دیول دیوی :- (مسکرا کر) "اور اگر آپ ڈر گئے؟"

خضر خاں :- "تم خضر خاں کو نہیں جانتیں، وہ خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا! —— بتاؤ کون ہے جو تمہارا گلا گھونٹنا چاہتا ہے؟"

دیول دیوی :- "تاجدارِ عالم پناہ، شہنشاہ زماں، خاقان ابن خاقان سلطان علاء الدین خلجی!"

یہ سن کر خضر خاں پر سکتہ کی سی کیفیت طاری ہوگئی، وہ دم بخود ہو گیا۔ کئی منٹ تک اسی طرح خاموش بیٹھا رہا، اس کے حواس گم تھے، اس کی زبان قوتِ گویائی سے محروم ہو چکی تھی۔ اس کے دماغ نے سوچنا بند کر دیا تھا۔ دیول دیوی غور سے اس کی کیفیت دیکھ رہی تھی۔ جب کئی منٹ گزر گئے، اور خضر خاں کی ازخود رفتگی کم نہ ہوئی تو وہ بولی:۔

دیول دیوی: "دیکھئے میں نہ کہتی تھی، نام سن کر آپ ڈر جائیں گے؟ وہی ہوا!"

خضر خاں: (ایک عزم کے ساتھ) "یہ نہیں ہو سکتا، جب تک میں زندہ ہوں یہ نہ ہو سکے گا۔ لیکن واقعہ اب بھی سمجھ میں نہ آیا، آخر بات کیا ہے؟"

دیول دیوی: "سلطان کا فیصلہ یہ ہے کہ میری شادی کر دی جائے!"

خضر خاں: (چونک کر) "تمہاری شادی کر دی جائے؟ کس سے؟"

دیول دیوی: "راجہ رام دیو کے صاحبزادہ بلند اقبال سے!"

خضر خاں: "میں سمجھا، میں رام دیو کا اور اس کے بیٹے کا، دونوں کا گلا گھونٹ دوں گا!"

دیول دیوی: "تو اس سے کیا ہوگا؟ سلطان اگر چاہیں تو دو سو رام دیو اور دو ہزار اس کے بیٹے پیدا ہو سکتے ہیں!"

خضر خاں: "سلطان نے مجھ پر ظلم کیا، میں نے برداشت کر لیا۔ لیکن تم پر ظلم کریں اور میں برداشت کر لوں یہ نہیں گوارا کر سکتا، یہ نہیں ہونے دوں گا!"

دیول دیوی: "کیا کر لیں گے آپ؟ —— آپ سلطان سے اس معاملہ پر گفتگو ہی نہیں کر سکتے!"

خضر خاں: "ہاں میں نے اپنے معاملہ میں سلطان سے گفتگو نہیں کی لیکن تمہارے معاملہ میں کروں گا!"

دیول دیوی: "نہیں، اب کچھ نہیں ہو سکتا، سلطان کے ارادے اور رائے کو کوئی نہیں بدل سکتا۔ میری قسمت میں نامرادی کی موت لکھی تھی، مجھے موت سے شکوہ نہیں البتہ آپ سے شکوہ ضرور ہے!"

خضر خاں :- "سلطان کو اپنا ارادہ بدلنا پڑے گا" ـــــ لیکن تمہیں مجھ سے شکوہ کیا ہے؟"

دیول دیوی :- "آپ مجھے بھول گئے لیکن میں ہمیشہ آپ کو یاد کرتی رہی!"

خضر خاں :- "میں تمہیں کبھی نہیں بھولا ـــ لیکن شکایت کیا ہے تمہیں؟ یہ بھی تو کہو!"

دیول دیوی :- "چھوڑیئے، اب شکایت حکایت کا موقع نہیں رہا، مجھے رخصت کیجئے۔ البتہ ایک وعدہ آپ سے چاہتی ہوں، وہ کیجئے گا!"

خضر خاں :- "مجھ سے وعدہ چاہتی ہو؟ وعدہ نہ دو حکم دو۔ میں اس کی دل و جان سے تعمیل کروں گا!"

دیول دیوی :- "یہ کہ میری محبت کو یاد رکھئے گا، کبھی کبھی مجھے یاد کر لیا کیجئے گا۔ یہی میری محبت کا صلہ ہے، یہی میری محبت کا انعام!"

یہ کہتے کہتے دیول دیوی کی آنکھیں بھر آئیں اور وہ رونے لگی۔

اسے روتا دیکھ کر خضر خاں کی آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے۔ اس نے اپنے ہاتھ سے دیول دیوی کے آنسو پونچھے اور کہا:-

"خدا کے لئے اپنے آپ کو سنبھالو، اس جنگ کو ختم ہو لینے دو، پھر دیکھ لینا میں کیا کرتا ہوں!"

دیول دیوی :- "کیا کریں گے آپ؟"

خضر خاں :- "ہر قیمت پر تمہیں حاصل کر کے رہوں گا۔ اطاعت کی، صبر کی، برداشت کی حد ہو گئی۔ میں والد صاحب سے صاف صاف گفتگو کروں گا۔"

دیول دیوی :- "اور اگر وہ نہ مانے تو؟"

خضر خاں :- (پریشان ہو کر بھرائی ہوئی آواز میں) "اور اگر وہ نہ مانے تو؟"

دیول دیوی :- "ہاں، اور اگر وہ نہ مانے تو آپ کیا کر لیں گے؟ آپ کچھ نہیں کر سکتے۔ سلطان کے سامنے سب بے بس ہیں!"

خضر خاں ۔ "سب بے بس ہیں، اور مَیں تو بہت زیادہ بے بس ہوں۔ لیکن اس معاملہ میں میری بے بسی ختم ہو چکی ہے!"

دیول دیوی ۔ "تو مجھے بتایئے، اگر سلطان نے آپ کی بات نہ مانی، آپ کا اصرار رد کر دیا، تو آپ کے لئے آخری چارۂ کار کیا ہوگا؟"

خضر خاں ۔ (کچھ سوچتے ہوئے) "اگر ایسا ہوا تو مَیں اِس ملک کو، اس محل کو، اس شان و شوکت کو، اس اعزاز اور افتخار کو، اس ولی عہدی اور شاہزادگی کو چھوڑ دوں گا۔ تمہیں لے کر کسی ایسے گوشہ میں جا بیٹھوں گا، جہاں ہم دونوں کی محبت میں خلل انداز ہونے والا کوئی نہ ہوگا۔ جہاں ہم ہوں گے، ہماری بے لوث، سچی اور پاک محبت ہوگی۔ وہ غربت، وہ پریشان حالی، وہ کس مپرسی اس عیش و تنعم کی زندگی سے بدرجہا بہتر ہوگی!"

دیول دیوی ۔ (خوش ہو کر) "آپ ایسا نہیں کر پائیں گے، آپ مجھے بہلا رہے ہیں، تسلی دے رہے ہیں، میری خاطر یہ غلط کہہ رہے ہیں، یہ کچھ آپ سے نہ ہو پائے گا!"

خضر خاں ۔ "ہو پائے گا، ——— اور اگر نہ ہو پائے تو یہ زہر کی پڑیا شوق سے کھا لینا!"

دیول دیوی ۔ "اس صورت میں آپ اجازت دیتے ہیں؟"

خضر خاں ۔ "ہاں ——— پھر مجھے کیا حق ہوگا کہ تمہیں روکوں؟"

دیول دیوی ۔ (بے انتہا مسرور ہو کر) "میں بھی یہی چاہتی تھی۔ یہ دُنیا کے جھمیلے مجھے پسند نہیں۔ وہ راج اور وہ حکومت کس کام کی، جو دل کی حسرتوں کو کچل دے۔ دل کی خوشی برباد کر دے، دل کا وجود ختم کر دے!"

خضر خاں ۔ "اور کیا! ——— بہت سوچ بچار کے بعد اس فیصلہ پر پہنچا ہوں!"

دیول دیوی ۔ (سراپا سرور و نشاط بن کر) "بڑا مبارک فیصلہ ہے۔ مَیں اسے قبول کرتی ہوں!"

خضر خاں:- (مسکرا کر) "شکریہ اس ذرہ نوازی کا:"

دیول دیوی:- "اب آپ بنانے لگے؟"

خضر خاں:- "نہیں، ——— مجھے دیکھو، میری طرف دیکھو، اب میرے چہرے پر رونق ہے، اب میرے دل میں اُمنگ ہے، ——— دیول دیوی میں اچھا ہوں، میں اب بالکل اچھا ہوں!"

دیول دیوی:- "خدا کرے آپ ہمیشہ تندرست رہیں، ہمیشہ خوش و خرم رہیں، آپ کو ملول و افسردہ دیکھ کر میرا دل ڈوبنے لگتا ہے: ایسا معلوم ہوتا ہے، زمین پاؤں کے نیچے سے نکلی جا رہی ہے!"

خضر خاں:- "اب تم شاعری کرنے لگیں!"

دیول دیوی:- (ایک اندازِ خاص سے) "سچ میں جھوٹ نہیں کہتی!"

اتنے میں دیول دیوی نے کھڑکی سے میدانِ جنگ کا نظارہ کیا، اور یہ دیکھ کر وہ پریشان ہو گئی کہ تاتاری (مغل) مسلمانوں کو دباتے ہوئے آگے بڑھ رہے ہیں۔ یہ وہی وقت تھا جب ظفر خاں لڑتے لڑتے اپنی جان قربان کر چکا تھا، اور اسی حادثہ نے مسلمان فوج میں ایک عجیب کرب آمیز ہراس پیدا کر دیا تھا۔ تاتاریوں نے اس موقع سے فائدہ اُٹھایا اور چاہا کہ مسلمانوں کے اس صدمہ سے فائدہ اُٹھائیں اور پوری قوت سے حملہ کر کے ان کا قلع قمع کر دیں۔

دیول دیوی نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا:-

"دیکھیے، یہ کیا ہو رہا ہے؟"

خضر خاں نے اُٹھ کر میدانِ جنگ پر ایک نظر ڈالی، اور فوراً ہی ساری صورتِ حال اس کی سمجھ میں آگئی۔ وہ جلدی سے مسلح ہو کر دیول دیوی کے پاس آیا اور اثر انگیز لہجہ میں گویا ہوا:-

"مجھے اجازت دو دیول دیوی! میں قوم، ملت اور مذہب پر اپنی جان قربان کرنے جا رہا

ہوں ۔ اگر زندہ واپس آیا، تو اپنا عہد پورا کروں گا۔ شہید ہوگیا تو مجھے معاف کرنا، اور میرے لئے دعائے مغفرت کرنا!"

دیول دیوی کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں پیکرِ عزم و استقامت بن کر کہا "جائیے سدھاریئے، اتنے اچھے اور نیک کام پر جانے سے میں آپ کو منع نہیں کر سکتی۔ کاش مَیں بھی آپ کے ساتھ چل سکتی۔ دعا ہے کہ آپ کامیاب و کامران واپس آئیں۔ لیکن اگر خدا نے آپ کو شہادت کے لئے چن لیا، تو مَیں اس پر فخر کروں گی!"

اِن باتوں سے خضر خاں کا حوصلہ اَور بڑھ گیا۔ اس نے محبّت بھری نظروں سے دیول دیوی کو دیکھا اور رن پر چلا گیا۔

فیصلہ!

خضر خاں جب میدانِ جنگ میں پہنچا ہے تو حالات واقعی بڑی نازک صورت اختیار کر چکے تھے۔ غازی ملک، الغ خاں، الماس بیگ، ارکن خاں سب ہی اپنے اپنے مورچوں پر پہاڑ کی طرح جمے ہوئے تھے، لیکن ظفر خاں کی ہلاکت نے تاتاریوں کی یورش اور یلغار میں اتنی تندی پیدا کر دی تھی کہ مجموعی حیثیت سے بھی یہ سب مل کر اس کا کامیاب مقابلہ نہیں کر سکتے تھے ۔۔۔

علاء الدین کو ظفر خاں کی شہادت کا اب تک علم نہیں ہو سکا، وہ یگانہ اور بیگانہ میدانِ کارزار میں لڑ رہا تھا۔ کبھی اس طرف جاتا تھا، کبھی اس طرف۔ کبھی یہاں پہنچتا تھا کبھی وہاں۔ جس پہلو کو کمزور دیکھتا تھا گھوڑا اُڑا کر وہیں پہنچ جاتا تھا۔ اس کے پہنچتے ہی سپاہیوں میں ایک نئی زندگی ایک نئی حرارت پیدا ہو جاتی تھی۔ دھڑکتے ہوئے دل تھم جاتے تھے۔ گھبراہٹ اور اضطراب پر سکون اور وقار غالب آ جاتا تھا۔ وہ پھر جیداری کے ساتھ لڑنے لگتے تھے۔ پھر ان میں جوش پیدا ہو جاتا تھا۔ لیکن اکیلا علاء الدین کہاں کہاں پہنچتا؟ اسے ہر جگہ پہنچنا چاہئے تھا لیکن وہ ایک ہی جگہ پہنچ سکتا تھا۔ اتنے میں خضر خاں پہنچا۔ اس نے یہ رنگ دیکھ کر ایک پُرزور اور پُرجوش تقریر کی۔ اس نے کہا:۔

"میرے دوستو، ساتھیو اور بھائیو ـــــ!

کیا بات ہے کہ میں تمہیں پریشان اور دل گرفتہ دیکھ رہا ہوں؟ اس کا تو میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ تم جیسے سُورما موت سے ڈر سکتے ہیں۔ تم نے ہمیشہ موت کا مقابلہ کیا ہے، کیا اب تم اس سے ڈر جاؤ گے؟ اور کیا ڈر کر اس سے بچ جاؤ گے؟ مُوت کا ایک وقت معین ہے، وہ جب آتی ہے تو کسی کے ساتھ رعایت نہیں کرتی۔ نہ وہ بچہ کو دیکھتی ہے، نہ بوڑھے کو، نہ جوان کو، نہ مرد کو نہ عورت کو۔ موت کے پہلوان کو کوئی نہیں پچھاڑ سکتا۔ اور پھر تم مسلمان ہو، مسلمان کے نزدیک موت نام ہے ایک اَور شاندار زندگی کی طرف مراجعت کا، وہ زندگی تو اس زندگی کے مقابلہ میں اعلیٰ ہوگی، برتر ہوگی، بہتر ہوگی، اور دائمی بھی ہوگی، کیا تم دائمی زندگی کے مقابلہ میں عارضی زندگی کو ترجیح دیتے ہو؟ نہیں یہ مسلمان کی شان نہیں ہے۔ مسلمان کی شان یہ ہے کہ وہ اپنے دین پر، اپنی ملّت پر، اپنی قومی عظمت پر جان قربان کر دیتا ہے تم غازیانِ بدر اور شہیدانِ اُحد کی یادگار ہو، تمہارے اسلاف کے کارناموں سے تاریخ کے اوراق بھرے پڑے ہیں۔ کیا تم اِن کارناموں پر دھبہ لگانا چاہتے ہو؟ اور وہ بھی اس صُورت میں کہ دھبہ لگا کر بھی زندگی نہیں حاصل کر سکتے، فرار کی صُورت میں بھی مُوت سے دوچار ہونا پڑے گا اور وہ ذلّت کی مُوت ہوگی، جو لوگ ذِلّت کی زندگی پسند کرتے ہیں انہیں ذلّت کی موت ملتی ہے، آؤ، میرے پیچھے آؤ، حوریں تمہارے انتظار میں ہیں۔ فرشتے تمہاری مدد کو کھڑے ہیں!"

یہ کہا اور پھر قلندرانہ جرأت سے کام لے کر آدمیوں کے اس سمندر میں شناوری کرنے لگا۔ خضر خاں کی اس تقریر نے اور اس جذبۂ بے باک نے سپاہیوں میں ایک طوفانی جوش پیدا کر دیا

وہی مسلمان لشکر جس کے پاؤں اُکھڑنے لگے تھے، پہاڑ کی طرح اپنی جگہ جم گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑی دیر کے بعد تاتاری پھر پسپا ہوئے، اور اب کی اس طرح پسپا ہوئے کہ پھر اُنھوں نے مُڑ کر دلّی کی طرف نہ دیکھا، قتلغ خواجہ بُری طرح زخمی ہوا۔ بڑی مشکلوں سے اس کے زاروزار جسم کو لاد کر تاتاری لوگ کُم جہاں سے آئے تھے، اس طرف بھاگے، ——— آن کی آن میں نقشہ بدل گیا۔ تاتاریوں کے فرار نے اس ہولناک جنگ کو ختم کر دیا!"

علاءالدین اس کامیابی پر بہت مسرور تھا۔ اس نے غازی ملک کی طرف جو اس کے پاس کھڑا تھا، دیکھ کر کہا:۔

"آخر دشمن سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ گیا!"

غازی ملک۔ "جہاں پناہ!"

علاءالدین خلجی۔ "ہمیں یقین ہے قتلغ خواجہ اور اس کے ہم قوم اب دلّی کا رُخ کبھی نہیں کریں گے!"

غازی ملک۔ "اس مرتبہ انھیں ایسا سبق ملا ہے کہ پشت ہا پشت تک اسے فراموش نہ کر سکیں گے!"

علاءالدین خلجی۔ "ظفر خاں کہاں ہے؟ ——— آج اس نے بڑی بہادری دکھلائی۔ اسے بلاؤ۔ ہم اسے مبارک باد دیں گے، نوازشات شاہانہ سے مالامال کر دیں گے۔ اس کا دامن زر و جواہر سے بھر دیں گے۔ وہ کہاں ہے؟ ہماری آنکھیں اُسے تلاش کر رہی ہیں!"

غازی ملک۔ "جہاں پناہ!"

علاءالدین خلجی۔ "تم کہتے کیوں نہیں؟ کیا بات ہے؟"

غازی ملک۔ "ظفر خاں آپ پر نثار ہو گیا!"

علاءالدین خلجی۔ "وہ قتل ہو گیا؟ وہ شہید ہو گیا؟"

غازی ملک۔ "جہاں پناہ!"

علاء الدین خلجی ۔ "آہ! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؛ کیا یہ سچ ہے؟"
غازی ملک ۔ "بالکل سچ جہاں پناہ، ——— اور غلام کی اس سے بڑھ کر کوئی سعادت نہیں ہوسکتی کہ وہ آقا کے قدموں پر اپنی جان قربان کر دے!"
علاء الدین خلجی ۔ "نہیں، یہ نہ کہو، یہ جنگ ملک گیری کی جنگ نہ تھی، شہنشاہیت اور قیصریت کی جنگ نہ تھی، یہ جہاد تھا، یہ حق و باطل کا معرکہ تھا، یہ اسلام اور کفر کی لڑائی تھی، وہ ہم پر نہیں اپنے خدا پر قربان ہُوا ہے!"
غازی ملک ۔ "بے شک وہ شہید ہوگیا ہے جہاں پناہ!"
علاء الدین خلجی ۔ "اس کا کارنامہ اتنا بڑا تھا کہ خود خدا نے اسے اپنے حضور میں طلب کر لیا، وہاں اُسے وہ انعام ملے گا جو کوئی نہیں دے سکتا!"
غازی ملک ۔ "بے شک، بے شک!"
علاء الدین خلجی ۔ "سچی بات تو یہ ہے کہ اس جنگ کا اصلی ہیرو وہی تھا! —— اسی نے جیتی ہے یہ جنگ!"
غازی ملک ۔ "جہاں پناہ! غلام ظفر خاں سے محبت کرتا ہے، وہ اس کا دیرینہ رفیق کار ہے، وہ اُس کے ایثار و قربانی، شجاعت اور دلیری کا دل سے معترف ہے، لیکن اس جنگ کا ہیرو دراصل کوئی اَور ہے!"
علاء الدین خلجی ۔ "کیا کہا! ——— اِس جنگ کا ہیرو کوئی اَور ہے؟"
غازی ملک ۔ "جہاں پناہ!"
علاء الدین خلجی ۔ (حیرت سے) "کون ہوسکتا ہے وہ؟"
غازی ملک ۔ "خضر خاں، ——— سلطانِ عالم پناہ کا لختِ جگر، نورِ نظر،

قوم کا محبوب، ملّت کا سرتاج، ملک کا لعل شب چراغ !"

علاء الدین خلجی :- (بہت زیادہ حیران ہو کر) "کیا کہہ رہے ہو تم ؟ میں تو اسے بستر علالت پر چھوڑ کر آیا تھا !"

غازی ملک :- "وہ مجاہد ابن مجاہد ہے، عین اس وقت پہنچا جب تاتاریوں کی آخری یلغار نے ہماری فوج کو بدحواس کر دیا تھا - اُس نے ایک زبردست تقریر کی اور پھر آگ اور خون کے دریا میں کود پڑا !"

علاء الدین خلجی :- "ہاں میں نے ایک نوجوان کو دیکھا تھا، جو برق جہندہ کی طرح یہاں سے وہاں اور ادھر سے اُدھر پہنچ رہا تھا، وہ خضر خاں سے بہت مشابہت رکھتا تھا، لیکن میرے ذہن میں یہ خیال بھی نہ آیا کہ وہ خضر خاں ہو سکتا ہے !"

غازی ملک :- "وہی تھا جہاں پناہ، ——— ستّر زخم کھائے ہیں اس نے اس جنگ میں، لیکن خدا کا شکر ہے کہ مہلک نہیں !"

علاء الدین خلجی :- "کوئی مضائقہ نہیں، زخمی ہونا بہادروں کا جوہر ہے ——— کہاں ہے وہ ؟ اسے ہماری خدمت میں حاضر کرو !"

غازی ملک :- "وہ شاہی خیمہ میں ہے اور جراح اس کی مرہم پٹی کر رہے ہیں !"

علاء الدین خلجی :- "اچھا ہم وہاں چلیں گے، ——— لیکن نہیں، اسے دربارِ خاص میں ہمارے سامنے پیش کرو !"

غازی ملک :- "بہت خوب !"

علاء الدین اپنی باقی ماندہ فوج ظفر موج کے ساتھ شہر میں داخل ہوا۔ خلقت اس

کے دیدار کو اُمڈ پڑی تھی ۔ ہر ہر گلی اور کوچے میں تماشائیوں اور نعرے لگانے والوں کا ٹھٹ کا ٹھٹ لگا ہوا تھا ۔ علاء الدین بڑے طمطراق اور جاہ و جلال کے ساتھ شہر میں داخل ہوا، پھر یہ جلوس سارے شہر کا گشت کرتا ہوا قلعہ میں داخل ہوا۔ ہر شخص وفورِ مسرت سے بے تاب ہو رہا تھا، تاتاریوں کی شکست ایک بہت بڑی قومی تقریب بن گئی تھی!

دوسرے دن علاء الدین نے قصرِ شاہی میں دربار کیا ۔ اور تمام سرداروں کو گراں بہا انعام دیا ۔ سب سے آخر میں خضر خاں اس کے سامنے پیش ہوا۔ علاء الدین نے اس سے کہا :۔

" تمہارے کارنامے نے ہمارے دل کو فخر و مسرت سے معمور کر دیا ہے، تم نے اگرچہ ہماری نافرمانی کی ۔ کہ بستر علالت سے اٹھ کر میدانِ جہاد میں پہنچ گئے لیکن ہم اسے معاف کرتے ہیں، تم نے دین اور ملت کے لئے اپنی جان کی بازی لگا کر واقعی بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے! ——— ہم تمہیں انعام دینا چاہتے ہیں بتاؤ کیا چاہتے ہو تم؟"

خضر خان:۔ " غلام نے جو کچھ کیا، وہ خدا کی خوشنودی کے لئے کیا ۔ لہٰذا کسی انعام کی تمنا نہ جب تھی، نہ اب ہے!"

علاء الدین خلجی:۔ " جزاک اللہ! ——— اس بے لوثی کا مظاہرہ کر کے تم نے بڑی اچھی شاندار مثال قائم کر دی ہے!"

دفعتہً محل بھر میں ہلچل مچ گئی ۔ معلوم ہوا، راجکماری دیول دیوی نے زہر کھا کر خودکشی کر لی ہے ۔ یہ سنتے ہی علاء الدین نے دربار برخاست کیا، اور سیدھا محل میں

پہنچا۔ راجکماری ایک بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ کنول دیوی کی آنکھوں سے آنسوؤں کی برکھا جاری تھی، سارے محل پر سوگواری کا عالم چھایا ہُوا تھا، آن کی آن میں حکیموں اور ویدوں کا تانتا لگ گیا۔

بات یہ ہوئی کہ میدانِ جنگ سے فاتحانہ واپسی کے بعد زخمی ہونے کے سبب دیول دیوی سے خضر خاں فوراً نہ مل سکا۔ دوسرے دن شاہی احترام کے ساتھ ظفر خاں کا جنازہ اُٹھا۔ اس جنازے کے ساتھ خضر خاں نہ تھا۔ ہاں علاء الدین تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور وہ بار بار رومال سے انہیں پونچھتا جاتا تھا۔ دیول دیوی حرم سرا کی کھڑکی سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ اس کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ ظفر خاں کا نام اسے بہلانے کے لئے لیا جا رہا ہے، ورنہ یہ جنازہ خضر خاں کا ہے۔ لاکھ لاکھ رادھا اور سنجوگتا نے سمجھایا، مگر وہ نہ مانی۔ اس نے کہا، اگر تم سچی ہو تو شاہزادے کو یہاں لاؤ، یا مجھے وہاں لے چلو۔ شہزادہ کو علاء الدین نے روک رکھا تھا، اور یہاں پرندہ پَر نہیں مار سکتا تھا، جب رادھا اور سنجوگتا شاہزادہ کو نہ لا سکیں نہ دیول دیوی کو وہاں پہنچا سکیں، تو اس نے بالوں کے جوڑے سے وہی زہر کی پڑیا نکالی اور رادھا سے کہا:۔

"مجھے دھوکا دینے کی کوشش نہ کرو، شاہزادے کی روح میرے انتظار میں تڑپ رہی ہوگی، میں اس کے پاس جا رہی ہوں، ماتا جی سے میرا سلام کہنا! ——— اور ہاں میں مسلمان ہو چکی ہوں، مجھے آگ میں نہ جلانا، مسلمانوں کی طرح میری تجہیز و تکفین کرنا!"

یہ کہا، اور جب تک رادھا اور سنجوگتا راجکماری کو روکیں روکیں، وہ پڑیا کھا چکی تھی!

زہر خورانی کی اطلاع سنجو گتا اور رادھا نے فوراً کنول دیوی کو دی۔ اسی وقت سے دوا دوش شروع ہو گئی۔ بڑی مشکل سے اس کی جان بچی، لیکن کمزور اتنی ہو گئی تھی کہ اٹھنا بیٹھنا مشکل تھا۔ باپ کی نظر بچا کر خضر خاں روز اس کی عیادت کو آتا تھا، اور گھنٹوں اس کے پاس بیٹھ کر باتیں کیا کرتا تھا، کنول دیوی کو بھی سارا راز معلوم ہو گیا تھا۔ اس نے دیول دیوی کو بڑی ملامت کی۔ کہ لڑکی اگر تو خضر سے محبت کرتی تھی، تو مجھ سے کیوں نہ کہا۔ جتنا داعیہ تجھ پر رکھتی ہوں، اُتنا ہی حق مجھے خضر خاں پر بھی تو ہے۔ وہ ماں کی جھڑکی سُن کر مسکرا دیتی اور آنکھیں جھکا لیتی!

ایک روز علاءالدین حسبِ معمول کنول دیوی کے پاس بیٹھا تھا۔ خضر خاں بھی موجود تھا۔ کنول دیوی نے شوہر سے کہا:۔

"اس جنگ میں جن لوگوں نے نمایاں کام کئے۔ ان سب کو آپ نے نوازا، مگر میرے بیٹے کو کچھ نہ دیا۔ کیا یہی آپ کا انصاف ہے؛ خضر اگر نہ پہنچتا تو بازی اُلٹ چکی تھی!"

علاءالدین نے کہا:۔

"ہاں رانی تم سچ کہتی ہو۔ واقعی اس نے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے، ——— ہم نے اُسے انعام دینا چاہا، لیکن اس نے انکار کر دیا!"

کنول دیوی کہنے لگی:۔

"اب میں انعام دوں گی، دیکھوں گی میرا انعام لینے سے وہ کیونکر اور کیسے انکار کر سکتا ہے؛"

علاءالدین نے مسکرا کر خضر خاں کی طرف دیکھا اور کہا:

"ہمیں کوئی اعتراض نہیں!"

کنول دیوی نے اٹھلاتے ہوئے جواب دیا:

"آپ کو اعتراض کرنے کا حق بھی نہیں!"

علاء الدین خلجی: بے شک ـــــــ خضر خاں تمہیں اتنا ہی چاہتا ہے جتنا ایک بچہ اپنی ماں کو چاہ سکتا ہے، اور ہم جانتے ہیں یہی تمہاری کیفیت ہے!"

کنول دیوی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تو پھر میں انعام دیتی ہوں، ـــــــ (خضر خاں سے) بیٹے یہیں بیٹھے رہنا!"

وہ اندر کمرہ میں چلی گئی، اور اپنے ساتھ دیول دیوی کو لے کر نمودار ہوئی۔ دیول دیوی کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ شرم سے اس کا منہ سرخ ہو رہا تھا۔ کنول دیوی نے خضر خاں کے ہاتھ میں دیول دیوی کا ہاتھ دیتے ہوئے کہا۔

"بیٹے! ـــــــ یہ ہے تیرا انعام ـــــــ!"

علاء الدین مسکرا دیا، اور اس نے حکم دیا: مولانا مغیث الدین فوراً طلب کئے جائیں۔ مولانا تشریف لائے، اور اسی وقت اُنہوں نے اِن دونوں کو کبھی نہ ٹوٹنے والے رشتہ میں جکڑ دیا![1]

رئیس احمد جعفری

۱۸ اکتوبر ۱۹۵۴ء

---

[1] خضر خاں اور دیول دیوی کی محبت اور شادی پر حضرت امیر خسرو نے ایک مثنوی لکھی ہے جس کا نام ہی "خضر خاں اور دیول دیوی" ہے۔ مولانا ذکاء اللہ نے اپنی تاریخ ہند میں لکھا ہے کہ دیول دیوی خضر خاں سے اتنی محبت کرتی تھی کہ بہت عرصہ بعد جب گوالیار کے قلعہ میں دشمنوں نے اسے قتل کیا تو دیول دیوی نے اس کے گلے میں باہیں ڈال دیں، اور اس کے ساتھ وہ بھی موت کے گھاٹ اُتر گئی۔

جس کی فضائیں

——— انسانیت کی زہرہ گداز چیخوں سے معمور تھیں!

جس کے کلس

——— روح فرسا گناہوں کے خاموش پہریدار تھے!

جس کے در و دیوار

——— انسانی شرافت و وقار کے خون سے رنگین تھے!

جس کے نہاں خانوں میں

——— مجبور عصمتیں دم توڑتی تھیں!

جہاں خونخوار بھیڑیئے بستے تھے!

وہ بھیڑیئے جن کے جبڑوں کو شیرِ غزنوی کے پنجہ کی ضرورت تھی!

سومنات

رئیس احمد جعفری کا ایک عظیم تاریخی ناول

محمود غزنوی سومنات پر کیوں حملہ آور ہوا؟ اس مجاہد کے ساتھیوں نے اس راہ میں کیا کیا صعوبتیں برداشت کیں؟ ——— ان ساری باتوں کا جواب اس ناول سے ملتا ہے جو تاریخ و افسانہ کا ایک حسین سنگم ہے، جسے ہم بیک وقت تاریخ اور ناول کا نام دے سکتے ہیں!

قیمت سات روپے آٹھ آنے

قومی کتب خانہ (رجسٹرڈ) ریلوے روڈ، لاہور